جنوبی ہند میں اُردو انشائیہ۔ آزادی کے بعد

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی (اُردو)

مقالہ نگار

وسیم بیگم

Reg. No: 10HUPH04

نگراں

پروفیسر سید فضل اللہ مکرم

صدر شعبہء اُردو

شعبہء اُردو

اسکول آف ہیومانیٹیز، یونیورسٹی آف حیدرآباد،

حیدرآباد۔

جون ۲۰۲۲ء

JUNUBI HIND MEIN URDU INSHAIYA AZADI KE BAAD

DOCTOR OF PHILOSOPHY

in

Urdu

Submitted by:

WASEEM BEGUM

Reg. No. 10HUPH04

Supervisor

PROF. SYED FAZLULLAH

Head Dept. of Urdu

Department of Urdu

School of Humanities

University of Hyderabad , Hyderabad

June 2022

CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled "**JUNUBI HIND MEIN URDU ISHAIYA AZADI KE BAAD**" submitted by **WASEEM BEGUM** bearing Reg. No. **10HUPH04** in partial fulfilment of the requirements for the award of Doctor of Philosophy in **URDU** in the School of Humanities is a bonafide work carried out by her under my supervision and guidance.

This thesis is free from plagiarism and has not been submitted previously in part or in full to this or under any University or Institution for award of any degree or diploma. Part of this thesis has been.

A. Published in the following Publications:

1. Urdu Adab Mein Ishaiya Ka Irteqai Safar (ISSN: 2581 – 9216)
2. Inshaiya Aur Maquale Mein Faraq (ISSN: 2581 – 9216)

B. Presented in the following Conferences:

1. "Fareeda Zain Ke Afsano Mein Samaji Masael" two-days National Seminar on "Contribution of Hyderabadi Women in the field of Urdu Fiction Writing" held on 19th and 20th February 2020 sponsored by NCPUL MHRD Govt. of India, New Delhi, organised by Dept. of Urdu Indira Priyadarshini Govt. Degree College (W), Nampally, Hyderabad.
2. Inshaiya Aur Mazmoon Mein Faraq two-days National Seminar on "Generic of Urdu Prose" held on 18th and 19th March 2021 sponsored by NCPUL in collaboration with Telangana State Urdu Academy organised by Dept. of Urdu Hussaini Alam Govt. Degree College (W), Hyderabad, Telangana State.

Further, the Student was exempted from doing coursework (recommended by Doctorial Committee) on the basis of the following course passed during her M.Phil program and M.Phil degree was awarded.

Sl. No.	Course Code	Title	Credits	Grade	Pass/Fail
01.	HU600	Research Methodology	4.00	A	Pass
02.	HU601	Practical Criticism	4.00	A	Pass
03.	HU602	Textual Criticism	4.00	B	Pass
04.	HU680	Dissertation	12.00	A+	Pass

Supervisor Head of the Department Dean School of Humanities

DECLARATION

I, **WASEEM BEGUM** hereby declare that this entitled "**JUNUBI HIND MEIN URDU ISHAIYA AZADI KE BAAD**" submitted by me under the guidance and supervision of **PROF. SYED FAZALULLAH MUKARRAM** is bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my thesis can be deposited in Shodganga/ INFLIBNET.

Date:

Name: **WASEEM BEGUM**

Signature of the Student
Reg, No. **10HUPH04**

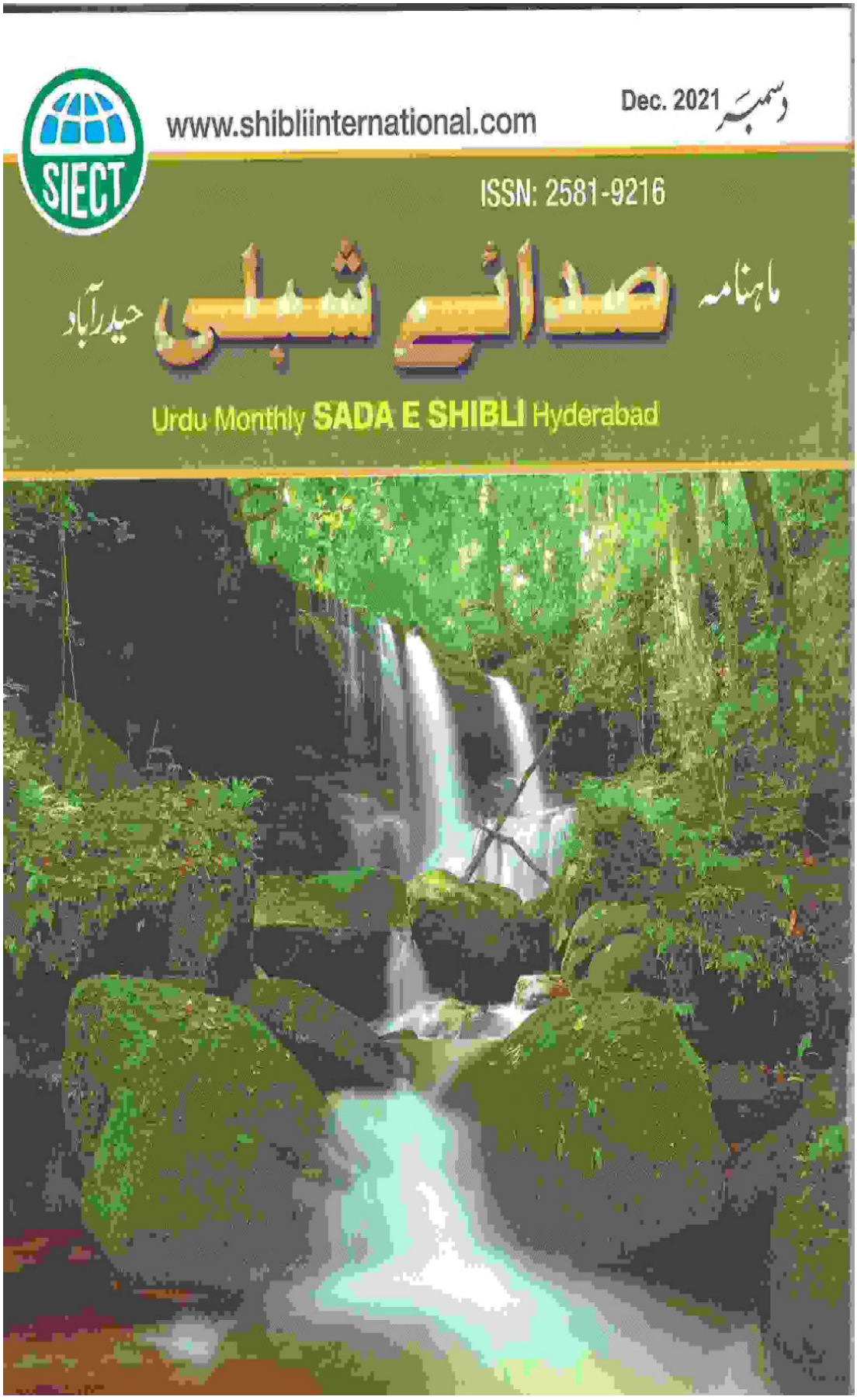
SIECT
www.shibliinternational.com
Dec. 2021 دسمبر
ISSN: 2581-9216
ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد
Urdu Monthly SADA E SHIBLI Hyderabad

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	ہم پاسباں ہیں اس کے وہ پاسباں ہمارا	مولانا اسلم جیراج پوری	۶
۳	نعتِ رسول ﷺ	فہیم اختر	۶
۴	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۷
۵	نجات کا اٹل قانون	مولانا حبیب الرحمٰن	۸
۶	ہزاروں دعوتیں ایسی کہ.....	خیر النساء علیم	۱۰
۷	غزل	ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی	۱۲
۸	الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ اردو زبان وادب کا فروغ	محمد وحید الدین	۱۳
۹	آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کے ادوار۔ایک نظر	طلعت صدیقی	۱۷
۱۰	دکنی ادب کا مہتاب باقر آگاہ	نعمت النساء	۲۱
۱۱	غزل	شاہ نواز ہاشمی	۲۵
۱۲	اردو ادب میں انشائیہ کا ارتقائی سفر	وسیم بیگم	۲۶
۱۳	رباعی فن اور تکنیک	محمد خواجہ محی الدین	۲۹
۱۴	غالب شناسی کی تحقیقی اور تنقیدی اہمیت	محمد شوکت فہیم	۳۴
۱۵	صحافت کی تعریف، مفہوم اور اہمیت	عبدالحفیظ رحمانی	۳۷
۱۶	اردو صحافت، فن اور روایات	سعیدہ رخسانہ بیگم	۴۰
۱۷	اعلامیہ	ادارہ	۴۲

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

جناب **ابو سفیان** اعظمی، مقیم حال ممبئی...جناب **محمد یوسف** بن الحاج محمد منیر الدین عرف ولی مرحوم، حیدرآباد
مفتی **محمد فاروق قاسمی** ۔صدر علماء کونسل وجے واڑہ، آندھرا پردیش
ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد...مولانا **منصور احمد قاسمی**، معین آباد، تلنگانہ
الحاج **رئیس احمد اقبال**، انجینئر صدر سہارا ویلفیئر سوسائٹی، حیدرآباد الحاج **محمد زکریا** انجینئر (داماد استاذ الاساتذہ
حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ) مقیم حال دبئی...ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد
مولانا **محمد عبدالقادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد...الحاج **محمد قمرالدین**، نبیل
کالونی بارکس حیدرآباد...الحاج **محمد عبدالکریم** ۔صدر مسجد اشرف کریم کشن باغ، حیدرآباد

وسیم بیگم ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد

اُردو ادب میں انشائیہ کا ارتقائی سفر

انشائیہ دراصل عربی لفظ ہے جو لفظ ''انشا'' سے مشتق ہے جس کے معنی عبارت آرائی، کوئی بات دل سے پیدا کرنا، طرز تحریر یا وہ کتاب جس میں خط و کتاب کے قواعد اور خطوط لکھے ہوں۔ فیروز اللغات میں انشائیہ کے معنی کچھ اس طرح ہے۔

''نحو کی اصطلاح میں وہ جملہ جس میں سچ جھوٹ کا احتمال نہ ہو''

(فیروز اللغات الحاج مولوی فیروز الدین ص ۱۳۱)

اصطلاحی معنوں میں ادب کی ایک صنف سخن ہے جس کو ایسے بھی کہا جاتا ہے۔ ''ایسے'' اوسط لمبائی کا ایک ایسا مضمون ہے جو عموماً نثر میں ہوتا ہے۔ اور جس میں سہل اور سرسری انداز میں کسی موضوع پر مضمون لکھا جاتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو صرف اس موضوع سے بحث کی جاتی ہے جو لکھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔

صنف انشائیہ کا آغاز فرانس میں اس وقت ہوا جب مونٹین نام کا ایک ادیب، جسے انشائیہ کا موجد اور باوا آدم کہا جاتا ہے۔ غیر افسانوی نثر کو ایک نئے انداز سے اپنے اظہار خیال کو پیش کرنے کے لئے لکھا اور اس نے اپنے دلچسپ اور نادر تجربہ کو ''Essay'' کا نام دیا جو تحریر کا ایسا نمونہ تھا جس کی مثال پہلے کہیں موجود نہیں تھی۔ لفظ Essay فرانسیسی لفظ Essai کی انگریزی شکل ہے۔ Essai عربی لفظ ''اسّی'' کی فرانسیسی شکل معلوم ہوتی ہے۔ دونوں الفاظ کے معنی کوشش کے ہیں۔ اور فرانس ہی سب سے پہلا ملک ہے جہاں مضمون نگاری کی داغ بیل پڑی۔ لیکن مونٹین کو انشائیہ کا موجد تسلیم کرنے سے پہلے جب ہم قدیم ترین عالمی ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں انشائیہ کا خام مواد چین، عرب، ایران اور ہندوستان وغیرہ ممالک کی مختلف تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ فرانسس بیکن انگلستان میں اٹھارہویں صدی کا ادیب تھا جس نے انگریزی انشائیہ پر کام کیا ہے۔

آگے بڑھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی دراصل ناول نگاری کی ترقی کا عہد مانا جاتا ہے، اور انگریزی انشائیہ نگاری کی کساد بازاری کا زمانہ۔ جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ناول نے انشائیہ کے طنز و ظرافت، تخیل پردازی اور شگفتہ بیانی جیسے عناصر کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ پھر بھی اس عہد میں چارلس لیمب اور ایونسن جیسے ممتاز انشائیہ نگار بھی موجود تھے۔

اردو ادب میں انشائیہ کا آغاز اس وقت ہوا جس وقت مغرب میں مونٹین اور بیکن اپنے انشائیے لکھ رہے تھے۔ اور عین اسی وقت ہندوستان میں ملاّ اسد اللہ وجہی نے ''سب رس'' جیسا بہترین باعث فخر انشائیہ پیش کیا جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ جس دور میں ملاّ اسد اللہ وجہی اپنا یہ انمول کارنامہ پیش کر رہے تھے وہ عصر صوفیانہ تحریریں، داستانوں اور مثنویوں کا عصر تھا۔ چونکہ اس وقت تحریر کی اس مجموعہ کا کوئی نام نہیں تھا اور باضابطہ اس وقت تک انشائیہ کو ''انشائیہ'' کا نام نہیں دیا گیا تھا لیکن پھر بھی اس میں انشائیہ کی خصوصیات پائے جانے کی وجہ سے انشائیہ کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے جب کہ اس کی بنیاد سولہویں صدی میں رکھ دی گئی تھی۔

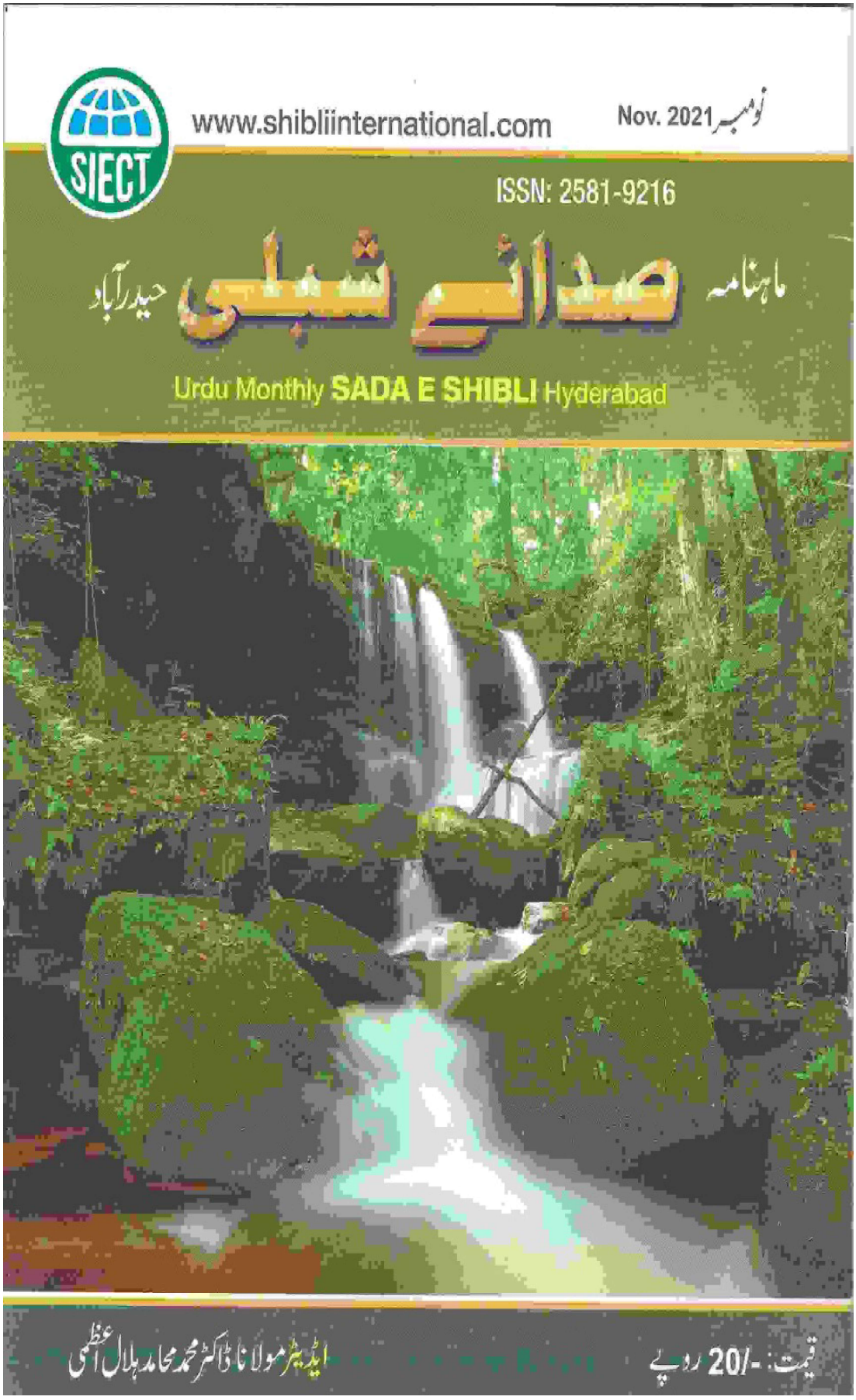
SIECT
www.shibliinternational.com
Nov. 2021 نومبر
ISSN: 2581-9216
ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد
Urdu Monthly SADA E SHIBLI Hyderabad
ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی
قیمت: -/20 روپے

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	نجات کا اٹل قانون	مولانا حبیب الرحمٰن	۷
۴	سوشل میڈیا اور اسلام	امانت علی قاسمی	۱۰
۵	مولانا آزاد کا تصورِ مستحکم و متحدہ قومیت	محمد قاسم	۱۴
۶	حیدرآباد کا ادبی و صحافتی پس منظر	سعیدہ رخسانہ بیگم	۱۹
۷	پروفیسر محمد انورالدین بہ حیثیت تحقیق نگار	فاطمہ اختر	۲۲
۸	ٹیپو سلطان اور نپولین	شیخ محمد سراج الدین	۲۷
۹	دُعا	یاور حبیب ڈار	۲۹
۱۰	اردو ادب اور شاعری	آمینہ اختر	۳۰
۱۱	غزل	جہانگیر قیاس	۳۳
۱۲	صحافت کے اصول و صحافتی اخلاقیات	عبدالحفیظ رحمانی	۳۴
۱۳	غزل	حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ	۳۶
۱۴	انشائیہ اور مقالہ	وسیم بیگم	۳۷
۱۵	اعلامیہ	ادارہ	۴۲

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

جناب **ابو سفیان** اعظمی، مقیم حال ممبئی... جناب **محمد یوسف** بن الحاج محمد منیرالدین عرف ولی مرحوم، حیدرآباد
مفتی **محمد فاروق قاسمی** ۔صدر علماء کونسل وجے واڑہ، آندھرا پردیش
ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد... مولانا **منصور احمد قاسمی**، معین آباد، تلنگانہ
الحاج **رئیس احمد اقبال**، انجینئر صدر سہارا ویلفیئر سوسائٹی، حیدرآباد الحاج **محمد زکریا** انجینئر (داماد استاذ الاساتذہ حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ) مقیم حال دبئی... ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد
مولانا **محمد عبدالقادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد... الحاج **محمد قمرالدین**، نبیل کالونی بارکس حیدرآباد... الحاج **محمد عبدالکریم** ۔صدر مسجد اشرف کریم کشن باغ، حیدرآباد

وسیم بیگم، پی۔ایچ۔ڈی ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد

انشائیہ اور مقالہ میں فرق

مقالہ اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں نثر کی بنیاد کسی ایک فکر وخیال یا ایک موضوع پر بحث ہو یا کسی کتاب کا باب یا حصہ ہو۔ مقالہ کے معنی فیروز اللغات میں قول، مقولہ، آرٹیکل، تحریر، اقلدیس کا ہر حصہ جس میں اقلدیس کے دعوے ان کے ثبوت اور شکلیں درج ہوں اس کو مقالہ کہتے ہیں۔

مقالہ کے لغوی معنی ہے بات، گفتگو یعنی جو کچھ کہا جائے اصطلاح میں کسی خاص موضوع پر علمی و تحقیقی انداز میں تحریری اظہارِ خیال کو مقالہ کہتے ہیں۔ مقالہ کسی بھی موضوع پر تحریر کیا جاسکتا ہے مثلاً سیاسی مقالہ، سماجی مقالہ، علمی مقالہ، ادبی مقالہ، سائنسی مقالہ وغیرہ۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر مقالے کی تعریف یوں بیان کرتی ہیں کہ:

> ''مقالہ عام طور پر اس طویل اور بسیط مضمون کو کہتے ہیں جس میں کسی موضوع پر عالمانہ انداز میں مفصل روشنی ڈالی جائے۔ مقالہ اپنی استدلالی صلاحیت اور گہرائی کی وجہ سے ہلکے پھلکے مضامین سے خاصا مختلف ہوتا ہے''۔ (اردو مضمون کا ارتقا، ڈاکٹر سیدہ جعفر، صفحہ۔۵۳)

ہندوستان میں اردو زبان میں مقالہ نگاری کا آغاز ۱۸۴۵ء کے آس پاس ہوا تھا۔ مگر اس کی مقبولیت کا عہد ۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہوا۔ دلی کالج کے نصاب میں مختلف مضامین شامل تھے۔ امتحان کے پرچوں میں ایک پرچہ مقالہ نگاری سے متعلق بھی ہوا کرتا تھا اس دور کی مقالہ نگاری کا اندازہ مقالوں کے عنوانات سے ہو جاتا ہے عنوانات اس طرح کے ہوتے تھے'' بالائی (شمالی) ہندوستان پر ریلوں کے جاری ہونے سے کیا اخلاقی اثر پڑے گا؟''۔ امتحان کے پرچوں میں مضمون نویسی کے علاوہ سالانہ مضمون نویسی کا مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا۔ ۵۰۔۱۸۴۹ء کے مقابلہ کے لیے یہ موضوع تجویز کیا گیا تھا۔ ''اسلامی اور انگریزی حکومتوں کے تحت آزادی رعایا کے بارے میں کیا فرق تھا؟''

ان اردو اور انگریزی انعامی مقابلوں میں طلائی تمغے دیئے جاتے تھے۔ مفتی صدرالدین آزُردہ نے بھی اردو میں بہترین مقالے کے لیے ایک طلائی تمغہ عطا کیا تھا۔ ان مقابلوں میں انعام پانے والے طلباء میں ماسٹر رام چندر، موتی لال، نذیر احمد، مولوی احمد ذکاءاللہ، بھگوان داس، خواجہ ضیاءالدین خصوصیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے بیشتر علم حاصل کرنے کے بعد اسی کالج میں معلّمی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

اس دور کے ادیبوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ مقالہ نگاری ترقی پائی۔ ماسٹر رام چندر نے فوائد الناظرین اور ''محبّ ہند'' رسالے جاری کئے۔ جس میں علمی و ادبی مقالہ بھی شائع ہوتے تھے آخر کار یہ رسائل ۵۵۔۱۸۵۴ء میں بند ہو گئے اس کے علاوہ اس دور کی ادبی

Indira Priyadarshini Govt. Degree College (W)
Nampally Hyderabad. T.S

اندرا پریدرشنی گورنمنٹ ڈگری کالج برائے نسواں
نامپلی حیدرآباد تلنگانہ

دوروزہ قومی سمینار: اردو فکشن نگاری میں حیدرآبادی خواتین کا حصہ

Two Day National Seminar On :"CONTRIBUTION OF HYDERABADI WOMEN IN THE FIELD OF URDU FICTION WRITING"
Held On : 19th & 20thFebruary2020

Sponsored by : National Council for Promotion of Urdu Language MHRD Govt of India, New Delhi

Organaized by: Department of Urdu Indira Priyadarshini Govt. Degree College (W) Nampally, Hyd

CERTIFICATE

This is to certify that Prof./Dr./Mr./Ms. Waseem Begum

of University of Hyderabad

has presided/ attended as resource person/participated/presented a paper titled Fareeda Zain ke Afsano mai Samji masael

in Two day National Seminar on 19th & 20th February 2020.

Dr. D. Varalakshmi
Principal

صداقت نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ محترم/محترمہ وسیم بیگم

ادارہ کا نام یونیورسٹی آف حیدرآباد

نے دوروزہ قومی سمینار منعقدہ ۱۹ اور ۲۰ فروری ۲۰۲۰ء میں بحیثیت Ph.D اسکالر

شرکت کی اور بعنوان فریدہ زین کے افسانوں میں سماجی مسائل

مقالہ پیش کیا۔

Mohd Waheeduddin
Convener

GOVT. DEGREE COLLEGE (W)
HUSSAINI ALAM, HYDERABAD, T.S

گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین
حسینی علم حیدرآباد، تلنگانہ

دوروزہ قومی سیمینار بعنوان: اردو کی نثری اصناف

Two-day National Seminar on **"GENRE OF URDU PROSE"** held on 18th & 19th March 2021

Sponsored by: NATIONAL COUNCIL FOR PROMOTION OF URDU LANGUAGE (NCPUL), New Delhi
in Collaboration with TELANGANA STATE URDU ACADEMY
Organized by: DEPARTMENT OF URDU

CERTIFICATE

This is to certify that Dr./Mr./Ms. Waseem Begum
of University Of Hyderabad [Ph.D Scholar] *has presided/attended as resource person/participated/presented a paper titled* Inshaiya aur Mazmoon mai farq.
in Two-day National Seminar in GENRE OF URDU PROSE held on 18th & 19th March 2021.

Dr. Abdul Quddus
Convener

B Sunitha Padmavathi
Dr. B. Sunitha Padmavathi
Principal

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست ابواب

	صفحہ نمبر
پیش لفظ	۱۴
باب اول: انشائیہ	۲۲
ا۔انشائیہ کی تعریف	۲۳
ب۔انشائیہ کی تکنیک	۳۲
ج۔انشائیہ کا دیگر اصناف سے تقابلی مطالعہ	۴۶
باب دوم: انشائیہ کی تاریخ	۷۶
ا۔انشائیہ کا آغاز	۷۷
ب۔انشائیہ کا ارتقاء	۹۰
باب سوم: ماقبل آزادی اردو انشائیہ	۱۲۱
باب چہارم: آندھرا اور تلنگانہ میں اردو انشائیہ آزادی کے بعد	۱۴۰
باب پنجم: جنوبی ہند کے دیگر ریاستوں میں اردو انشائیہ آزادی کے بعد (کرناٹک، کیرالا، تامل ناڈو)	۲۴۳
ماحصل	۲۸۴
کتابیات	۲۹۰

پیش لفظ

پیش لفظ

بارگاہ خداوندی میں سر بسجدہ ہوکر اللہ تعالی کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے علم وادب کے زیور سے آراستہ ہونے کا موقع دیا۔قدم قدم پر مدد فرمائی۔والدین کی تمناؤں کو پوری کرنے کا موقع عطا کیا۔

تحقیق میں سب سے اہم مسئلہ موضوع کا انتخاب ہوتا ہے۔موضوع کے انتخاب کے لئے میری دلچسپی پوچھی گئی تو میں نے صحافت سے دلچسپی کا اظہار کیا مجھے ''خواتین کا ادب اردو رسائل میں'' موضوع دیا گیا اس وقت تو میں نے موضوع لے لیا،مگر مجھے موضوع سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی میں نے اپنے نگران ڈاکٹر رضوانہ معین صاحبہ سے موضوع تبدیل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔اس وقت مجھے مصطفیٰ کمال صاحب کی یہ بات ذہن میں آئی۔انہوں نے ایک دفعہ ذکر کیا تھا کہ ''انشائیہ پر بہت کم کام ہوا ہے'' میں ایسے ہی کسی موضوع پر کام کرنا چاہتی تھی جس پر کام کم ہوا ہو یا بالکل نہیں ہوا ہو۔بعدازاں میں نے ''حیدرآباد میں اردو انشائیہ'' پر کام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔میں نے اپنے ہر دلعزیز نگران صاحبہ سے مشورہ کے بعد ''جنوبی ہند میں اردو انشائیہ۔آزادی کے بعد'' موضوع کو اپنی تحقیق کے لیے منتخب کیا۔اس پر صدر شعبۂ اردو پروفیسر بیگ احساس صاحب نے رضامندی کا اظہار کیا۔اس طرح تقریباً ڈیڑھ سال بعد بہت تاخیر سے میرا موضوع ''جنوبی ہند میں اردو انشائیہ۔آزادی کے بعد'' طے پایا۔

علم وادب کا سمندر بہت وسیع ہے۔میری کوشش تھی کہ میں اس کو ایک کوزہ میں بند کرسکوں۔جہاں تک میری رسائی ممکن تھی میں نے ادنی سی کوشش کی ہے۔

میرے تحقیق کا عنوان ''جنوبی ہند میں اردو انشائیہ۔آزادی کے بعد'' ہے۔

انشائیہ اردو ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو انگریزی زبان سے مستعار لی گئی لیکن اس نے اپنے اصول وضوابط اور وسیع تر دائرے کی وجہ سے اپنی ایک الگ پہچان بنالی۔جس وقت اس صنف کو انگریزی سے اردو میں مستعار لیا گیا اس وقت اس صنف کو مضمون ہی کی ایک شکل سمجھا جاتا رہا بعد میں انشائیہ نے اپنا ایک الگ اور منفرد مقام بنایا اور ہر دور میں اپنی نئی ہیئت کے ساتھ اپنا ایک الگ گلشن سجایا اور ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی چلی گئی۔غرض یہ کہ آج کے دور کی مصروفیات کو مدنظر رکھیں تو یہ صنف اہمیت کی حامل ہے اور اس کا مستقبل روشن اور درخشاں ہیں۔

اس موضوع کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے،جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

باب اول:۔ انشائیہ ہے

اس کو تین ضمنی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

انشائیہ کی تعریف ،انشائیہ کی تکنیک اورانشائیہ کا دوسری اصناف سخن سے تقابلی مطالعہ۔اس باب میں انشائیہ کے لغوی و اصطلاحی معنی ومفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے مختلف ناقدین کی آراء کے حوالے سے انشائیہ کی خصوصیت کا احاطہ کیا گیا ہے،اس کی تکنیک کیا ہے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں انشائیہ کی شکل لوگوں کے سامنے واضح طور پر صاف اُبھر کر نہیں آئی۔اکثر و بیشتر لوگ انشائیہ کو مضمون کا حصہ کہتے ہیں یا مقالہ یا پھر مزاحیہ یا پھر ادب لطیف کہتے ہیں۔اس طرح انشائیہ کو دوسری اصناف میں ضم کر دیا جاتا اور انشائیہ کو علیحدہ صنف قرار نہیں دیا جاتا ہے۔اس بات کو مدنظر رکھ کر اس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش ہے کہ انشائیہ ایک علیحدہ صنف سخن ہے۔نہ وہ مضمون ہے، نہ طنز وظرافت ہے نہ مقالہ سے مشابہت رکھتی ہے۔ بلکہ ہر صنف اپنا ایک مقام رکھتی ہے اور اپنی ضرورت اور اہمیت منوا کر رہتی ہے۔اس طرح انشائیہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے مضمون اور انشائیہ کا تقابلی مطالعہ کیا ہے، اسی طرح مقالہ اور انشائیہ، طنز ومزاح اور انشائیہ، ادب لطیف اور انشائیہ کا تقابل کیا ہے۔تاکہ انشائیہ با آسانی سب کی سمجھ میں آسکے اور ایک علیحدہ صنف کی حیثیت سے اپنا مقام حاصل کرتے ہوئے اپنا لوہا منوا سکے۔

باب دوم:۔ انشائیہ کی تاریخ ہے

اس کو بھی دو ضمنی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔انشائیہ کا آغاز اور انشائیہ کا ارتقاء۔اس باب میں یہ واضح کیا ہے کہ انشائیہ کا آغاز کب اور کہاں ہوا اور یہ عہد بہ عہد کس طرح منظر عام پر آتا چلا گیا۔انشائیہ کی بدلتی ہوئی ہیئت اور ان کے ادوار کے انشائیہ نگاروں کے مختصر انشائیہ کے نقوش قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔

اردو ادب میں انشائیہ کا آغاز اس وقت ہوا جس وقت مغرب میں مونٹین اور بیکن اپنے انشائیے لکھ رہے تھے۔اور عین اسی وقت ہندوستان میں ملّا اسد اللہ وجہی نے ''سب رس'' جیسا بہترین شاہکار پیش کیا۔انہوں نے اسے سولہویں صدی میں لکھا۔''سب رس'' میں انشائیہ کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔حالانکہ وہ عصر صوفیانہ تحریروں، داستانوں اور مثنویوں کا دور تھا۔

سترہوی ،اٹھاروی صدی میں مغل حکمراں نے اپنی تمام توجہ بغاوتوں اور لڑائیوں کا سامنا کرنے میں صرف کر دی جس کی وجہ سے اردو ادب کے نظم ونثر کی خوبصورتی کا خون خرابہ ہوا۔باوجود اس کے ملا وجہی کے بعد

انشائیہ کی خصوصیات عطا حسین خاں تحسین کی کتاب ''نوطرز مرصع'' میں ملتی ہے۔سید انشاء کی کتاب جس میں انہوں نے رانی کیتکی کا قصہ نکھری ہندی میں لکھا ہے اور ''طلسم ہوشربا'' وغیرہ یہ چند ایسی کتابیں ہیں، جن میں انشائیہ کے آدھے ادھورے خام مواد ملتے ہیں جو انشائیہ کی ارتقائی سفر کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ سرسید کے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں انشائیہ کے کچھ نمونے ملتے ہیں۔محمد حسین آزاد کو بھی انشائیہ نگاروں کے زمرہ میں کسی حد تک شامل کیا جاسکتا ہے۔ان کی مشہور تصنیف ''نیرنگ خیال'' میں انشائیہ کی خصوصیت ملتی ہے۔

انیسویں صدی کے ابتداء میں مضمون یا انشائیوں میں طنز وظرافت کی جھلک نظر آنے لگی۔اور اسی دور میں انشائیہ عصر حاضر سے ہم آہنگ ہوتا نظر آنے لگا انیسویں صدی کی جو تحریریں تھیں وہ انشائیہ سے قریب ضرور تھیں لیکن پوری طرح انشائیہ نہیں کہلائی جاسکتی تھیں۔

بیسویں صدی میں اردو ادب کی دنیا میں انشائیہ ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔انگریزی کے راست اثرات اردو ادب پر پڑنے لگے اور ناول، افسانہ، ڈرامہ اور انشائیہ ارتقاء کی منزل طے کرتے چلے گئے۔اس طرح انشائیہ کی ہیئت صاف اور واضح ہونے لگی۔

باب سوم:۔ماقبل آزادی اردو انشائیہ ہے

اس میں آزادی سے قبل اردو انشائیہ کی صورتحال کا جائزہ لیا گیا ہے۔اور جنوبی ہند کے کون کون سی ریاستوں میں اور کن کن کے پاس ابتدائی نقوش ظاہر ہوتے ہیں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔دکن میں ملا وجہی کے علاوہ مولوی عزیز مرزا، آغا حیدر حسن مرزا اور یوسف ناظم کے انشائیوں پر بحث کی گئی ہے۔

تامل ناڈو میں ابھی انشائیہ میں پہل نہیں ہوئی ہے۔کیرالا میں آزادی سے قبل انشائیہ کے خدوخال یا انشائیے نہیں ملتے نہ آزادی سے قبل نہ آزادی کے بعد۔اس علاقے میں اردو ادب پھل پھول رہا ہے۔کرناٹک ایک تاریخی ریاست ہے اس ریاست میں بدر، رائچور، گلبرگہ اور میسور اردو کے مرکز مانے جاتے ہیں آزادی کے بعد کثیر تعداد میں نثر نگار ملتے ہیں تقسیم ہند کی وجہ سے یہاں کے اکثر ادیب اور شعراء پاکستان منتقل ہوگئے جن میں چند ایک انشائیہ نگار بھی تھے۔تلنگانہ اور آندھرا پردیش اردو زبان کی ترقی میں پیش پیش ہیں۔یہاں کئی ادباء اور مصنفین نے اردو ادب میں اپنا نام روشن کیا اور چند ایک نے انشائیہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

باب چہارم:۔آندھرا اور تلنگانہ میں اردو انشائیہ۔آزادی کے بعد ہے

اس میں انشائیہ نگاروں کی فنی تخلیقات کو پیش کیا گیا ہے۔جس میں تلنگانہ اور آندھرا پردیش کے انشائیہ

نگاروں کو شامل کیا گیا ہے۔اوران انشائیہ نگاروں کو حرف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔

جنوبی ہند ابتداء ہی سے اردو زبان وادب کا گہوارا رہا ہے۔ یہاں اردو زبان وادب کی ہمیشہ ہی سرپرستی ہوتی رہی ہے۔اور یہاں کی سرزمین اردو ادب کے لئے بہت زرخیز ثابت ہوئی ہے۔اس سرزمین سے بے شمار شعراء اور ادباء نے ہر دور میں ادب کی آبیاری کی۔اور اپنی علم دوستی اور دانشورانہ صلاحیتوں کی وجہ سے ادب کی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔چاہے وہ نثری صنف ہو یا غیر نثری صنف ہو۔

انشائیہ نگار کی زبان اور ذہن مفکر یا سائنس داں کی نہیں ہوتی لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ انشائیہ میں سنجیدہ ادب کی لہریں نہیں بہتیں یا فلسفہ وحکمت ،علوم اور سائنس جیسے شعبے انشائیہ نگار کے پہنچ سے باہر ہوتے ہیں نہیں قطعاً ایسا نہیں ہے۔انشائیہ نگار ادب کے ہر شعبے اور زندگی کے ہر گوشے میں قدم رکھ سکتا ہے۔اسے کہیں اور کوئی روک ٹوک نہیں وہ آزاد اور مختار ہے۔انشائیہ ایک طرح سے ادب لطیف کا پروردہ ہوتا ہے وہ زندگی اور اس کے مسائل کو اپنے مخصوص نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔وہ حیات کے اور کائنات کے الگ الگ رنگوں کا تماشائی ہوتا ہے۔

جنوبی ہند میں آزادی کے بعد کئی ادباء وعلماء نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اپنی علمی وادبی خدمات انجام دیں۔انہیں شخصیات میں سے چند ایک ایسے ہیں جنہوں نے انشائیہ کی زمین کو زرخیز کیا۔اور انشائیہ کی ترقی اور ترویج میں اضافہ کیا۔اردو میں شعوری اور غیر شعوری طور پر انشائیے لکھے گئے ہیں۔اس دور کے تمام ادباء اور شعراء نے صنف انشائیہ میں طبع آزمائی کی ہے جس کی کھیپ کی کھیپ موجود ہے۔جن میں کچھ ادیب ایسے ہیں جو دو چار انشائیے لکھیں ہیں۔چند ایسے انشائیہ نگار ہیں جو انشائیے کے مجموعہ شائع کر کے اس صنف میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔اوران میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے انشائیہ کو ایک منفرد صنف ادب کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔بہت کم ایسے انشائیہ نگار ہیں جنھوں نے طنزیہ ومزاحیہ مضمون اور انشائیہ کے فرق کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔چند ایسے بھی انشائیہ نگار ہیں جن کے انشائیہ مضمون کے زمرے میں شامل ہیں لیکن وہ انشائیہ سے قریب ہیں جس میں انشائیہ کی خصوصیات شامل ہیں اس وجہ سے ان کے مضامین کو انشائیہ میں شامل کیا گیا ہے۔

انشائیہ اردو ادب میں ایسی صنف کہلانے کی حقدار ہے جس نے ادب کے مختلف گوشوں یعنی تاریخی ، سیاسی ،سماجی ،جغرافیائی ،سائنسی اور اخلاقی وغیرہ کا احاطہ کیا ہے۔اور مختلف گوشوں میں سینکڑوں انشائیہ نگاروں نے اپنے انشائیہ تحریر کئے ہیں۔آندھرا پردیش اور تلنگانہ ریاست کے جن انشائیہ نگاروں کی تفصیل پیش کی گئی ہے وہ یہ ہیں ایم اے حنان ، برق آشیانوی ،حبیب ضیاء ،خواجہ عبدالغفور ، رشید قریشی ، زینت ساجدہ ،سید عباس متقی ،سلیم مقصود ،سید رحیم الدین توفیق ،شمیم علیم ،عابد معز ،عاتق شاہ ،عبدالستار ساحر ، فاطمہ تاج ، فیروز حیدر ،قدیر زماں ،قیسی

قمر نگری، مجتبیٰ حسین، محمد برہان حسین، مسیح انجم، ممتاز مہدی، منظور الامین، نریندر لوتھر، یوسف امتیاز وغیرہ ہیں۔

باب پنجم :۔ جنوبی ہند کے دیگر ریاستوں میں اردو انشائیہ آزادی کے بعد

اس میں جنوبی ہند کی ریاستوں کرناٹک، کیرالا اور ٹاٹل ناڈو کے متفرق انشائیہ نگاروں اور ان کے انشائیوں کی خوبیوں کو مختلف مثالوں کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔اس میں ان ریاستوں کے انشائیہ نگاروں اور ان کے انشائیوں کی فنی خصوصیات، موضوعات اور اسلوب کے تحت ان کے انشائیہ نگاری کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

کرناٹک میں اردو نثر کے فروغ اور ارتقاء کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اردو کے ابتداء ہی سے ریاست میں تخلیق کاروں نے بڑی محنت سے اسے سنوارا ہے۔اس عہد کے ادیبوں نے تاریخی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو ادب کی ثروت میں اضافہ کیا ہے۔کرناٹک ہمیشہ ہی سے اردو ادب کے لئے سرسبز و شاداب رہا ہے یہاں انشائیہ کی آبیاری بھی ہوئی ہے۔

اردو انشائیہ بیسویں صدی کی شروع کی دہائیوں میں اُبھر کر سامنے آتا ہے۔اس دور میں شعوری اور غیر شعوری طور پر ان گنت انشائیے لکھے گئے جو کبھی مضمون، پرسنل ایسّے، یا لائٹ ایسّے کی حیثیت سے تحریر ہوئے تو کبھی انشائیے لطیف کے اہم ادبی شہ پاروں کے طور پر بھی انھیں پہنچانا گیا۔انشائیہ نگاروں نے قاری کے ذہن میں اتر کر اسے مختلف پہلوں پر منفرد زاویہ نظر سے دیکھنے پر مجبور کیا اور ان کی تحریریں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج بھی زندگی میں ہزاروں رہ گزر ایسے ہیں جن تک ہم پہنچ نہیں پاتے۔انشائیہ نگار یہاں قاری کا بہترین رہنما ثابت ہوتا ہے اور یہی مرکزیت تمام اصناف ادب میں وہ بلند مقام حاصل کرتی ہے جو دوسرے نثر نگاروں کے نصیب میں نہیں ہوتی۔

اس صنف ادب میں زبان سازی کے اعتبار سے بھی اور خیال آفرینی کے نقطہ نظر سے بھی بیشتر نثر نگاروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی، جس طرح اردو کے تقریباً سبھی شعرا نے غزل کی آبیاری کی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ کامیاب رہے اور کچھ ناکام۔اسی طرح انشائیہ میں بھی کچھ کامیاب رہے اور کچھ ادیبوں نے انشائیہ نما کی سی تحریریں فرمائی۔

اس باب میں کرناٹک ریاست کے متفرق انشائیہ نگار شامل ہیں جن میں وہ خواتین اور حضرات بھی ہیں جو باقاعدہ انشائیہ نگار تسلیم کئے گئے اور جن کا انشائی سفر جاری ہے۔اور ایسے بھی انشائیہ نگار ہیں جو چند انشائیہ تحریر کرنے کے بعد مصروفیت کے باعث یا مہلت نہ ملنے کی وجہ سے انشائیہ کا سفر آگے جاری نہ رکھ سکے۔انشائیہ کے ارتقاء

میں ایسے انشائیہ نگاروں کونظر انداز نہیں کیا جا سکتا ان کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔ چونکہ انشائیہ کی تاریخ میں ان کا ذکر ضروری ہے۔اس باب میں جن انشائیہ نگاروں کی تفصیل پیش کی گئی ہیں وہ یہ ہیں امجد علی فیض، حلیمہ فردوس، رزاق اثر شاہ آبادی، رؤوف خوشتر، فرزانہ فرح، لئیق صالحہ، عبدالقادر ادیب، مختار احمد منواور منظور وقار وغیرہ ہیں۔

کیرالا میں بھی دیگر علاقوں کی طرح موجودہ دور میں اردو ادب پھل پھول رہا ہے۔تامل ناڈو کو اگر چہ اردو کے متعارف مراکز میں شمار نہیں کیا جاتا لیکن اس کے باوجود اس خطہ کی جو تاریخ سامنے آتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربی فارسی اور اردو ادب وشعر کے سلسلے میں یہاں کے اہل قلم اور فنکاروں کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔لیکن یہاں عصر حاضر میں انشائیہ میں پہل نہیں ہوئی ہے۔ہمیں امید ہے کہ وہاں بھی انشائیہ کی آبیاری ہوگی اور اس صنف سخن کو بام عروج تک پہنچائیں گے۔

شکریہ کے فرائض میں، سب سے پہلے میں میرے موجودہ نگران پروفیسر سید فضل اللہ مکرم صاحب کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرا Re-Registration کروایا اور آپ کی شاگردہ ہونے کا شرف عطا کیا۔ دوران تحقیق اپنا قیمتی وقت دیا اور قدم قدم پر میری رہنمائی کی، وقت مقررہ پر کام کی تکمیل کروائی، اپنی باریک بینی سے مجھے اپنے ہر چھوٹے سے چھوٹے کام میں قیمتی مشوروں اور نصیحتوں سے نوازا۔

اپنے سابقہ نگران ڈاکٹر رضوانہ معین صاحبہ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ وہ جب تک ریٹائرڈ نہیں ہوئیں تب تک مجھے اپنے مشوروں سے نوازتی رہیں۔میں پروفیسر بیگ احساس صاحب کے لئے دعا گو ہوں کہ اللہ اپنی غریق رحمت کرے۔شعبہء اردو کے تمام اساتذہ اکرام کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ ماباقی تمام اساتذہ کی سپاس گزار ہوں جن جن سے میں نے آج تک تعلیم حاصل کی۔

میں اپنے تمام رفقائے کرام جنہوں نے میری مدد کی ان کی بے حد ممنون ومشکور ہوں جنہوں نے ہر وقت میرا ساتھ دیا۔ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب، مدیر شگوفہ کی بھی سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے مواد کی فراہمی میں جب کبھی کوئی دشواری ہوتی بلا جھجک بھر تعاون کیا جس کی وجہ سے میرا سفر تحقیق چلتا رہا اور کامیابی کے ساتھ ہمکنار ہوا۔ان تمام کے علاوہ فوزیہ فاطمہ کی بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بہت کم وقت میں میرے مقالہ کی ٹائپنگ اور کمپوزنگ کی۔

میں اپنے برادران، ہمشیرہ اور تمام افراد خاندان کا صمیم قلب کے ساتھ شکریہ ادا کرتی ہوں جن کے بھر پور تعاون اور دعاؤں کی بدولت میں نے سرخروئی حاصل کی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے بعد جو ہستی قابل قدر ہے۔ وہ سایہ شفقت ورحمت والد کی ہے۔اللہ تعالیٰ کی احسان مند ہوں کہ اس نے مجھے دنیا کے سب سے اچھے سایہ شفقت ورحمت سے نوازا۔ان کی بے مثال محبتوں، نیک تمناؤں اور پرخلوص دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ آج میں اس مقام

پر ہوں۔ میری بدقسمتی ہے کہ یہ دیکھنے کے لیے میرے والد محترم اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ بارہ گاہی الٰہی میں اپنے والد محترم اور میری مرحومہ بہن کے لیے دعا گوں ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں علی علیّین میں جگہ عطا فرمائے (آمین) بارگاہ الٰہی میں دعا گوں کہ میری والدہ کا سایہ سدا مجھ پر قائم و دائم رہے اور انھیں صحت کے ساتھ حج بیت اللہ کرنے کی جلد از جلد سعادت عطا فرمائے اور مجھے بھی۔

(آمین ثمہ آمین)

وسیم بیگم

بی۔اے، بی۔ایڈ

ایم۔اے، ایم۔فل

****

باب اول

انشائیہ

انشائیہ کی تعریف

اردو ادب ،نثر اور شاعری پر مشتمل ہے۔ اور جس طرح نثری اصناف میں کئی اصناف موجود ہیں اسی طرح انشائیہ بھی اردو نثر میں شامل ہے۔ سب سے پہلے اس صنف کا آغاز فرانسیسی زبان میں مونٹین نے ۱۹ویں صدی کے آخر میں پہلا انشائیہ تحریر کر کے کیا۔ مونٹین کی تقلید میں بیکن نے اسے اپنے انداز میں تحریر کیا۔ اس کے بعد انشائیہ دنیا کی تمام زبانوں میں تحریر ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو میں بھی انگریزی کی تقلید میں انشائیہ نگاری کا آغاز ہوا۔ انشائیہ کی تعریف ہر کسی نے اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ چند تعریفیں ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

تعریف:

انشائیہ دراصل عربی لفظ ہے جو لفظ ''انشا'' سے مشتق ہے جس کے معنی عبارت آرائی، کوئی بات دل سے پیدا کرنا، طرز تحریر یا وہ کتاب جس میں خط و کتابت کے قواعد اور خطوط لکھے ہوں۔ مختلف لغات، فرہنگ اور انسائکلو پیڈیا میں اس کے مختلف تعریفیں ملتی ہیں۔

''نحو کی اصطلاح میں وہ جملہ جس میں سچ و جھوٹ کا احتمال نہ ہو''۔ (۱)

لفظ انشاء کے معنی: مہذب اللغات میں یوں درج ہیں:

''عبارت لکھنا، طرز تحریر، دل سے بات پیدا کرنا''۔ (۲)

اس کے علاوہ لغات کشوری، لغاتِ ابجدی شماری: جلد اول، عربی اردو ڈکشنری، بیان اللسان، نور اللغات، اور لغت فارسی میں اس کے یہی معنی درج ہیں۔

اس کے علاوہ فرہنگ آصفیہ میں اس کے معنی یوں لکھے گئے ہیں:

''انشاء: (۱) لغوی معنی کچھ بات دل سے پیدا کرنا۔ (۲) عبارت تحریر علم معانی بیان، صنایع و بدائع، خوبی، عبارت، طرز تحریر۔ (۳) وہ کتابت سکھانے کے واسطے ہر قسم کے خطوط جمع ہوں، لیٹر بک چٹھیوں کی کتاب''۔ (۳)

فرہنگ عامرہ میں اس کے معنی یوں ملتے ہیں:

''عبارت لکھنا، بات پیدا کرنا''۔ (۴)

مندرجہ بالا حوالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انشاء کے معنی طرزِ تحریر کے ہیں۔

صنف انشائیہ کا آغاز فرانس میں اس وقت ہوا جب مونٹین نام کا ایک ادیب غیر افسانوی نثر کو ایک نئے انداز سے اپنے تجرباتِ زندگی کو پیش کرنے کے لئے استعمال کیا۔ اس نے اپنے اس دلچسپ اور نادر تجربہ کو ''Essay'' کا نام دیا جو تحریر کا ایسا نمونہ تھا جس کی مثال پہلے کہیں موجود نہیں تھی۔

لفظ Essay فرانسیسی لفظ Essai کی انگریزی شکل ہے۔ Essai عربی لفظ ''اسَعَی'' کی فرانسیسی شکل معلوم ہوتی ہے۔ دونوں الفاظ کے معنی کوشش کے ہیں۔ Essay کے لغوی معنی ''سعی و کوشش'' کے ہیں سعی و کوشش کا تعلق ہر قسم کی تحریریں ہے اور فرانس ہی سب سے پہلا ملک ہے جہاں انشائیہ نگاری کی داغ بیل پڑی۔

ڈاکٹر احمد امتیاز انشائیہ کے فنی سروکار کے دیباچہ میں اسطرح رقم طراز ہیں کہ:

> ''حیات و کائنات اور اس کے مظاہرہ کو ایک خاص کوشش کے تحت ضبطِ تحریر میں لانا "Essay" ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مونٹین نے اپنے مضامین کو ایک خاص کوشش یا "Essay" کا نام دیا تھا''۔ (۵)

اردو لفظ ''مضمون'' کی طرح انگریزی لفظ Essay بڑا وسیع المعنی ہے۔ وسیع المعنی اس لحاظ سے کہ اس میں Essay کی تمام قسمیں شامل ہیں۔ یہاں تک کہ Personal Essay بھی جسے دوسرے لفظوں میں Familiar Essay بھی کہتے ہیں۔ انگریزی زبان کے ادیب Personal Essay یا Familiar Essay کا ذکر کرتے وقت عموماً ان اصطلاحات کی بجائے صرف Essay کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور ایسے کی تعریف کرتے وقت Anthologists صرف ''پرسنل ایسے'' کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

مثلاً Great Essay of all National کے مرتب ایف ایچ پرچٹر ڈے کے لئے سادہ اور غیر مصنوعی (Homely and Unpertentious) کی صفات استعمال کی۔

ہاوسٹن پیٹرسن (جو کولمبیا یونیورسٹی میں فلسفے کے معلم رہ چکے ہیں) کی مرتب شدہ کتاب (Great Essay) میں ایسّے کی تعریف یوں کی ہے۔ کم سے کم مجموعے کے لئے ایسّے کا مطلب تحریر کا ایک ایسا چھوٹا سا ایک سے بیس یا تیس صفحے تک کا ٹکڑا ہوگا جس میں کسی بھی موضوع سے بحث کی گئی ہو۔ مگر شخصی، غیر رسمی اور غیر مصنوی انداز میں ''ایسّے'' مفکرانہ ہوگا لیکن سنجیدہ نہیں۔ وہ فلسفے سے قریب ہوگا لیکن فلسفے کی طرح باقاعدہ نہیں اس میں ایک قسم کی ڈھیلی ڈھالی وحدت ہوگی لیکن اس میں اصل موضوع سے مسرت بخش انحراف بھی ہوگا وہ ہمیں اتفاق کی نو عیت دے سکتا ہے۔ لیکن وہ ہمیں اتفاق رائے پر مجبور نہ کرے گا۔ ''ایسے اسٹ'' چاہے اور کچھ بھی ہو وہ ہمارا دوست اور لفظوں کا فنکار ہوتا ہے۔ ورجینا ولف نے کہا تھا کہ ایسے یہ ضرور جاننا چاہیے اور یہ شرط ہے کہ کس طرح لکھنا چا

ہیے۔یہی وجہ ہے کہ Essayist کوتراجم سے اتناہی نقصان پہنچتا ہے جتنالیرک سے شاعروں کو۔

آلڈس بکسلے نے اپنے منتخب مضامین Essays کے مجموعے (مطبوعہ ۱۹۶۰ء) کے دیباچے میں Essay کی تین قسمیں بتائیں ہیں۔ا۔شخصی اورخودسوانحی،۲۔خارجی اورواقعاتی ۳۔مجرد۔اس کا خیال ہے کہ ''ایسّے'' کی ہرایک قسم اپنے اندرمخصوص قسم کی خوبیاں اور خامیاں رکھتی ہیں۔اس کے نزدیک سب سے زیادہ اطمینان بخش ایسیز وہ ہیں جن میں تینوں قسم کے ایسے کی خوبیاں موجود ہیں۔یعنی خون میں لکھنے والا اپنی ذات سے لے کر کائنات، مجرد سے لے کرمحسوس اورخارجی سے لے کرداخلی دنیا کے مراحل طئے کرجائے۔بکسلے کے خیال میں اس قسم کے ایسیز مونٹین نے لکھے۔

امریکن بنجمن اے ہیڈرک "Types of Essay" مجموعے کا مرتب ہے اس تمہید میں ''ایسّے'' کی مختلف قسموں سے بحث کی گئی ہے اوران کے مضمون کے اعتبار سے مختلف عنوانات کے ماتحت فہرست اورکتاب دونوں میں مضامین درج کئے گئے ہیں۔ہیڈرک نے ''ایسّے'' کی چھ قسمیں گنائی ہیں۔

ا۔شخصی مضمون ۲۔بیانیہ مضمون ۳۔کرداری خاکہ ۴۔تنقیدی مضمون ۵۔ادارتی مضمون یعنی ایڈیٹوریل اور ۶۔مفکرانہ مضمون اوران میں سے ہرایک کی امتیازی خصوصیات پرروشنی ڈالی ہے۔

''ایسّے'' کی خصوصیات کے پیش نظر یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ ایک ایسا مضمون ہے جومختصر ہوتا ہے اور موضوع سے متعلق مصنف کے سنجیدہ اور غیرسنجیدہ خیالات کو پیش کرتا ہے۔''ایسّے'' ایک ایسا مضمون ہوتا ہے جس میں نہ تو منطقی بحث ہوتی ہے اور نہ ہی سائنسی علوم کی بحث۔بلکہ مصنف کے ذہن میں ابھرنے والے ایسے نقوش ہوتے ہیں جومصنف کی شخصیت کوکسی نہ کسی حدتک قاری کے سامنے ظاہر کردیتے ہیں۔

اسی طرح ''ایسّے'' اور ''پرسنل ایسّے'' کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے نظیرصدیقی انشائیہ کیا ہے؟ میں لکھتے ہیں کہ ''ایسے'' اور ''پرسنل ایسّے'' میں فرق نہ کرنے کی عادت انسائیکلوپیڈیا بری ٹانیکا تک میں پائی جاتی ہے۔ اس میں ''ایسّے'' کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

> ''ادب کی ایک صنف کی حیثیت سے ''ایسّے'' اوسط لمبائی کا ایک ایسا مضمون ہے جوعموماً نثر میں ہوتا ہے اور جس میں سہل اور سرسری انداز میں کسی موضوع سے اور سچ پوچھئے تو صرف اس موضوع سے بحث کی جاتی ہے جو لکھنے والے کومتاثر کرتا ہے''۔(۶)

انسائیکلوپیڈیا بری ٹانیکا نے اپنے ''ایسّے'' اور پرسنل ''ایسے'' کے جھگڑے میں پڑنے ہی نہیں دیا۔اس میں ہرجگہ ''ایسّے'' کا الفاظ استعمال کیا گیا ہے۔البتہ ''ایسّے'' کے تدریجی ارتقاء پرروشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ

بعض دوسروں کے ایسیز بالکل غیر شخصی ہیں ۔ مثلاً میکو لے کے ایسیز میکو لے کے ہاتھوں ''ایسے'' کی حیثیت اعتراف یا خودنوشت سوانح عمری کی نہیں رہتی ۔ اس کے یہاں ''ایسے'' بالکل غیر شخصی ، ادبی تاریخی اور نزاعی Controversial بن جاتا ہے۔

دراصل ''ایسّے'' اور ''پرسنل ایسّے'' دومختلف اصناف کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ جو بظاہر دیکھنے میں ایک جیسے ہے مگر مضمون کے اعتبار سے دومختلف صنفیں ہیں ۔ بھلے ہی ان دونوں کا موضوع ایک ہو اور ایک ہی موضوع پر مضمون لکھا جائے لیکن پھر بھی بنیادی طور پر اس میں فرق پایا جاتا ہے ۔ ''ایسّے'' مختلف لوگوں کے تاثرات ، خیالات اور تجربات کے تقابل کا ایک ذریعہ ہے ۔ اور اس تقابل کے ذریعہ زندگی کے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

''ایسّے'' اور ''پرسنل ایسّے'' میں فرق کرتے ہوئے نظیر صدیقی اپنی کتاب ''انشائیہ کیا ہے؟'' میں لکھتے ہیں:

> ''ایسّے'' لکھنے والا اپنے موضوع کو سنجیدہ اور ذمہ دار نظر سے دیکھتا ہے اور موضوع سے متعلق مواد کو منطقی ترتیب و تسلسل کے ساتھ پیش کرتا ہے ۔ اس کا مقصد اپنی شخصیت کا اظہار نہیں بلکہ زیر بحث مسئلہ کا تصفیہ ہوتا ہے'' ۔۔۔۔۔
>
> ''پرسنل ایسّے'' کا مصنف اپنے موضوع پر سہل اور سرسری انداز میں اظہار خیال کرتا ہے ۔ اس کا مقصد اپنی تصریح سے لے کر دوسروں پر تنقید تک سبھی کچھ ہوسکتا ہے'' ۔ (۷)

جہاں تک انشائیے کی بات ہے وہ مضمون سے مختلف ہے اور نثر کی ایک الگ صنف ہے ۔ اور انشائیہ میں اختصار اور طوالت میں کسی اُصول کی پابندی نہیں ۔ یہ مصنف کی مرضی اور موڈ پر ہے کہ جس موضوع پر جتنا چاہے لکھے ۔ بعض انشائیے بہت مختصر ہیں جو ایک صفحے سے زیادہ نہیں ، اور بعض انشائیے بہت طویل ہیں ۔ مثلاً مونٹین کا ایک انشائیہ ۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

مونٹین نے ادب کو جس حد تک متاثر کیا ہے اس کا صحیح اندازہ کرنا ناممکن ہے ۔ یہ واقع ہے کہ مونٹین سے نہ صرف اردو زبان کے ادیب بلکہ نہ جانے کتنی ہی زبانوں کے ادیب متاثر ہوئے ہیں ۔ انگریزی ادیبوں میں بیکن ، لیمب ، ہیزلٹ اور اسٹیونسن نے اس کے مضامین پڑھے اور اس کے اثرات کا اعتراف کیا ۔ بیکن ، مونٹین کے برعکس ہیں ، انگریزی کی انشائیہ نگاری محض شخصی نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں وہ شوقی اور شگفتگی بھی ملتی ہے جو مونٹین کی سنجیدگی کے منافی ہے ۔ سنجیدگی صرف مونٹین کی خصوصیت نہیں بلکہ فرانسیسی ذہن کا عام خاصہ ہے۔

''فرانسیسی زبان میں ''ایسّے'' نے انگریزی ایسّے'' کی بہ نسبت زیادہ سنجیدہ رخ اختیار کرلیا ہے۔فرانسیسی ادیب شاذ و نادر ہی اپنے کو بے تکلف ہونے دیتا ہے اور اس بات کو کبھی نہیں بھولتا کہ وہ ایک سنجیدہ اور ذی عقل ہستی ہے۔اگر چہ انسائیکلو پیڈیا بری ٹانیکا نے لیمب اور اسٹیونسن کی روایت کے علمبرداروں میں شما رکیا ہے اور ایسا کرنا اس حد تک صحیح بھی ہے کہ مونٹین کی طرح لیمب اور اسٹیونسن کے انشائیوں میں بھی شخصی عنصر بہت نمایاں ہے۔مونٹین ہی کی طرح ہیزلٹ کے انشائیے بھی خاص طویل ہوتے ہیں۔اور ان کا لہجہ سنجیدہ ہوتا ہے۔البتہ اس کے یہاں انکشاف ذات کا عمل اتنا نمایاں نہیں ہے۔جتنا مونٹین کے یہاں۔ ان کے برعکس لیمب ،اسٹیونسن ،لوکس، ہیلاٹریل ،لوک ، روبرٹ لنڈ وغیرہ خالص انشائیہ نگار ہیں۔روبرٹ لینڈ کے انشائیے سادہ ،مختصر، دلچسپ شخصی اور ہلکے پھلکے ہوتے ہیں''۔ (۸)

مونٹین نے ۱۵۷۱ء میں پہلی بار Essay کی اصطلاح استعمال کی تھی ۔ اس کی کتاب "Essaies'' ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی تھی۔مونٹین کے بعد بیکن نے "Essay" کی اصطلاح استعمال کی اور ۱۵۹۳ء میں اپنے Essaies شائع کئے لفظ انشائیہ کو اگر چہ Essay کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انشائیہ میں جو وسعت اور تنوع ہے ''تیر''جس قسم کی تخلیقی اضطراری اور اضطرابی کیفیت ہے وہ Essay کی اصطلاح میں نہیں ہے۔احمد امتیاز انشائیہ کے فنی سروکار کے دیباچہ میں Jhonson کا ایک قول پیش کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

'' جونسن نے اپنی کتاب The English Essay and Essayists میں بہت پہلے Essay کے بارے میں اظہارِ خیال کیا تھا کہ

Essay is a loose sally of the mind, an irregular indigested piece, not a regular and oderly composition" (۹)

سلیم آغا قزلباش تحریر فرماتے ہیں کہ یہی رویہ جانسن کی تعریف کے سلسلے میں بھی برتا اور کہا کہ انشائیہ بالکل آزاد ہے اور ہم اس صنف کے لئے کسی قسم کی پابندی کے قائل نہیں ہیں۔یعنی'' آزاد صنف نثر'' کی اصطلاح نے اردو کے متعدد ناقدین اور بیشتر قارئین کو غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے۔اور انہوں نے اس کا مفہوم مکمل آزادی یا با

الفاظ دیگر مادر پدر آزادی کے معنوں میں قبول کرلیا ہے جو ظاہر ہے ان کی سادہ لوحی کا ثبوت ہے۔ چنانچہ آزاد صنف نثر کے معنی یہ بھی تو ہو سکتے ہیں کہ وہ کسی مخصوص قسم کے اصلاحی رنگ نظریات تصورات ، وتعصّبات یا Systems کا پرچار کرنے کی مجبوریوں سے ''آزاد'' ہو نیز اسے اختیار حاصل ہو کہ وہ جملہ علوم وفنون سے حسب منشا اکتساب کرے اور پھر انہیں ایک نئے زاویہ اور ذاتی حوالے سے موضوع کی ہیئت میں کچھ اسطرح شامل کردے کہ ایک ایسی نئی پرت اجاگر ہو جائے جو مسرت اور فکری خط کے حصول کا ذریعہ بھی بن سکے۔ آزاد صنف نثر کا مطلب آزادی فکر بھی ہوسکتا ہے۔ نہ کہ اس کا مفہوم منتشر خیالی یا غیر منضبط ہونا سمجھ لیا جائے۔ اسی طرح پابندی سے مراد اگر پلاٹ، تھیم کردار یا وحدت زمانی ومکانی خیالی یا ٹھوس منطقی رویے کی پابندی ہے تو پھر ظاہر ہے کہ انشائیہ اس قسم کی پابندی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ جب Loose Sally of the Maind کی اصطلاح کو اندھا دھند قبول کر کے انشائیہ پر بات کی جائے تو آخری نتیجہ ڈاکٹر سید محمد حسنین کی اس رائے کی صورت میں برآمد ہوتا ہے:

> ''انشائیہ میں داخلیت یعنی Subjectivity ہوتی ہے جو قلم کار کے اپنے تاثرات کو پیش کرتی ہے۔ یہ داخلیت مگر مجرد نہیں ہوتی۔ یہ سماجی کوائف سے آلودہ ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار کا مقصد فریضہ آوارہ خیالی ہے''۔ (۱۰)

مغرب کے ادیبوں میں ایک اہم نام ڈوبڑی کا ہے جب اس نے غیر رسمی تحریر کے لئے Essay اور ذاتی تحریر کے لئے مضمون اور Light Essay یا Personal کے لئے انشائیہ کی اصطلاح کو رائج کیا۔ نیاز فتح پوری اردو ایسیز کے دیباچے میں اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''لفظ Essay کا مفہوم بہت وسیع ہے اور ہم ہر مقالہ کو خواہ کسی موضوع پر ہو Essay کہہ سکتے ہیں''

آگے وہ لکھتے ہیں:

> ''Essay ایک خاص نہج واسلوب کے مقالے کو کہتے ہیں''۔ (۱۱)

بقول سید ظہر الدین مدنی:

> '' آج کل اس صنف کو انشائیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انشا کے معنی پیدا کرنے کے ہیں۔ Essay بھی ایک تخلیق ہے اور اس اعتبار سے اس کو انشائیہ کہنا نامناسب نہیں''۔ (۱۲)

بعض ناقدین انشائیہ کو ایک ہلکی پھلکی صنف قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک Light Essay کی

اصطلاح عام ہے۔Light کے معنی ہلکا پھلکا ہونے کے نہیں بلکہ خوش ہونے اور خوش کرنے کے ہیں۔اس سلسلے میں نظیر صدیقی لکھتے ہیں کہ:

''انشائیہ کسی نہ کسی اعتبار سے غیر سنجیدہ یعنی ''لائٹ'' ہوتا ہے''۔ (۱۳)

یہ ایک ہلکی پھلکی تحریر ہوتی ہے جس میں انشائیہ نگار کسی موضوع کے متعلق اپنے شخصی احساسات اور تاثرات بیان کرتا ہے۔ بڑی گہری اور فکر انگیز باتیں سہل طریقے سے کہی جاتی ہیں۔

اردو میں گزشتہ چند برسوں سے مضامین کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے ان کے ادبی مقام کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ رسمی، غیر شخصی کمپوزیشن کے لئے مضمون اور غیر رسمی یا شخصی کیلئے انشائیہ کو ایک ہلکی پھلکی صنف قرار دیتے ہیں۔اردو زبان میں انشائیہ کیلئے دوسری اصطلاحیں بھی رائج ہیں۔ جیسے انشائیے لطیف، لطیف پارہ یا ادب لطیف سے موسم کیا جاتا رہا ہے۔ بقول پروفیسر محمد یسین:

''انشائیہ ادب لطیف وہ صنف ہے جسے ہم عام طور پر ہلکے پھلکے Light literature سے منسوب کرتے ہیں۔یعنی جس میں انشا پردازی کا مقصد علمی وادبی، سیاسی وسماجی اصطلاح نہیں بلکہ محض نشاطی اور انبساطی ہے''۔ (۱۴)

ہر زبان جس کا ادبی سرمایہ ہوتا ہے اس کے ادب کا ذخیرہ دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ مثلاً ادب لطیف اور ادب سنجیدہ، ادب لطیف (Light Literature) میں شعری اور نثری اصناف ہیں۔ جیسے غزل، مرثیہ، شہر آشوب، رباعی، قصیدہ، مثنوی ، سہرا، قطعہ اور گیت وغیرہ شعری اصناف ہیں۔ حکایت، داستان، تمثیلہ، سوانح حیات، ڈراما، ناول، کیفیہ، افسانہ، خاکہ، رپورتاژ، مکالمہ، فکاہیہ اور انشائیہ وغیرہ نثری اصناف ہیں۔ادب سنجیدہ میں علوم اور سائنسی علوم شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً عمرانیات، فلسفہ، منطق، تاریخ، دینیات، سیاست، معاشیات، سماجیات کا تعلق علوم سے ہے اسی طرح طبعیات، نباتیات، حیاتیات، کیمیات، فلکیات، اور ریاضیات، نفسیات وغیرہ سائنس میں شامل ہیں۔ علمی اور سائنسی مضامین سنجیدہ بیانی کی وجہ سے ادب لطیف سے بہت دور ہیں۔

ادب لطیف زبان وادب کا ایک حصہ ہے اور تخلیق کارانہ عقل وعمل کی دنیا ہے۔ ادب لطیف کو تحریر کی ایک خاص صنف خیال کیا جاتا ہے۔ ادب لطیف سے مراد ایک خاص رنگ وروپ کی تحریر جو ایک زمانہ میں ''نیا زیت'' یا ''ٹیگوریت'' سے موسوم تھی ادب لطیف کا موضوع خاص طور پر عورت اور فطرت کے حسین مناظر ہیں۔اس ادب کو منثور شاعری کہنا کچھ غلط نہ ہوگا۔اس کا ایک رنگ اور لب ولہجہ ہوتا ہے، جو انشائیہ کے رنگ اور لب ولہجہ سے قریب تر ہوتا ہے لیکن انشائیہ نہیں۔

انشائیہ نہ ادب لطیف اور ادب پاروں کی طرح کھوکھلا ہوتا ہے اور نہ ہی مضمون کی طرح خشک بلکہ وہ ادب لطیف اور مضمون کے درمیان واقع ہوتا ہے اس سلسلے میں پروفیسر علیم اللہ حالی اس طرح رقم طراز ہیں۔

''انشائیہ دراصل ایسے اور ادب لطیف کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ نہ یہ ادب لطیف اور ادب پاروں کی طرح کھوکھلا اور بے مغز ہوتا ہے اور نہ ایسے کی طرح خشک انشائیہ ادب اور ادب پاروں لطیف سے حسن بیان لیتا ہے اور ایسے سے موضوع کی (Stability) استقامت اول الذکر ہمیشہ جز واعظم ہوتا ہے۔'' (۱۵)

مثال کے طور پر انشائیہ ''اونھ'' سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''خدا اس اونھ سے بچائے جس کی زبان پر آیا اس کو تباہ کیا جس گھر میں گھسا اس کو ستیاناس کیا اور جس ملک میں پھیلا اس میں گدھے کے ہل چلوائے ۔ثبوت درکار ہو تو دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو اونھ نے زمانے کے کیا کیا رنگ بدلے جرنیل گرداش کو نپولین نے حکم دیا تھا کہ انگریزوں کی فوج کے پیچھے ابھی پہنچ جاؤ اور پو پھٹنے سے پہلے پشت پر دباؤ ڈالو۔ میں سامنے سے حملہ کرتا ہوں۔ بلوشر کے آنے سے پہلے اس فوج کو رگڑ ڈالیں گے۔ جرنیل گرداش اونھ کر دیتا ہے صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر روانہ ہوتا ہے۔ واٹرلو کی لڑائی نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا کا نقشہ بدل دیتی ہے''۔(۱۶)

انشائیہ ایک طرح سے ادب لطیف کا پروردہ ہوتا ہے وہ زندگی اور اس کے مسائل کو اپنے مخصوص نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ حیات کے اور کائنات کے الگ الگ رنگوں کا تماشائی ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سلیم آغا قزلباش کی رائے ہے:

''انشائیہ ایک گتھی ہوئی تحریر ہے۔ جس میں ایک نقطہ خیال دوسرے نقطہ خیال سے پھوٹتا ہے اور پھسل کر دوبارہ پہلے نقطہ میں سمیٹ آتا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ جب یہ دوبارہ مرکزی نقطہ کو چھوتا ہے تو معنی کا ایک نیا پرت فکر کا ایک انوکھا زاویہ اور خیال کی ایک تازہ لہر نمودار ہو جاتی ہے''۔(۱۷)

انشائیہ نگار فکر اچھوتا پن، خیال اور جذبے کے سہارے خیالات کی دنیا آباد کرتا ہے اور قاری کو اس کی سیر کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ انشائیہ میں نفسیاتی دوری اور ذاتی شعور کی رنگ آمیز قاری کی دلچسپی کا سبب بنتی ہے ۔انشائیہ نگار اصل بات کو صرف شروع کرتا ہے پڑھنے یا سننے والے اپنے خیالوں میں اس کی وضاحت کرتے ہیں

اوراس پرغور کرتے رہتے ہیں انشائیہ نگار بھی اس کے ساتھ شامل رہتا ہے انشائیہ نگار صرف اشارے کرتا ہے اس لئے انشائیہ کی ایک خصوصیت عدم تکمیل بھی ہے۔

*****

انشائیہ کی تکنیک

اس صنف ادب میں زبان سازی کے اعتبار سے بھی اور خیال آفرینی کے نقطہ نظر سے بھی بیشتر نثر نگاروں نے اس صنف میں طبع آمائی کی جس طرح اردو کے تقریباً سبھی شعراء نے غزل کی آبیاری کی ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ کامیاب رہے اور کچھ ناکام، اسی طرح انشائیہ میں بھی کچھ کامیاب رہے اور کچھ ادیبوں نے انشائیہ نما کی سی تحریریں تحریر فرمائیں۔

شخصی انکشاف (انکشافِ ذات):

انشائیہ کی بنیادی تکنیک یہ ہے کہ اس کا شخصی یعنی داخلی ہونا ہے۔جس میں انشائیہ نگار اپنے ذاتی خیالات وجذبات واقعات اور تجربات کو اپنے نئے انداز میں بیان کرتا ہے۔اس لئے اس کو ''پرسنل ایسّے'' کہا گیا ہے اس سلسلے میں مشتاق قمر کی رائے ہے:

''انشائیہ سلیف پروجیکشن کی صنف ہے''۔ (۱۸)

چونکہ اس میں انشائیہ نگار ذاتی خیالات کا اظہار کرتا ہے جس سے اس کی شخصیت کا باطنی عکس دکھائی دیتا ہے۔ پروفیسر نظیر صدیقی نے اپنے انشائیوں اور مضامین کے مجموعہ شہرت کی خاطر کے دیباچہ میں انشائیہ کے بانی فرانس کے مونٹین کا ایک جملہ نقل کیا ہے۔جو انشائیہ کو سمجھنے کے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔

''میں جس کی تصویر کھینچتا ہوں وہ میں خود ہوں''۔ (۱۹)

مونٹین کا کہنا تھا کہ اس میں ایک ادیب کی حیثیت سے کچھ کہنے کی جراءت تھی جو وہ ایک انسان کی حیثیت سے محسوس کرتا تھا۔ناول افسانے اور ڈرامے میں ادیب کی شخصیت کا وہی حصہ نظر آتا ہے۔جو اس کے ذہن وفکر سے تعلق رکھتا ہے۔اس میں کردار مختلف مسائل پر سوچے سمجھے ہوئے خیالات کو پیش کرتا ہے۔لیکن انشائیہ میں لکھنے والے کی شخصیت کا وہ حصہ منعکس ہوتا ہے جو اس کے خیالات ونظریات سے اتنا تعلق نہیں رکھتا۔جتنا اس کے فطری میلانات اور تحت الشعوری تحریکات Impulser سے نے نظیر صدیقی انشائیہ کیا ہے میں لکھتے ہیں:

''انشائیہ میں جو باتیں کہی جائیں ان کا لکھنے والے کی شخصیت سے تعلق ہو
بلکہ غیر شخصی باتوں کو شخصی انداز میں بیان کرنا انشائیہ کو شخصی بنا دیتا ہے''۔ (۲۰)

انشائیہ بالکل داخلی اور ذاتی صنف ہے۔اس میں مصنف کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے اس کی کامیابی کا

رازاس مواداور ہیئت سے ہے۔اس میں انشائیہ نگار کی روح جلوہ گر ہوتی ہے۔کاسانووا کے مطابق:

''انشائیہ جیسی شخصی صنف ادب ''میں'' کے مظاہرے ہی کے لئے عام وجود میں آئی''۔(۲۱)

انشائیہ کی خاص خوبی داخلیت اور خودکلامی ہے۔ایک کامیاب انشائیہ نگار اپنے ذاتی تجربات سے قارئین کو آگاہ کرتا ہے اس لئے وہ کھل کر اپنے تجربات ان سے بیان کرتا ہے۔اس لحاظ سے خودنوشت انشائیہ کا بہترین جز ہے۔نیاز فتح پوری کی رائے ہے:

''یہ (انشائیہ) ایک قسم کی Soliloquy زیادہ تر Subjective قسم کی، جسے ہم Self composition بھی کہہ سکتے ہیں۔یہ ایک خاص قسم کے فکر وتصور کا نتیجہ ہے، جس میں تجزیہ جذبات، نفسیاتی مطالعہ، منطقی استدلال، فلسفیانہ تفکر، متصوفانہ استقراء اور انشائیے عالیہ کا جمالیاتی اسلوب، سب کچھ پایا جاتا ہے''۔(۲۲)

مغربی ادیبوں میں مونٹین، بیکن، براؤن ڈرائیون، ایڈسن جانس، گولڈسمتھ، چارلس لیمب، کارلائل، میکالے، رسکن، چٹرسن اور کارڈئر وغیرہ کے انشائیہ سے ان کی شخصیت کا بڑی حد تک اظہار ہوتا ہے اردو ادیبوں میں سرسید، آزاد، حالی، شرر، مہدی افادی، سجاد انصاری اور حسن نظامی وغیرہ کے بعض انشائیوں میں ان کی شخصیت دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے ہمنوا عصمت اللہ نے انشائیہ کے شخصی ہونے پر بہت زور دیا ہے۔انشائیے یا پرسنل ایسّے کی تعریف میں مغربی ادیبوں نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انشائیے میں شخصی عنصر کا وجود لازمی ہے۔

بے تکلفی:

انشائیہ میں دوستانہ بے تکلفانہ انداز پایا جاتا ہے۔اس میں اگر اجازت ہو تو عرض کرنے والے پر تکلف ماحول کے بجائے اماں یار سنو بھی، ارے بھائی سنو، سنو یارو، نہیں ماں، جانے دو یارو، نہیں با نہیں ماں، لائٹ لے، جاندو وغیرہ والی بے تکلفانہ فضاء پائی جاتی ہے جس میں انشائیہ نگار اپنی خواہشات وخیالات اور عادات واطوار کا بھی اعتراف کرتا ہے۔جو دوستانہ ماحول میں ہی ممکن ہوسکتا ہے۔انشائیہ میں دراصل چیز موضوع نہیں بلکہ چیز شخصیت کا حسن ہے۔اس بات میں رشید احمد صدیقی کی رائے ہے:

''میں لکھنے میں ابتداء اور ارتقاء اور عروج وغیرہ قسم کی بات ملحوظ نہیں رکھتا۔ مخلصانہ اور بے تکلف گفتگو میں ان کی امور کی پابندی نہیں کی جاسکتی اور نہ کرنا چاہیے۔۔۔۔ میں قارئین کو اپنا اچھا اور بے تکلف دوست سمجھ کر گفتگو کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اچھی گفتگو کسی پروگرام کے تحت نہیں ہوا کرتی بلکہ گفتگو کرنا ایک سفر کی مانند ہے جس میں مختلف مناظر، مختلف اشخاص اور مختلف حالات وحوادث کو اپنے رنج وراحت پر ترجیح دینا ہے۔ یہ شرافت ہی نہیں اچھے لکھنے والوں کی بھی پہنچان ہے۔ لکھنے میں اور گفتگو کرنے میں رونا، گڑگڑانا، رعب بھٹانا، اور قابلیت جتانا جاہلوں کا کام ہے''۔ (۲۳)

موضوع:

انشائیہ نگار کی حالت تو اس شخص کی جیسی ہوتی ہے جو عمدہ اور خوشگوار موڈ میں اپنے دوست کے ساتھ بیٹھا بے تکلف ہو کر باتیں کر رہا ہو۔ تازگی انشائیہ کی جان ہے۔ تازگی سے مراد موضوع اور نقطہ نظر وہ انوکھا پن بھی ہے جو قاری کو زندگی کی یکسانیت اور ٹھراؤ سے اوپر اٹھا کر ماحول کا جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے اس سلسلے میں وزیر آغا کہتے ہیں:

''انشائیہ ہی ایک صنف ادب ہے جس میں نہ صرف تازگی کا سب سے زیادہ مظاہرہ ہوتا ہے بلکہ جس کی ذراسی کمی بھی انشائیہ کو اس کے فنی مقام سے نیچے گرادیتی ہے''۔ (۲۴)

انشائیے سے روبرٹ لنڈ کا اپنا مطالعہ بہت محدود سا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''ہم انشائیے سے صرف اتنا ہی چاہتے ہیں کہ وہ اپنے طرز تحریر سے ہمیں خوش کرے اور اپنے موضوع کو اختصار کے ساتھ کسی قدر نئی روشنی میں پیش کرے''۔ (۲۵)

موضوع کے رنگ سے انشائیہ کا میدان بہت وسیع ہے اس میں انشائیہ نگار آزاد گھومتا ہے۔ کسی بھی ادنیٰ سے ادنیٰ شئے کو موضوع بنا سکتا ہے۔ اس کی دنیا رنگ برنگی ہوتی ہے۔ وہ آزاد نہ کھولے آسمان کی سیر کر سکتا ہے سمندر میں غوطہ لگا کر گونگھے میں سے ہیرے موتی بھی لاسکتا ہے۔ سنجیدہ موضوع کو غیر سنجیدہ بنا کر پیش کرنا اس کا کمال ہے۔ انشائیہ نگاروں پر یہ قول ثابت ہوتا ہے:

"He can Catch hold of anything and can

make some thing, out of nothing"

انشائیہ کی تر وتازگی اور نفاست، تشبیہات، تلمیحات، استعاراتی اور تمثیلی انداز بیان کا تعلق اس کے مزید اضافے سے ہوتا ہے۔ حسنین صاحب کی یہ تحریر ملاحظہ ہو:

''انشائیہ میں موضوع کی کوئی قید نہیں انشائیہ نگار جس موضوع پر بات کرنا چاہے کھل کر کرسکتا ہے۔ اس میں حیات کا بھی تجزیہ کیا جاسکتا ہے اور کائنات کا بھی۔ اس میں ماضی کی سیر کی جاتی ہے اور حال کی بھی۔ انشائیہ نگار کو چاہیے کہ مضمون تازہ اور جدید ہو جو عوام کی نظروں سے اوجھل ہو''۔ (۲۶)

ہر وہ بات جو انشائیے کے ذریعہ خوب تر انداز میں کہی جاسکتی ہے وہ انشائیے کا موضوع ہے۔ انشائیہ دلکشن اور پر لطف اسلوب میں تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنے کا نام ہے۔ ڈاکٹر انور سید لکھتے ہیں:

''انشائیہ کے داخلی نظام میں موضوع کو ایسی گراں قدر اہمیت حاصل نہیں جیسی مضمون یا مقالہ میں حاصل ہوتی ہے۔ بلاشبہ موضوع ہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد انشائیہ نگار اپنے تصورات کے غبار اُڑاتا ہے۔ تاہم انشائیہ نگار کا ذہن اگر رسا ہے تو وہ جس موضوع کو بھی مَس کرے، وہ موضوع لو دینے لگتا ہے ۔۔۔۔ موضوع نہ تو عظیم ہوتا ہے اور نہ حقیر۔۔۔ موضوع رسمی، معمولی، پیش پا افتادہ، عام اور بار بار رگیدا ہوا بھی ہو تو ایک خوش فکر انشائیہ نگار اس کے باطن سے نور کی جوالا اور معنی کی پھل جھڑی برآمد کرسکتا ہے۔''(۲۷)

اچھا انشائیہ نگار جب موضوع میں گہرائی، وسعت اور بلندی تلاش کرتا ہے اور اس موضوع پر غور کرنے کے نئے زاویئے ڈھونڈ نکالتا ہے تو عام آدمی کا تاثر و علم ان کے روزمرہ کے موضوعات پر کتنا سطحی ہوتا ہے۔ عبارت بریلوی تحریر کرتے ہیں:

''انشائیہ کا موضوع عام طور پر علمی و ادبی نہیں ہوتا۔ معلومات کا فراہم کرنا اس کا مقصد نہیں اس کی نوعیت ذاتی اور انفرادی ہے۔ ایک داخلی آہنگ بھی اس میں پایا جاتا ہے جس کی حدیں غنائیت سے جاملتی ہیں''۔ (۲۸)

بقول جے۔ پی مونٹین

''انشائیہ نثر کا ایک ایسا ٹکڑا ہے، جس میں مصنف دنیا کے کسی بھی موضوع کے باب میں اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے''۔ (۲۹)

ایک انشائیہ نگار معمولی بات کو غیر معمولی اور غیر معمولی کو معمولی بنا کر پیش کرتا ہے۔ وہ ہر ایک موضوع پر قلم اٹھاتا ہے قاری کو دنیا کی سیر کرواتا ہے۔ منزل سے دوری یا موضوع سے بے نیازی انشائیہ نگاری کا ایک ایسا وصف ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اچھے انشائیہ نگاروں نے اکثر ادنی باتوں کو انشائیہ کا موضوع بنایا ہے۔ انشائیہ نگار کی ژرف نگاہی، جودت فکر اور خیال کی رعنائی کن کن اسالیب سے اس ادنی موضوع کو اٹھا کر فکر و فن کی بلندیوں پر لے جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اردو انشائیہ نگاروں کی کھیپ کی کھیپ موجود ہے۔ بارہواں کھلاڑی، چرواہا، دسترخوان، سوال اٹھانا، مکان بنانا از غلام جیلانی اصغر، آئس کریم کھانا از مشتاق قمر، چھینک از انور سعید، اخبار از اکبر حمیدی، تکلف از حامد برگی، ڈائری از اسد اللہ وغیرہ۔

انگریزی ادب میں انشائیہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ جنہوں نے انشائیہ نگاری کے ذریعہ ہی انگریزی ادب میں اپنا مقام پیدا کیا۔ چارلس لیمب، ولیم ہینرلٹ، لے ہنٹ، آریل اسیٹونسن وغیرہ گزشتہ صدی کے نامور انشائیہ نگار تھے ان کے انشائیوں کے موضوع بھی روزمرہ کے ادنی مشاہدوں، تجربوں اور سوچوں پر مبنی تھے اسٹیونس نے تو ''کاہلوں کی وکالت''، لیمب نے ''کنواروں کا شکوہ'' بہت خوبصورت انشائیہ تحریر کئے۔ فطری مناظر، مظاہر اور مشاہدات پر تو بہت گراں قدر انشائیے لکھے گئے۔ ولیم ہنرلٹ کا انشائیہ ''سیر و سفر پر'' ان انشائیوں میں سرفہرست ہے۔ یہ وہ جواہر پارے ہیں جن کے ذکر کے بغیر انگریزی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔

اسلوب:

کفایت لفظی انشائیہ کے اسلوب نگارش میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اچھے انشائیہ کا ایک لفظ چنندہ آخری پیرا ہونا چاہیے۔ انشائیے کے اسلوب کے ضمن میں رشید امجد کی رائے ہے:

> ''انشائیہ میں اسلوب کی دو باتیں خصوصی ہیں۔ اول یہ کہ انشاء کے لفظوں کو اشکال میں ڈھالنے کی وہ قدرت جس سے ان کی داخلی اور خارجی تصویر پر بنتی چلی جاتی ہیں۔ دوسرے وہ اعلیٰ درجہ کی روانی جو سلاست و بلاغت کے ساتھ ایک ادبی معراج اور حسن بھی رکھتی ہے''۔ (۳۰)

گفتگو بھی ایک آرٹ ہے۔ روشن خیال، خوبصورت الفاظ، اچھا انداز گفتگو کا ایک ہنر ہے۔ جو ہر کسی کی بس کی بات نہیں۔ جس طرح ایک آرٹسٹ اپنے فن کا مظاہرہ بہ خوبی کر سکتا ہے۔ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک کامیاب انشائیہ نگار اپنے انشائیہ میں زبان کی شگفتگی، لفظوں کی حسن آرائی اور خیال کی سجاوٹ کے ذریعہ زندگی کے تجربات کو باہر نکالتا ہے اور قاری کو متاثر کرتا ہے اس سلسلے میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کہتے ہیں:

''انشائیہ کی امتیازی خصوصیت حسن انشاء ہے اس کے نام ہی سے ظاہر ہے
انشائیہ وہ ہے جس میں بجائے مغز و مضمون کے اصل توجہ حسن عبارت پر ہو''۔
(۳۱)

انشائیہ تخلیقی قوت (Creative Faculty) ہے۔ جیسے کہ عام تصور ہے۔ انشائیہ کسی بات یا خیال کی محض تحریر نہیں بلکہ انشاء کو عبارت آرائی تصور کیا جاتا ہے۔ اور اس کو قادر کلامی سے اس کی مراد لی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں میر انیس کا یہ شعر دیکھئے:

''گلدستہ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں''

ایک اچھا انشائیہ نگار تخلیقی قوت کے ذریعہ مضمون کو سو رنگ سے باندھتے ہیں۔ اس کی خوبصورت انشائیہ نگار کے تخلیق اور قوت انشاء کا بہتر استعمال ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنے خیالات اور مافی الضمیر کے واضح اظہار کو بھرپور طریقے سے استعمال کرتا ہے۔ تخلیق (Creator) اور تعمیر (Mater) تحریر دلچسپ اور پر اثر ہو۔ اس میں الفاظ کی حسن آرائی اور معنی خیز انداز پیش کیا گیا ہو۔

انشاء حسن خیال ہے، حسن بیانی، حسن لفظی اور حسن معنوی بھی ہر ادبی تحریر شعری ہو یا نثری انشائی قوت سے جنم لیتی ہے۔ انشاء پارہ ادب ہے خوبصورت اور خوش رنگ نازک تتلی کی مانند ہے۔

دلکشی و رعنائی کا راز حسن ہے۔ جمالیات کی نظر حسن کی متلاشی ہوتی ہے۔ وہ حسن الفاظ، حسن معنی، حسین خیال اور موزوں اظہار اور ان کی مناسب ترتیب میں حسن کو دیکھتی ہے اس طرح دیکھنا بھی ایک آرٹ ہے۔ یہ خوبصورت اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

''تخلیقی نثر کے حسن بے حجاب کو اگر کسی صنف میں دیکھا جا سکتا ہے تو یہ
انشائیہ اور صرف انشائیہ ہے''۔ (۳۲)

اختصار:

ایک معیاری انشائیہ وہی شمار ہوگا جس میں اختصار اور جامعیت ہو۔ انشائیہ میں الفاظ اور خیالات کو پیش کرنے کی کوئی خاص ترتیب نہیں ہوتی بلکہ انشائیہ نگار کے ذہن میں موضوع سے متعلق یا موضوع سے جڑے دوسرے ضمنی خیالات جس طرح سے آتے ہیں وہ انھیں تحریر کرتا چلا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں:

''غیر ضروری طوالت سے بچو! کہنے کو نئی بات نہیں تو انشائیہ سے دور، رہو

(۳۳)۔''

انشائیہ میں جملے مختصر مگر جامع ہوتے ہیں اور ہر جملہ معنوی اعتبار سے منفرد ہوتا ہے۔''سلیم آغا قزلباش ''انشائیہ ایک ہمہ جہت صنف نثر، میں تحریر لکھتے ہیں:

''انشائیہ میں ایجاز واختصار کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس سے انقباض کی صورت پیدا نہ ہو بلکہ اس کے اختصار کا دامن وسیع نظر آئے''۔ (۳۴)

رابرٹ لنڈ کے قول کے مطابق:

''ہم انشائیہ نگار سے صرف اتنا ہی چاہتے ہیں کہ وہ اپنے طرز تحریر سے ہمیں خوش کرے اور اپنے موضوع کو اختصار کے ساتھ کسی قدر نئی روشنی میں پیش کرے''۔ (۳۵)

انشائیہ میں اختصار سے مراد یہ نہیں کہ بات نہ اتنی کم کی جائے کہ محض اشارے و کنائے کی حیثیت رکھے اور نہ اتنی زیادہ کے سننے والے تھک جائیں۔جس طرح ہم بات کرتے ہوئے اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ سننے والا ہماری بات سمجھ رہا ہے یا نہیں۔اسی طرح انشائیہ نگار بھی سمجھتا ہے کہ اس نے اختصار کے باجود اپنا مقصد صحیح طور سے ادا کیا ہے یا نہیں۔انشائیہ میں اختصار کے ساتھ جامعیت شرط ہے۔

غزل کا سا ایجاز:

چنانچہ بعض ناقدین نے اسی بات کے پیش نظر انشائیہ کو غزل کے مماثل قرار دیا ہے۔مثلاً''خیال پارے ''کے دیباچہ کے مطابق:

''انشائیہ اور غزل کے ایک شعر میں گہری مماثلت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ غزل کے شعر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی ایک نکتہ کو اجاگر تو کیا جاتا ہے لیکن اس کے تمام پہلوؤں کو ناظر کے فکر و ادراک کے لئے ناممکن صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔یہی حال انشائیہ کا ہے۔اس موضوع کے صرف چند ایک انوکھے پہلوؤں کو پیش کر دیا جاتا ہے اور اس کے بہت سے دوسرے پہلو تشنہ اور ناممکن حالت میں رہ جاتے ہیں''۔ (۳۶)

ہمارے بعض ناقدین نے صنف انشائیہ کو نثری غزل اور مرصع غزل سے بھی موسوم کیا ہے۔انشائیہ کی

ہیئت ترکیبی غزل کی سی ہے۔انشائیہ کی تحریر بھی ایسے خیال یا جملے سے ہوتی ہے جو مطلع کی صورت انشائیہ نگار کے ذہن میں آتا ہے اور انسپریشن (Inspiration) کا کام کرتا ہے۔غزل مسلسل کی طرح موضوع سے متعلق مضامین ذہن میں آتے ہیں۔جو نظم کے بجائے نثر ہوتے ہیں۔اس سلسلے میں حامد برگی انشائیہ کا فن میں رقم طراز ہے۔

''انشائیہ کو میں نثری غزل قرار دیتا ہوں جس میں اسی نکتہ رسی، ژرف نگاہی ، خیال آفرینی، ایمائیت، ندرت، فکر نغمگی اور پرکاری کی ضروری ہے۔جیسی غزل میں یہ بات شاعری یا نثر نگاری کی کسی اور صنف میں اس درجہ موجود نہیں جتنی انشائیہ میں''۔(۳۷)

اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد حسنین اس طرح لکھتے ہیں:

''انشائیہ نثر کی غزل ہے جس کا ہر مصرعہ ایک نیا کیف سرور بخشتا ہے''۔ (۳۸)

''نیز ڈاکٹر حسنین نے انشائیہ کو صنف کیفیہ سے بھی موسوم کیا ہے''۔(۳۹)

کیفیہ نثر کی شاعری ہے جس میں ایک ہی ذائقہ ہوتا ہے۔مگر انشائیہ کئی پھلوں کا مزہ رکھتا ہے۔اس میں وہ خمار شامل رہتا ہے جس کی لہر میں اوپر نیچے تک آتی رہتی ہے۔جس میں انگریزی صنف شاعری Balled جیسی تاثر ہوتی ہے۔غلام جیلانی اصغر کے مطابق:

''مزاج کے لحاظ سے غزل اور انشائیہ میں کوئی فرق نہیں لیکن ہیئت کے لحاظ سے یہ دونوں اصناف جداگانہ خاصیتوں کے حامل ہیں''۔(۴۰)

انشائیہ کا ہر پیرگراف خیال کی ایک نئی لہر کو پیش کرتا ہے شعر کی طرح نئے خیال کی خوبی اس کی جامعیت ہے اس سلسلے میں جمیل آزاد اس طرح رقمطراز ہیں:

''انشائیہ میں غزل کا سا ایجاز، افسانے کا تاثر، ناول کا سا فلسفہ حیات اور ڈرامے کے انتظار یہ لمحات اور اس کے پس منظر میں طنز و مزاح کی دھیمی دھیمی سمفنی ہوتی ہے اور ان سب پر مستزاد انکشاف ذات جو خاص انشائیے کے لئے مختص ہے''۔(۴۱)

انشائیہ نگار غزل گو شعراء کی صنف میں آجاتا ہے۔وہ خیال کے حسن و نزاکت کی طرف نگاہ رکھتا ہے اور اپنے فن پارے کی مجموعی حسن کو متاثر کرتا ہے۔انور سدید کے مطابق:

''افسانوی یا ڈرامائی عناصر انشائیے کی ترتیب میں قیمتی اجزاء کا کام تو دے سکتے ہیں لیکن اس کا مجموعی مزاج نہیں بن سکتے''۔ (۴۲)

غرض کے ہر شعر و خیال میں شاعر کی روح سمائی ہوئی نظر آتی ہے اور ہر شعر و خیال ایک جاندار وجود کی صورت ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اسی طرح انشائیہ جو تاثر پیدا کرے اسے ہم انشائیہ نگاری کی ذات کے حوالے سے دیکھیں تو انشائیہ نگار کا ہر خیال قاری کو اپنا خیال معلوم ہوگا۔ اپنے دل کی بات صرف اظہار کا انداز انشائیہ نگار کا منفرد ہوگا۔ اس سلسلے میں اطہر پرویز کی یہ تحریر ملاحظہ ہو:

''انشائیہ کا فن غزل گوئی کا فن ہے۔ جہاں ایک شعر کے اندر ایک خیال سما جاتا ہے جس طرح غزل گو اپنے خیالات کی تشریح نہیں کرتا انشائیہ نگار بھی یہ کام پڑھنے والے کے سپرد کر دیتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ خیالات اتنے اختصار کے ساتھ پیش کئے جائیں کہ سمجھنے میں دشواری پیش آئے بلکہ اس کے برخلاف یہاں تقریر کی وہ لذت ہوتی آپ پڑھنے کے بعد خود کہنے پر مجبور ہو جائیں۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے''۔ (۴۳)

طنز و ظرافت:

اس صنف کو مزاح نگاری سے جوڑا جاتا ہے۔ بڑا مضحک خیال ہے یہ مزح نگاری ہو یا ہجو نگاری، طنز، المیہ نگاری ہو یا رومان نگاری، رجز ہو یا جوش ولولہ کی ماہیت توصیفی ہے۔ یہ صنفی نہیں ہوتی کسی شخص کا طنز نگار ہونا اس کے انشائیہ نگار ہونے میں مانع نہیں، طنز و مزاح ادب کی صنف نہیں اسلوب کی صفت ہے۔ اسلوب کی یہ صفات ادب کی تصنیف میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ایک ناول نگار بھی طنز نگار ہوسکتا ہے یا مزاح نگار بھی ہوسکتا ہے ایک ڈراما نگار بھی اور ایک شاعر بھی ویسے بھی اہل مغرب طنز و مزاح کو ادب کی اصناف میں شمار نہیں کرتے۔

انشائیہ میں مزاح کی دو قسمیں استعمال کی جاتی ہیں ظرافت اور ہجو۔ ظرافت اور ہجو سے انشائیہ پر رونق ہوتا ہے۔ اس میں ایسی تازگی آجاتی ہے کہ قاری بار بار مطالعہ کی چاہت رکھتا ہے اس میں انشائیہ نگار شگفتگی کو قائم رکھنے کے لئے طنز و ظرافت کا استعمال کرتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اپنی تنقید کی کتاب ''انشائیہ اردو ادب'' میں اس طرح رقمطراز ہیں:

''نقصان یہ ہوا کہ اسلوب کی شگفتگی کو مزاح کا مترادف تصور کر لیا گیا چنانچہ انشائیہ اور طنز و مزاح کی حدود کو آپس میں گڈمڈ ہونے کا موقع مل گیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضرور ہے کہ مزاح دراصل ایک مضحک فعل اور طنز غیر معمولی،

سنجیدہ عمل ہے۔ انشائیہ ان دونوں عوامل سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن انھیں اصل مزاج پر غالب نہیں آنے دیتا''۔ (۴۴)

سید محمد حسنین اس طرح رقمطراز ہیں:

''انشائیہ مزاحیہ مضمون، مزاحیہ افسانہ (جسے فکاہیہ سے موسوم کرنا احسن ہے) طنزیہ نہیں ہوتا۔۔۔نئی سطر انشائیہ کو جو چیز طنزیہ اور مزاحیہ مضامین (یہ بھی فکاہیہ میں شامل ہیں) سے الگ کرتی ہے، وہ یہ کہ جہاں طنز نگار قارئین کو فراز سے مخاطب کرتا ہے اور مزاح نگار نشیب سے، انشائیہ نگار ان کو ان کی سطح سے پکارتا ہے۔ اور وہ بھی ایسے کہ انھیں چپکے سے اپنے دل کی گہرائی میں اُتار لیتا ہے، ان سے بے تکلفی سے محوراز و نیاز ہوتا ہے کہ لوگ اس کی باتوں سے محظوظ ہوتے ہیں اور ان پر غور و فکر بھی کرتے ہیں۔ انشائیہ میں مزاح کا عنصر ہوتا ہے۔ بولی ٹھولی، گدگدی چٹکی پھبتی، ظرافت کی دھیمی سمفنی انشائیوں کی جان ہے۔۔۔'' (۴۵)

ڈاکٹر اختر اورینوی کے بقول:

''انشائیوں میں مزاح کا عنصر بھی ضروری ہے ایک انشائیہ نگار مزاح کے ترکش کا ہر تیر استعمال کر سکتا ہے۔ مگر سلیقہ شرط ہے۔ مثلاً مزاح لطف سے لے کر طنز تک کی یہاں گنجائش ہے اور ہنسی مداق، بولی، ٹھولی، پھبتی، سوائینگ، گدگدی، چٹکی اور ظرافت کی دوسری قسموں کا برمحل استعمال انشائیہ میں جان ڈال دیتا ہے۔ جملہ بازی یا فقرے کسنا یا وقت کی سوجھ بوجھ یا پتے کی کوئی بات کہہ دی یا کوئی چھبتا ہوا ریمارک یا مہکی سی چوٹ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ظرافت کا استعمال ہر جگہ خوش مذاقی چاہتا ہے۔''(۴۶)

بالغ ذہنی:

انشائیہ جہاں اپنے آپ میں بہت سی تکنیک رکھتا ہے وہیں اس کی ایک تکنیک بالغ ذہنی ہے۔ یعنی جس کے ذریعہ انشائیہ نگار کے ذہن کو تقویت بخشتا ہے اور ساتھ ہی اس کا مشاہدہ اور تجربہ وسیع کرتا ہے۔ انشائیہ نگار کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے موضوع کی طرف قاری کو متوجہ کرے اور موضوع سے متعلق خامیوں کو ایک ایک کر کے قاری کے ذہن سے دور کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ قاری کے ذہن میں موجود سوالات کو چاہے وہ خیالات سے

وابستہ ہو یا نظریات سے ہو یا پھر احساسات سے تعلق رکھتے ہوں ان کا بھرپور جواب دیں۔ انشائیہ نگار کو چاہیے کے وہ قاری کو نئے زاویہ فکر سے آگاہ کرے اور اسے اس موضوع پر غور وفکر کی دعوت دے۔ اگر انشائیہ نگار قاری کو سوچنے پر مجبور کریگا تو وہ کامیاب انشائیہ نگار اور اس کی تخلیق کامیاب انشائیہ کہلائے گی۔

نیاز فتح پوری نے اپنے ایک مقالہ ''اردو کا پہلا اور آخری انشائیہ نگار'' میں انشائیہ کے فن کا مجموعی حیثیت سے جائزہ لیتے ہوئے، اس کی اس تکنیک پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اس فن لطیف (انشائیے) کا تعلق صرف سلاست زبان سے نہیں بلکہ تخیل شاعرانہ اور شعور ناقدانہ سے بھی ہے اور حکیمانہ نکتہ رسی سے بھی۔ اس کے لئے نہ صرف اعلی درجہ ژرف درکار ہے جو صرف وسیع مطالعے اور دقیق مشاہدے ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ بلکہ فلسفیانہ انداز تفکر جدت، و اختراع یعنی Original Thinking بھی ضروری ہے جو ایک فطین وذہن، متوازن سلیم طبیعت اور ایک کشادہ پاکیزہ قلب ہی کو میسر آتی ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ سادہ زبان اور شگفتہ دل نشیں انداز بیان''۔ (۴۷)

دعوتِ غور وفکر:

ادیبوں اور مصنفین کے نزدیک انشائیہ کی ایک صفت دعوتِ غور وفکر بھی بتائی جاتی ہے۔ انشائیہ نگار اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں اپنے خیالات کو تخلیقی صورت میں عوام میں تقسیم کر دیتا ہے۔ یعنی انشائیہ نگار نہ تو کوئی نتیجہ اخذ کرتا ہے نہ مشورہ دیتا ہے۔ بلکہ اس کا کام محض اتنا ہوتا ہے کہ وہ کسی موضوع کے انوکھے اور تازہ پہلو کی طرف قاری کو متوجہ کرتا ہے۔ اور ایک مخصوص انداز میں سوچنے کی ترغیب دیتا ہے اور اس کا اس طرح سوچنے پر مجبور کر دینا ہی دعوت غور وفکر ہے۔

غلام جیلانی اصغر نے انشائیہ میں دعوت غور وفکر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انشائیہ ایک ایسی نثری تحریر ہے جو اتنی بے ربط ہے جتنی کہ زندگی خود اور جس طرح زندگی کے آخری میں حیاتیاتی وحدت وجود میں آجاتی ہے اسی طرح انشائیے کے منتشر اجزاء میں دیکھتے ہی دیکھتے ایک وحدت تاثر پیدا ہوجاتی ہے۔ زندگی خود کئی اجزاء سے عبارت ہے انشائیہ کی بھی یہی خوبی یا خصوصیت ہے یہ اجزاء فکری بھی ہوتے ہیں اور جذباتی بھی یعنی انشائیہ سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے اور محسوسات کے وسیع تر امکانات بھی چھوڑ جاتا ہے۔ آپ جب

انشائیہ ختم کر لیتے ہیں تو آپ سوچ کو ایک نیا اور غیر رسمی سا زاویہ مل جاتا ہے''۔
(۴۸)

انشائیہ نگار کا مقصد کبھی بھی اصلاح نہیں ہوتا بلکہ ان موضوعات تک جہاں ایک شخص کی نظر نہیں جاتی ان سے واقف کروانا ہوتا ہے۔اور ایسے پہلوؤں کو واضح کرنا ہوتا ہے جو مضمون میں پوشیدہ ہوتا ہے۔اور قاری کی سوچ کو ایک نئی رخ کی طرف لے جاتا ہے۔

مقصد:

انشائیہ کا ایک خاص مقصد قاری کو خوشی و مسرت پہچانا ہے۔سی ڈی پنٹو کے مطابق بنیادی طور پر انشائیہ کا مقصد اور مطمع نظر تفریح وانبساط ہوتا ہے۔لہذا اس میں کسی قسم کی تعلیم وتبلیغ نہیں ہونا چاہئے۔چنانچہ انشائیہ نگار اپنے دلچسپ اور رنگین اسلوب کے ذریعہ کسی موضوع سے متعلق اپنے خیال کو بے تکلف اور شگفتہ انداز میں پیش کرتا ہے تا کہ قاری محظوظ ہو سکے اور اس موضوع سے متعلق پوشیدہ امکانات روشن ہو سکیں۔یہی انشائیہ نگاری کا مقصد ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا انشائیے کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے مجموعی حیثیت سے اس کا جائزہ یوں لیتے ہیں۔

> ''بنیادی طور پر اس کا مقصد روشنی کی تحصیل ہے لیکن یہ روشنی کسی فلاسفر ہوا نور نہیں بلکہ خوش باش انسان کا اظہار ذات ہے۔انشائیہ نگار کا یہ منصب نہیں کہ وہ آپ کو کسی اونچے سنگھاسن سے مخاطب کرے۔یہ تو کسی ناقد مصلح یا مقرر کا کام ہے۔انشائیہ نگار تو آپ کا دوست،آپ کا ہمدم ہے جو کیفی ٹیریا کی کسی میز پر چائے کی گرم گرم پیالی سامنے رکھے آپ سے باتیں کرتا چلا جاتا ہے۔وہ طنز نگار کی طرح نشیب سے آپ کو اپنی ہیئت کذائی کا احساس دلا کر ہنسنے کی ترغیب دیتا ہے۔وہ تو ایک ہمدرد سطح پر آپ سے ہم کلام ہوتا ہے۔اور ایسا کرتے ہوئے وہ اپنی ذات کے کسی گوشے کو بے نقاب کر دیتا ہے۔یا زندگی کے کسی پہلو کو لحظہ بھر کے لیے روشنی کی گرفت میں لے آتا ہے۔یوں کہ آپ سوچتے اور محظوظ ہوتے چلے جاتے ہیں۔چنانچہ مزاح نگار کے برعکس (جو اسی کے مطابق کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے) ایک انشائیہ نگار کا کام یہ ہے کہ وہ آپ کو باتوں میں لگا کر کسی نہ کسی طرح اپنے گھر لے آتا ہے اور آپ کے مسلسل انکار کے باوجود آپ کو مجبور کر دیتا ہے کہ آپ اس کے ساتھ ناشتہ میں شریک ہو جائیں''۔ (۴۹)

انشائیہ کی تکنیک کے اس تفصیلی جائزہ کے بعد اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انشائیہ نگار تمام فکروں سے بے نیاز ہوکر، مختصر اور ہلکے پھلکے انداز میں بنا کسی روک ٹوک کے اپنے بے ترتیب خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اور بے تکلفی کے ساتھ دوستانہ میں قاری کو اپنے ان خیالات میں شامل کر لیتا ہے۔ ساتھ ہی موضوع کے متعلق کئی زاویہ اور نئے پہلو پر سوچنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس طرح انشائیہ نگار اپنے احساسات اور اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور لاشعوری طور پر اس کی شخصیت کے پوشیدہ پہلو بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

غرض ایک کامیاب انشائیے میں یہ تمام خوبیاں اور خصوصیات بدرجہ اتم ملتی ہیں۔ آخر میں ہم مجموعی حیثیت سے شیخ آدم کی رائے سے اتفاق کر سکتے ہیں کہ:

> ''انشائیہ ایک ایسی جامع اور فکر انگیز تحریر ہوتی ہے، جس میں مصنف بے تکلفی اور شگفتگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اس میں براہ راست تبلیغ یا تشہیر کی گنجائش نہیں ہوتی انشائیہ چند الفاظ کا بھی ہوسکتا ہے اور طویل بھی ،کائنات و مادری کی حقیر ترین یا اعلی سے اعلی شئے اس کا موضوع بن سکتی ہے۔ یہ سنجیدہ مزاحیہ یا طنزیہ ہوسکتا ہے۔ انشائیہ کے لیے لازمی اور بنیادی خصوصیت اس کی بے تکلف اور شگفتہ فضاء ہے جو تحریر کو دل نشین اور قابل قبول بنادیتی ہے''۔ (۵۰)

انشائیہ نگار کسی سماجی خرابی کو ہمدردانہ انداز میں بیان کرتا ہے تو وہ مزاح بن جاتا ہے۔ اگر وہ تلخ لہجے میں پیش کرتا ہے تو وہ طنز کہلاتا ہے۔ انشائیہ میں طنز ہو یا مزاح از خود پیدا ہوتا ہے اس وصف کو الگ سے تحریر کی ضرورت نہیں ہوتی۔

انشائیہ کا بنیادی مقصد ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہو، یا اسے سوچنے پر مائل کرنا، طنز و مزاح دونوں مقاصد کی تکمیل کے لئے معاون ہیں۔ چونکہ طنز و مزاح میں معنی آفرینی اور خیال انگیزی دونوں صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے انشائیہ ادب کی اہم صنفِ نثر ہے۔

انشائیہ کا ناپختہ دلیل انشائیہ نگار کے فطری رنگ کو ظاہر کرتا ہے۔ انشائیہ نگار خیالات کا اظہار کرتا ہے وہ بالکل peronal view ہوتے ہیں۔ اس کی دلیل ناپختہ ہوتی ہے۔ پختہ دلیل فلسفہ کہلاتی ہے اور ناپختہ دلیل انشائیہ۔

انشائیہ دو دھاری تلوار کی طرح کام کرتی ہے ایک طرف یہ تروتازگی دیتی ہے۔ ناہموار باتوں کو ہموار اور عمدہ بنادیتی ہے۔ دوسری جانب یہ تخلیقی صلاحیتوں کو کائنات کے مظاہر بناتی ہے۔ یعنی ناہموار اور غیر ہضم باتوں

کی بے ترتیب قلم بندی کو وہ اسلوب کا ایک وصف سمجھتا ہے۔

*****

انشائیہ کا دیگر اصناف سے تقابلی مطالعہ

مضمون اور انشائیہ:

کسی بھی عنوان پر معلومات یکجا کرنا اور اس کے ذیلی موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے دلچسپ اور جامع مواد کو ترتیب و تسلسل اور روانی کے ساتھ پیش کرنا یا کسی موضوع پر اپنے خیالات اور جذبات کا تحریری اظہار مضمون کہلاتا ہے۔ مضمون کے لئے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اردو میں سرسید نے مضمون نویسی کا باقاعدہ آغاز کیا اس دور میں مغربی ادبیات میں مضمون نگاری تین حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ پہلی علمی، سائنسی، اصلاحی۔ دوسری طنزیہ اور مزاحیہ اور تیسری لائٹ ایسّے (Light Essay) ان تمام میں سرسید نے علمی، سائنسی اور تنقیدی نظریات پیش کرنے میں کمال حاصل کیا۔

رسالے ''تہذیب الاخلاق'' میں مضمون نویسی کی ترویج اور ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس رسالے کے ایڈیٹر اور مینجر سرسید تھے مگر محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، اس کے خاص مضمون نگاروں میں تھے۔ ان کے علاوہ مولانا حالی، ذکا اللہ، نظیر احمد، محمد حسین آزاد، وحید الدین سلیم سب مضمون نگاری کے پہلے دور کے معمار ہیں۔ یہ تمام مضامین اصلاح کے مقصد کے لئے لکھے گئے خواہ وہ سیاسی اصلاح ہو یا معاشرتی یا اخلاقی۔

مضمون میں بہت ساری تحریروں کے سما جانے کی گنجائش نکلتی ہے جیسے خطوط، رپورٹ، شخصیت کی قلمی تصویر، شخصیت کا تعارف، واقعاتی بیان، ادبی و ثقافتی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال، شخصیت کے حالات زندگی اور مخصوص عنوان پر خیالات کا اظہار وغیرہ۔ چونکہ یہ ساری تحریریں نثر سے تعلق رکھتی ہیں لیکن یہ مختلف النوع تحریریں اپنی نوعیت کے لحاظ سے اپنا دائرہ الگ رکھتی ہیں۔ ہر عنوان کے ساتھ ہی اس کی تحریر کا لب ولہجہ جداگانہ ہوتا ہے۔ اور ان سب کا مرتبہ و مقام اردو زبان میں اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے۔ عربی لغت میں مضمون کے معنی ''جو نظر آتے ہیں''، یعنی مافی اصلاب الفھم، جس کا مطلب ہے کہ وہ مادہ جو تخلیق کی نیرنگیوں کا مظہر ہے۔

انشائیہ کی تحریر اپنے آپ میں ایک انفرادیت رکھتی ہے اس کی تحریر میں لطافت کے ساتھ گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے۔ جو کہ مضمون میں نظر نہیں آتی۔ انشائیہ میں غیر سنجیدگی، رنگا رنگی، کیف انگیزی، گپ بازی، ذرا سی آوارہ خیالی، شگفتہ بیانی، خوش طبعی، شوقی، سادگی، برجستگی، بے ربطی اور بے ترتیبی بھی ہوسکتی ہے۔ ایسا تخلیقی خیال جو اپنے مرکز سے ہٹ کر ساری کائنات کا چکر لگا کر پھر سے اپنے مرکز میں سمٹ جاتا ہے یہی ''انشائیہ'' ہے۔ انشائیہ

میں خیال اپنے مرکز کے اطراف ہی گھومتا رہتا ہے۔اس سلسلے میں پروفیسر سید محمد حسنین، پروفیسر غلام جیلانی، ڈاکٹر وزیر آغا اور سلیم اختر بھی انشائیہ اور مضمون کو مختلف اصناف سمجھتے ہیں۔اس سلسلے میں یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''جس طرح مونٹین کی ایک خاص وضع کی تحریروں کو دیا گیا۔''ایسے'' کا نام ہر قسم کی کاروباری اور غیر کاروباری تحریر کے لیے استعمال ہونے لگا تھا، بالکل اسی طرح اردو میں انشائیہ کے لفظ کو ہر قسم کے مضامین کے لیے عام طور سے استعمال کیا جانے لگا''۔ (۵۱)

حقیقت یہ ہے کہ انشائیہ مضمون سے ایک بالکل الگ شئے ہے۔اور ساری حقیقت ان دونوں کے فرق کو گرفت میں لینے کے باعث پیدا ہوئی ہے۔مغرب میں ''ایسے'' کے میدان میں فروغ پانے والے کئی مضمون نگاروں کو نثر والوں نے بھی اپنا رہنما (Ideal) بنایا۔جس میں سرفہرست سرسید احمد خاں ہے جنھوں نے اس دور کے مونٹین، لیمب و ہزلٹ کے ایسیز کو چھوڑ کر مضمون نگاری کو اپنایا۔جس میں اصلاحی، علمی اور فلسفی کے رنگ شامل ہیں۔اس سلسلے میں وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''سرسید کے اندر چھپے ہوئے انشائیہ نگار نے سطح پر آنے کی سر توڑ کوشش بھی کی لیکن یہ اردو انشائیہ کی بدقسمتی ہے کہ اس انشائیہ نگار کو سر سید کی اندر چھپے ہوئے ''مصلح'' نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا''۔ (۵۲)

انشائیہ اور مضمون میں فرق کی کئی ایک مثالیں ملتی ہیں۔محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد دہلوی، حالی، مولوی ذکاء اللہ دہلوی، رتن ناتھ سرشار، وحید الدین سلیم، عبدالحلیم شرر اور ان کے بعد نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، ابوالکلام آزاد کو بھی انشائیہ نگار کہا گیا ہے۔بقول وزیر آغا:

> ''ناصر علی دہلوی، سجاد انصاری، خواجہ حسن نظامی اور ابوالکلام آزاد ہی وہ ادیب تھے جن کے ہاں انشائیہ کے مخصوص مزاج اور اسلوب کی طرف پیش قدمی کے شواہد ملتے ہیں یہ وہ لوگ تھے جو انشائیہ نگار بنتے بنتے رہ گئے''۔ (۵۳)

وزیر آغا نے اپنی کتاب انشائیہ کے خدوخال میں انشائیہ اور مضمون نگاری کی روایات کو منفرد دکھانے کے لیے ایک مختصر سا شجرہ مرتب کیا ہے۔اس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انشائیہ اور مضمون دونوں اصناف کس حد تک مختلف ہیں۔

یہ خاکہ ملاحظہ ہو:

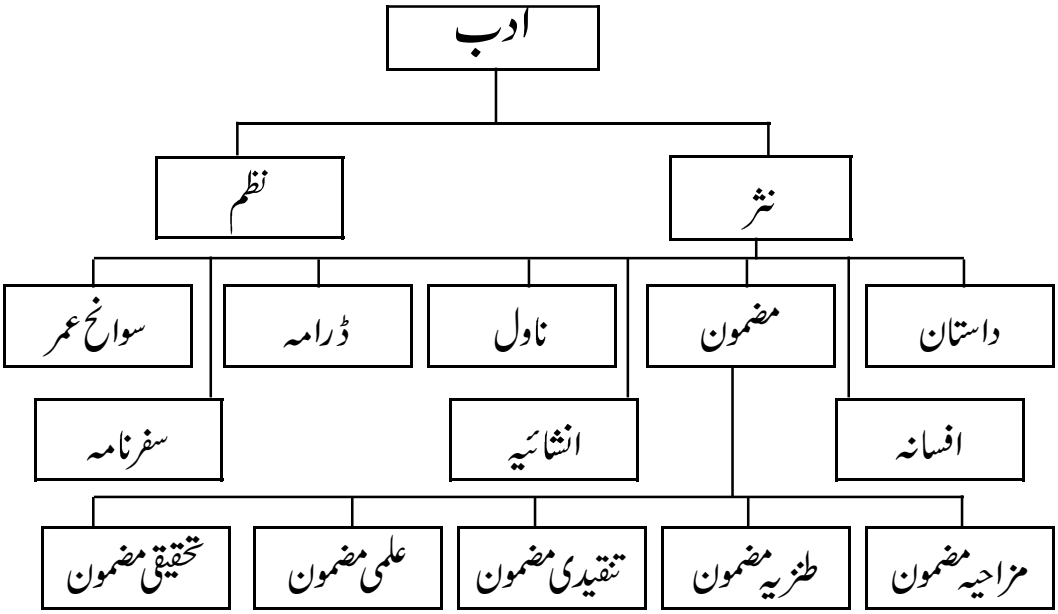

اس شجرہ کے دیکھنے کے بعد انشائیہ مضمون سے مختلف نظر آتا ہے۔ وزیر آغا کے مطابق انشائیہ ''مضمون کی شیلی'' ہے یہی نہیں بلکہ یہ الگ صنف ادب بھی ہے اس خیال سے پروفیسر محمد حسنین، پروفسر غلام جیلانی اصغر بھی متفق ہیں۔ دیگر یہ کہ سلیم اختر، عرش صدیقی، احتشام حسین اور آدم شیخ نے بھی انشائیہ کو مضمون سے مختلف سمجھا ہے۔

مضمون اور انشائیہ کے امتیازات:

اکثر یہ مانا جاتا ہے کہ انشائیہ مضمون کی ہی ایک قسم ہے چونکہ دونوں میں زیادہ قربت پائی جاتی ہے۔ ان دونوں میں مشابہت معلوم ہوتی ہے غور کرنے پر ایسے امتیازات ظاہر ہوتے ہیں جو مضمون اور انشائیہ میں فرق پیدا کرتے ہیں۔ ذیل میں دیکھئے:

مضمون	انشائیہ
مضمون میں ایک ہیئت ہوتی ہے	انشائیہ میں کوئی خاص ہیئت نہیں ہوتی
اختتامیہ ہوتا ہے	انشائیہ کو مختلف حصوں میں درجہ بندی نہیں کی جاسکتی ہے
مضمون میں ابتدائی حصہ، درمیانی حصہ اور مضمون میں موضوع سے متعلق ہر ممکن معلومات فراہم کی جاتی ہیں	انشائیہ میں موضوع سے جڑی دوسری باتوں کو درمیان میں تحریر کرتے ہیں
ذاتی تاثرات نہیں ہوتے	اس میں ذاتی تاثرات ہوتے ہیں۔

مضمون میں مواد کی پیشکشی میں ایک منطقی ربط ہو تا ہے	انشائیہ میں موضوع سے ربط ہوتا ہے منطقی ربط نہیں ہوتا
مضمون میں بنیادی مقصد معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے	انشائیہ میں معلومات سے زیادہ تاثرات کی اہمیت ہوتی ہے
موضوع مضمون میں وضاحت دلائل کے ساتھ ہوتی ہے	انشائیہ میں ناپختہ دلیل ہوتی ہے
مضمون میں سیر حاصل تبصرہ کرنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکمل ہے یا نہیں۔	انشائیہ نامکمل رہ کر مکمل لگتا ہے۔
اس میں اول تا آخر موضوع کے متعلق ایک ہی خیال کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔	انشائیہ کے عموماً ہر پیراگراف میں ایک نیا خیال ملتا ہے اور ہر پیراگراف اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے اور اختتام تک ربط قائم رہتا ہے
مضمون ایک مختصر صنف ادب ہے۔	یہ ہلکی پھلکی صنف داب ہے۔
اس میں موضوع کا احاطہ بڑی گہرائی اور گیرائی سے ہوتا ہے	اس میں زندگی کے متعلق، زندگی کی ناہمواریوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔
مضمون کی زبان سادہ اور سلیس ہوتی ہے اور انداز بیاں میں علمی سنجیدگی ہوتی ہے	اس میں ایک خاص اسلوب ہوتا ہے کسی موضوع پر فکر و فلسفے کے نکات پیش کرتے ہیں۔ اشاروں اشاروں میں معنویت کی تہہ داریاں کھلتی ہیں۔
مضمون میں لچک نہیں ہوتی	انشائیہ میں بے انتہا لچک ہوتی ہے۔

مضمون اور انشائیے کے فرق کو تفصیل سے بیان کرنے کے لئے منشی پریم چند کے مضمون اور رام لال نابھوی کے انشائیے موجود ہیں۔ منشی پریم چند نے ''زمانہ'' ڈسمبر ۱۹۰۹ء کے شمارہ میں ''**گالیاں**'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ جس میں گالیوں کی کئی اقسام اور مواقع پیش کر کے انہوں نے سماج کے اس برے لفظ کی مذمت کی تھی۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''اس سے بڑھ کر ہمارے کمینہ پن اور نامردی کا ثبوت نہیں مل سکتا کہ جن گالیوں کو سن کر ہمارے خون میں جوش آ جانا چاہئے۔ ان گالیوں کو ہم دودھ کی

طرح ہی پی جاتے ہیں۔۔۔یہ بھی قومی زبان کی ایک برکت ہے۔قومی پستی بنا دیتی ہے۔غصہ میں گالی بکیں دل لگی میں گالی بکیں گالیاں بک کر زور لیاقت ہم دکھائیں گیت میں گالی ہم گائیں' زندگی کا کوئی کام اس سے خالی نہیں۔حدتو یہ کہ ابھی تک ہمارے رہنماؤں نے اس وباء کی بیج کی کرنے کے لیے'سرگرم' کوشش نہیں کی۔اس امر کے اعادہ کے ضرورت نہیں کہ گالیوں کا اثر ہمارے اخلاق پر بہت خراب پڑتا ہے۔گالیاں نفس کو مشغول کرتی ہیں۔اور خودداری او رپاس عزت کا احساس دکوں سے کم کرتی ہیں۔جوہمیں دوسری قوتوں کی نگاہوں میں وقیع بنانے کے لیے ضروری ہیں''۔ (۵۴)

اس مضمون کے تقریباً ستر سال بعد اس موضوع پر غلام جیلانی اصغر نے ایک انشائیہ لکھا۔اور رام لال نا بھوی نے بھی انشائیہ تحریر کیا۔رام لال نا بھوی کا انشائیہ'' گالی'' کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

'' گالیاں،دینا آسان کام نہیں۔ہمت طاقت کی ضروت ہوتی ہے۔مدمقابل کوئی مضبوط انسان ہوتا ہے تو انسان گالیا دینے کی بجائے خودکو ہی گالیاں دے کر اپنا غبار نکال لیتا ہے''۔

'' گالیاں دینے کے لیے نہ عمر کی قید ہے نہ وقت کی اور نہ موسم کی آپ جب چاہیں جہاں چاہیں۔جس طرح چاہیے۔گالیوں کی مشق کر سکتے ہیں۔ایک آدھ گالی نکال کر من کی بھڑاس نکال سکتے ہیں۔صبح سے شام تک اور اگلی صبح تک مسلسل گالیاں نکال سکتے ہیں۔بس شرط یہ ہے کہ جگہ شارع عام نہ ہو۔اور آپ کی گالیوں کی آواز پڑوسی کے کان تک نہ پہنچے۔آپ تو گالیاں کسی اور کو دے رہے ہوں گے اور وہ گالیاں آپ کو دے گا۔ظاہر ہے کہ جب آپ اپنے پڑوسی کو گالی نہیں دے رہے تو اس کی گالی بھی آپ کیوں سنیں گے۔اور پھر صورت یہ بھی ہے کہ نہ آپ اسے گالی دینا چاہتے ہیں۔اور نہ وہ آپ کو گالی دینا چاہتے ہیں۔دوسرے معنوں میں گالی دینے کے لئے تہذیب،عقل،شرافت کا دامن تھامے رکھنا پڑتا ہے''۔ (۵۵)

غلام جیلانی کا یہ انشائیہ'' گالی'' کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

'' گالی دینے کا یہ فائدہ ہے کہ آدمی گالی دے کر فارغ ہو جاتا ہے۔اور ذہنی طور پر ایک خوشگوار آسودگی محسوس کرتا ہے۔اعصاب کا کھنچاؤ دور ہو جاتا

ہے۔اور دل کی گہرائیوں میں نشر ورسخت کا عالم ہوتا ہے، پنجاب میں جو آپ کو ہشاش بشاش مونچھیں، اس کی وجہ منہ نہار کی وہ گالی ہے۔جس پر تمام ویداور حکیم نیا پیراز ور دیتے ہیں۔گالی جتنی سقیم اور کمزور ہوگی گالی دینے والے کی شخصیت اتنی ہی گھٹی گھٹی ہوگی۔گالی جتنی پر وقاراور پر اثر ہوگی شخصیت میں اتنا ہی، وقار اور کشادگی ہوگی۔چھوٹا آدمی ڈرتے ڈرتے چھوٹی سی گالی دیتا ہے۔اور پھر فوراً اپنی ذات کے ڈربے میں چھپ جاتا ہے۔باہر کھینچ لاتا ہے۔گالی دینے سے جمہوریت کو فروغ ملتا ہے۔آمریت صرف اس دور میں پنپ سکتی ہے۔جب گالیوں پر قدغن لگادی جائے۔اس لیے ایک اچھے نظام میں یہ خوبی ہوتی ہے۔کہ وہ اپنے اندر ہائیڈ پارک کی گنجائش رکھتا ہے''۔(۵۶)

ہم دیکھیں گے کہ ایک ہی موضوع پر جب کسی سنجیدہ مضمون نگار کے پاس سے انشائیہ نگار کے پاس آتا ہے۔تو اظہار کے ساتھ ساتھ خیال بھی بدل گیا اور نہایت لطیف پیرایے میں ہم قابل مذمت باتوں کو بھی ہنسی ہنسی میں نوٹس کرلیا۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔کہ انشائیہ، مضمون سے ایک الگ صنف ہے۔

انشائیہ اور مضمون میں زیادہ قربت پائی جاتی ہے۔بظاہر ان دونوں میں مشابہت معلوم ہوتی ہے۔اگر ہم غور کریں تو کئی بار ایسے امتیازات ظاہر ہوتے ہیں۔جو مضمون اور انشائیہ میں فرق پیدا کرتے ہیں۔مضمون میں موضوع سے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔جب کہ انشائیہ میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔بلکہ انشائیہ نگار کو یہ آزادی حاصل رہتی ہے کہ موضوع سے جڑی دوسری باتوں کو بھی وہ درمیان میں قلمبند کرتا چلا جاتا ہے۔اور اس میں اپنے ذاتی تاثرات بھی شامل کردیتا ہے۔جس طرح مضمون میں ابتدائی حصہ، درمیانی حصہ اور اختتامہ ہوتا ہے۔اس طرح انشائیہ کو ان مختلف حصوں میں درجہ بندی نہیں کی جاسکتی ہے انشائیہ کی کوئی خاص ہئیت نہیں ہوتی اور اس کی فضاء غیر رسمی ہوتی ہے۔

مضمون میں مواد کی پیشکشی میں ایک منطقی ربط نہیں ہوتا ہے۔برخلاف اس کے انشائیہ میں موضوع سے ربط وتعلق تو ہوتا ہے۔لیکن اس میں کوئی منطقی ربط نہیں ہوتا۔بلکہ کئی ضمنی باتوں کے سہارے انشائیہ نگار اپنا مافی الضمیر ادا کرتا چلا جاتا ہے۔

مضمون میں اپنا سارا زور بات کو عالمانہ انداز سے کہنے پر ہوتا ہے۔اور اس کا بنیادی مقصد معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے۔جبکہ انشائیہ میں معلومات سے زیادہ تاثرات کی اہمیت ہوتی ہے۔یہ تاثرات انشائیہ نگار کی ذہنی ترنگ کے تابع ہوتے ہیں۔اس لئے کہ انشائیہ نگار واقعات سے زیادہ واقعات کے ردعمل پر توجہ دیتا ہے۔اور

اشاروں میں اپنا مدعا بیاں کر دیتا ہے۔جبکہ موضوع مضمون سے متعلق باتیں سنجیدگی سے زیر بحث آتی ہیں۔اوران کی وضاحت دلائل کے ساتھ ہوتی ہے۔اور انداز بیاں بالکل سیدھا سادھا ہوتا ہے۔جبکہ انشائیہ میں سارا زور انداز بیاں پر ہوتا ہے۔اس کا اسلوب شگفتہ اور شاعرانہ ہوتا ہے۔اس خاص اسلوب کی بناء پر انشائیہ کے موضوعات اور طرز اظہار میں نمایاں فرق ہے۔اور یہ جدید نثر کی ایک مقبول صنف ہے۔خیالات کے اظہار اور انکی ترسیل کے لیے یہ مفید ہے۔چاہے یہ سائنسی معلومات ہو، مذہبی ہو یا پھر ادبی ہو ہر قسم کی معلومات اس صنف ادب کا حصہ بن سکتی ہیں۔

موجودہ زمانے میں اس صنف کو غیر معمولی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔چھاپے خانے کی ایجاد نے رسالوں اور اخبارات کی اشاعت کی راہ ہموار کی۔جس کی بناء پر اخبار اور رسالوں کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مضمون نویسی عام ہوئی اور اس مقصد پر سیکڑوں مضامین لکھے جانے لگے۔عصر حاضر میں انٹرنیٹ پر ہر موضوع پر سیکڑوں مضامین پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔اس سے یہی بات ثابت ہوتی ہے۔کہ آج کی جدید ترین معلومات کا ذریعہ یہ مضامین ہی ہیں۔مضمون ایک مختصر صنف ادب ہونے کے باوجود اس میں موضوع کا احاطہ بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔اور موضوع کے متعلق اہم باتیں ایک تسلسل اور تنظیم کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں مضمون کی زبان سادہ اور سلیس ہوتی ہے۔اور انداز بیاں میں علمی سنجیدگی ہوتی ہے۔جیسے علمی مضامین تحقیقی وتنقیدی مضامین سائنٹفک و مذہبی مضامین اور معاشی مضامین وغیرہ۔

انشائیہ ایک الگ صنفِ سخن ہے۔اس میں کسی موضوع پر شخصی تاثرات، مشاہدات اور تجربات کو بیاں کیا جاتا ہے۔اسی لیے اسے ذاتی انکشاف' کا نام بھی دیا جاتا ہے۔انشائیے میں عبادت آرائی کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔انشائیہ نگار اپنے موضوع کو بیان کرتے ہوئے خاص اسلوب اپناتا ہے۔جس سے کے قاری کو تحریر میں لطف ملتا ہے وہ بات سے بات پیدا کر کے خشک موضوع کو بھی دلچسپ بنا دیتا ہے۔مضمون میں ابتداء سے لے کر اختتام تک موضوع کے متعلق ایک ہی خیال کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔انشائیہ کے عموماً پیراگراف میں ایک نیا خیال ملتا ہے۔یعنی انشائیہ نگار موضوع سے تعلق رکھنے والی دوسری ضمنی باتوں پر اپنے ذاتی تاثرات اور خیالات پیش کرتا ہے۔باوجود اس منتشر خیالی کے انشائیہ میں ایک ربط ضرور معلوم ہوتا ہے۔لیکن دونوں میں موضوع ،زبان ،ترتیب، ربط اور انداز بیان میں فرق ہے۔بنیادی طور پر انشائیہ نگار کا مقصد سوچ بچار کے لئے راستے ہموار کرنا ہوتا ہے۔تمام ریزہ خیالی کے باوجود انشائیہ میں ابتداء سے لے کر اختتام تک ربط قائم رہتا ہے۔

ان تمام تقابلی تحریروں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون ایک الگ صنف ہے اور انشائیہ الگ صنف سخن ہے۔

مقالہ اور انشائیہ:

مقالہ اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں نثر کی بنیاد کسی ایک فکر و خیال یا ایک موضوع پر بحث ہو یا کسی کتاب کا باب یا حصہ ہو۔ مقالہ کے معنی فیرز اللغات میں کچھ اس طرح ہے:

''مقالہ = قول، مقولہ، آرٹکل، تحریر، اقلدیس کا ہر حصہ جس میں اقلدیس کے دعوے ان کے ثبوت اور شکلیں درج ہوں۔ (جمع مقالات)''۔ (۵۷)

مقالہ کے لغوی معنی ہے بات، گفتگو یعنی جو کچھ کہا جائے اصطلاح میں کسی خاص موضوع پر علمی و تحقیقی انداز میں تحریری اظہارِ خیال کو مقالہ کہتے ہیں۔ مقالہ کسی بھی موضوع پر تحریر کیا جا سکتا ہے مثلاً سیاسی مقالہ، سماجی مقالہ، علمی مقالہ، ادبی مقالہ، ناقدانہ مقالہ، سائنسی مقالہ وغیرہ۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر مقالے کی تعریف یوں بیان کرتی ہیں کہ:

''مقالہ عام طور پر اس طویل اور بسیط مضمون کو کہتے ہیں جس میں کسی موضوع پر عالمانہ انداز میں مفصل روشنی ڈالی جائے۔ مقالہ اپنی استدلالی صلاحیت اور گہرائی کی وجہ سے ہلکے پھلکے مضامین سے خاصا مختلف ہوتا ہے''۔ (۵۸)

ہندوستان میں اردو زبان میں مقالہ نگاری کا آغاز ۱۸۴۵ء کے آس پاس ہوا تھا۔ مگر اس کی مقبولیت کا عہد ۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہوا۔ دلی کالج کے نصاب میں مختلف مضامین شامل تھے۔ امتحان کے پرچوں میں ایک پرچہ مقالہ نگاری سے متعلق بھی ہوا کرتا تھا اس دور کی مقالہ نگاری کا اندازہ مقالوں کے عنوانات سے ہو جاتا ہے چند ایک عنوان ملاحظہ فرمائیے۔

''بالائی (شمالی) ہندوستان پر ریلوں کے جاری ہونے سے کیا اخلاقی اثر پڑے گا؟''

امتحان کے پرچوں میں مضمون نویسی کے علاوہ سالانہ مضمون نویسی کا مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا۔ ۵۰۔۱۸۴۹ء کے مقابلہ کے لیے یہ موضوع تجویز کیا گیا تھا۔

''اسلامی اور انگریزی حکومتوں کے تحت آزادی رعایا کے بارے میں کیا فرق تھا؟''

ایک اور موضوع دیکھئے:

''مختلف آزاد پیشے اور مفید کاروبار جو ہندوستانی دیسی ریاستوں میں پائے

جاتے ہیں اور ہر ایک کی کامیابی کے بہترین طریقے خواہ ابتدائی تربیت کے
لحاظ یا مابعد کی مساعی کے؟''

۱۸۵۴ء کے سالانہ مقابلے کا عنوان دیکھئے:

''شاہی اور مخلوط قسم کی حکومت میں کون سی بہتر ہے اور اس کی فضیلت کی وجہ
کیا ہے؟''

ان اردو اور انگریزی انعامی مقابلوں میں طلائی تمغے دیئے جاتے تھے۔ مفتی صدالدین آزُردہ نے بھی اردو میں بہترین مقالے کے لیے ایک طلائی تمغہ عطا کیا تھا۔ ان مقابلوں میں انعام پانے والے طلباء میں ماسٹر رام چندر، موتی لال، نذیر احمد، مولوی احمد ذکاءاللہ، بھگوان داس، خواجہ ضیاءالدین خصوصیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے بیشتر علم حاصل کرنے کے بعد اسی کالج میں معلّمی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

اس دور کے بزرگوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ مقالہ نگاری ترقی پائی۔ ماسٹر رام چندر نے فوائدالناظرین اور ''محبّ ہند'' رسالے جاری کئے۔ جس میں علمی و ادبی مقالہ بھی شائع ہوتے تھے آخر کار یہ رسائل ۵۵۔۱۸۵۴ء میں بند ہو گئے اس کے علاوہ اس دور کی ادبی انجمنوں میں بھی مقالہ نگاری کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۸۵۶ء میں انجمن دہلی سوسائٹی نے بھی خدمت انجام دی۔ اس وقت انجمن میں تقریروں کے علاوہ اصلاحی مقالے بھی پڑھے جاتے تھے۔ اس دور کے اہم مقالہ نگاروں میں ماسٹر پیارے لال کے مقالے پنجاب کے رسالے ''اتالیق'' میں شائع ہوتے تھے۔

مولانا شبلی اس دور کے اہم مقالہ نگار تھے ان کے مقالے آٹھ جلدوں پر مشتمل ہیں۔ زندگی اور علم و ادب کے اہم شعبہ پر مقالے لکھے ہیں۔ شبلی نے اپنے شگفتہ اسلوب بیان اور متنوع موضوعات سے مقالہ نگاری کو اس دور میں زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ زبان کی لطافت و رنگینی اور نزاکت خیال نے اردو نثر کا معیار بلند کر دیا۔ شبلی نے تقریباً ایک سو مقالے یادگار چھوڑے ہیں۔ مگر ان میں ایک بھی ''ایسّے'' نہیں پایا جاتا ہے۔

اس دور کے مقالہ نگاروں میں مہدی حسن خصوصیت رکھتے ہیں۔ مہدی حسن نے فارمل ایسیز (Formal) مقالے لکھے ہیں۔ لیکن ان ادبی مقالوں کو اپنی شوخی بیان سے ''ایسّے'' کا Mood دے دیا ہے یہ شگفتہ ہیں۔ میر ناصر علی اس دور کے آخری چراغ ہیں۔ ان کے مقالے، عرس و سال گرہ، خیال بہ مقالہ، زبان زندگی بھی ایک معرکہ ہے، نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا، چراغ شعبدہ باز، ہر حیثیت سے ایسیز کہلانے کے مستحق ہیں۔ حالی اور سرسید نے بھی کثرت سے مقالے تحریر کیے ہیں۔

اردو ادب میں شاعری کے بعد مقالہ نگاری کو فروغ ہوا۔ ادب کے میدان میں سینکڑوں مقالہ نگار

سامنے آئے اس دور کے مقالہ نگاروں کو دو گرہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ان میں سے چند اہم یہ ہیں پہلے گروہ میں شرر، سجاد انصاری ،حسن نظامی، پنڈت برج موہن،کیفی،قاضی عبدالغفار،قاضی اختر جونا گڑھی،سید سلیمان ندوی،سجاد حیدر یلدرم،سلطان حیدرجوش ،اسلم جیراج پوری،وحیدالدین سلیم،سر عبدالقادر،حبیب الرحمٰن شیرانی،حافظ محمود شیرانی،چکبست ،مرزا فرحت اللہ بیگ،عظمت اللہ،مرزاعظیم بیگ،ملا رموزی،دیا نارائن نگم ،احسن مارہروی،ڈاکٹر عبدالحق،ابوالکلام آزاد،عبدالمجید سالک وغیرہ شامل ہیں۔دوسرے گروہ سے ہاشمی فریدآبادی ،عبدالماجد دریا آبادی،نیاز فتح پوری ،عبدالمالک آروی،عبدالسلام ندوی،رشید احمد صدیقی وغیرہ تعلق رکھتے ہیں۔اس گروہ کے بزرگوں کی بدولت ادب کے میدان میں آنے والوں کے لئے راہ ہموار ہوئی۔اس دور میں تقریباّ ہر شعبہ ادب و زندگی سے متعلق مقالے لکھے گئے ہیں۔جن میں تحقیقی،علمی ادبی اور تنقیدی مقالوں کی کثرت ہے۔ڈاکٹرعبدالحق،محمود شیرانی،وحیدالدین سلیم،سید سلیمان ندوی،پنڈت کیفی نے ادبی مقالوں کے علاوہ تحقیقی اور لسانی مقالے لکھ کر مقالہ نگاری میں وسعت پیدا کردی۔مسعود حسین رضوی،عبدالماجد،حبیب الراحمٰن شیرانی،چکبست ،عبدالمجید سالک،عبدالملک آروی،سرعبدالقادر،عبدالسلام ندوی وغیرہ۔اپنے تنقیدی مقالوں کے لیے خصوصیت رکھتے ہیں۔چکبست نے اپنے سوانحی مقالوں سے بھی بڑااضافہ کیا ہے۔ان میں سے چند نے (ادب) تاریخی مقالے بھی لکھے ہیں۔مولانا ابولکلام آزاد کے سیاسی اور مذہبی مقالے اردو میں مایہ ناز سرمایہ ہیں۔نیاز فتح پوری کے سیاسی،مذہبی،تاریخی،ادبی وتنقیدی مقالے نا قابل فراموش اضافہ ہیں۔مرزافرحت اللہ بیگ،ملارموزی،پطرس،رشید احمد صدیقی وغیرہ نے مزاحیہ مقالوں کی شاخ کو صرف تروتازہ ہی نہیں رکھا بلکہ پہلے کے بہ نسبت اس کا معیار بھی بلند کردیا۔پطرس اور رشید احمد صدیقی ان میں بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں۔

مقالہ دراصل مضمون ہی کی ایک خاص شکل ہے جس کو Thesis یا Formal Eassay بھی کہا جاتا ہے۔مقالہ کا موضوع شعروادب،تحقیق وتنقید،ثقافت وتمدن،علم وسائنس،تاریخ وسیاست،مذہب وسماج کچھ بھی ہوسکتا ہے۔آیئے انشائیہ اور مقالہ میں فرق کو دیکھئے۔

مقالہ	انشائیہ
مقالہ میں سنجیدگی۔علمیت اور دیانت ہوتی ہے۔	انشائیہ کی تحریر میں تازگی اور غیر سنجیدگی ہوتی ہے
مقالہ طویل اور بسیط مضمون کو کہتے ہیں	انشائیہ مختصر اور جامعیت ہوتا ہے۔

مقالہ کا اسلوب ٹھوس اور بھاری بھرکم انداز بیان ہوتا ہے۔	انشائیہ کا اسلوب بہت سلیس، شگفتہ، نرم و نازک ہوتا ہے۔
مقالہ کا مقصد افادی ہوتا ہے۔	انشائیہ کا مقصد انبساطی ہوتا ہے۔
مقالہ کی تکمیل کے لیے کافی چھان بین اور تحقیق و تدقیق کی ضرورت ہوتی ہے۔	انشائیہ کے لیے تحقیق و تدفین کی ضرورت نہیں ہوتی۔
مقالہ میں چند نکات ہوتے ہیں	انشائیہ نکات کا پابند نہیں ہوتا
مقالہ ''what'' پر زور دیتا ہے	انشائیہ ''How'' کو اہم بتاتا ہے۔
مقالہ میں مقصد کی تبلیغ، خیالات کا تسلسل، منطقی استدلال اور موضوع کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ہوتی ہے۔	انشائیہ میں ابتداء سے لے کر اختتام تک ربط قائم رہتا ہے۔ انشائیہ نگار کے ذہن میں مو ضوع سے متعلق ضمنی خیالات آتے ہیں وہ تحریر کرتا ہے۔ بات سے بات پیدا کرتا ہے۔
مقالہ کی تحریر ایک سمت لے جاتی ہے جس سے تحریر کا ہر گوشہ منور ہوتا ہے۔ قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔	انشائیہ کی تحریر کئی نئی سمتوں کا اشارہ کرتی ہے۔ ہر بات اور ہر خیال سے علمیت میں اضافہ ہوتا ہے۔
مقالہ نگار پر بات سنجیدہ طریقے سے سیر حاصل بحث کرتا ہے ۔عالمانہ انداز میں مفصل روشنی ڈالتا ہے۔	انشائیہ نگار ہر بات غیر سنجیدہ طریقے سے قاری کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ جتنا زیادہ جانتا ہے اس سے کہیں زیادہ بتاتا ہے۔
مقالہ نگار علم و دانش، حکمت و فلسفہ سے بات واضح کرتا ہے۔	انشائیہ نگار ہلکے پھلکے انداز میں فکر و فلسفے کے نکات بیان کرتا ہے اور اشاروں اشاروں کے ذریعہ معنی تک پہنچتا ہے۔
مقالہ میں سنجیدگی سے تھکان، اعصابی تناؤ اور ذہنی انجماد کا احساس ہوتا ہے۔	انشائیہ کی تحریر میں لطافت، تازگی، گپ شپ، خوش گفتاری موجود رہتی ہے۔
مقالہ معلومات میں اضافہ دیتا ہے۔	انشائیہ میں تاثرات کا اثر ہوتا ہے۔
مقالہ نگاری کی شخصیت سامنے نہیں آتی۔	انشائیہ نگار کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔

مقالہ میں پختہ دلیل پیش کی جاتی ہے۔	انشائیہ میں ناپختہ دلیل پیش کی جاتی ہے۔
مقالہ میں فلسفیانہ انداز ہوتا ہے۔	انشائیہ میں خیالات،گلشت ہوتی ہے۔

مقالہ اور انشائیہ میں فرق کو واضح کرنے کے لئے ذیل میں مقالہ اور انشائیہ کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''سابقہ اوراق میں بلراج کومل کا یہ اقتباس پیش ہو چکا ہے کہ کومل ذہنی طور پر آزاد نظم کے زیادہ قریب ہے۔اور انھوں نے مختلف بحور کو ضروری تاثرات کی رہنمائی میں حتی المقدور استعمال کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے اپنی شاعری کو خطِ مستقیم پر چلانے کی کوشش نہیں کی، نہ ہیئتی اعتبار سے اور نہ معنی کے لحاظ سے انھوں نے مصرعوں کو چھوٹا بڑا کیا اور نظم کے لئے مناسب بحور کا انتخاب کیا تو اس میں تاثر کو اور نظم کی داخلی معنویت کو ہی اپنا رہنما بنایا، اور یہ تمام عمل میکنکی نہیں بلکہ تخلیقی ہے اور اکثر اوقات ایسی موسیقی کو بھی جنم دیتا ہے جو کبھی بحور سے پیدا ہوتی ہے، کبھی لفظوں کی ترتیب سے اور کبھی صوتی اثرات سے کبھی یہ موسقی نظم کے اثرات سے ابل پڑتی ہے، اور پڑھنے والوں کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے یا پوری نظم کو ایک تحیر انگیز تجربہ بنادیتی ہے''۔ (۵۹)

انشائیہ کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''آخری بار یہ کہ جب ایک صدی اپنی سانسیں پوری کر لیتی ہے اور اس کی گرہ کمزور ہو کر کھولنے لگتی ہے تو اسمیں بندھا ہوا کل اثاثہ لڑھک کر اگلی صدی کی گرہ میں جا گرتا ہے۔یہی نہیں ایک صدی کو مختلف ادوار کی گرہوں میں بھی بانٹا جا سکتا ہے جنھیں ہم ''تاریخ'' سے بھی موسوم کر سکتے ہے۔گویا ''تاریخ'' گرہ کے کھولنے اور بندھ ہونے کی ایک مسلسل داستان ہے۔اس سے قطع نظر کائینات نے ''تغیر'' کو نہیں بلکہ گرہ کو ثبات ہے، کیونکہ لوگ ،نظام اور عہد تو آتے جاتے رہتے ہیں جبکہ گرہ ہر زمانے میں موجود رہتی ہے۔ایک ایسی گرہ جسے ''سم سم'' جیسا کوئی خوفیہ کوڈ ورڈ ہی وقت سے پہلے کھول سکتا ہے''۔ (۶۰)

مقالہ نثر پر مشتمل اس تحریر کو کہتے ہیں جس کی بنیاد کسی ایک فکر و خیال یا ایک موضوع پر ہو یا پھر اس میں کوئی خاص نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہو۔مقالہ میں ہر بات اور ہر پیراگراف کسی مرکزی خیال کے منطقی وضاحت کرتا ہے کہ مقالہ آزادانہ اظہارِ رائے کا ایسا اسلوب ہے جو زندگی کے حالات ، واقعات اور معاشرے کی منظر کشی کرتا ہے

اس کے ذریعہ ہر جدید چیز کی خصوصیات وصفات اور اوصاف کا کم وقت کم محنت کے ذریعہ پتہ چلتا ہے چاہے اس کا تعلق سیاست سے ہو یا ادب سے، سماج سے ہو یا نقد سے ہو یا علم سے۔

مقالہ میں واضح زبان واسلوب، گہری وفکری دلائل وشواہد اور مثالوں کے ذریعہ بات کو سمجھانے کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے مقالہ کے خصائص وامتیازات کا پتہ چلتا ہے۔ جیسے مقالہ، سیاسی، سماجی اور ادبی اقسام پر مشتمل ہو۔ ادبی مقالہ میں ادبی اسلوب اختیار کیا جاتا ہے جبکہ علمی مقالہ میں علمی اور تحقیقی اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ ذاتی مقالہ میں مقالہ نگاری کی شخصیت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ کسی بھی مقالہ کا اصل خلاصہ ونتائج ہوا کرتے ہیں جو علمی ومنطقی تجزیہ کے بعد دلائل کی روشنی میں سامنے آتے ہیں وہی مقالہ کی اصل فکر کا خلاصہ اور نتیجہ ''بحث'' ہوا کرتے ہیں۔

مقالہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں سنجیدگی، علمیت، متانت اور دیانت ہوتی ہے۔ مقالہ نگار کسی موضوع پر سنجیدگی سے روشنی ڈالتا ہے۔ روشنی براق ہوتا ہے۔ ایسی براق کہ نفس تحریر کا ہر گوشہ منور ہو جاتا ہے۔ ہم اس تحریر کو پڑھتے ہیں۔ اور موضوع تحریر معنی نفس مقالہ سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔

انشائیہ نگار بھی کسی امر پر روشنی ڈالتا ہے، لیکن یہ روشنی یک رنگ نہیں ہوتی۔ یہ صاف شفاف بھی نہیں ہوتی، یہ صبح کا اجالا ہوتی ہے۔ ملگجی، کچھ صاف اور کچھ میلی۔ یہ روشنی ہماری توجہ کو ایک ہی سمت نہیں لے جاتی۔ بلکہ اسے اٹھکیلیاں کراتی ہے۔

ان تمام تقابلی تحریروں سے اس بات کا اندازہ بہ خوبی ہوتا ہے کہ یہ صنف مقالہ نگاری سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔

طنز ومزاح اور انشائیہ:

ایک عام قاری کے ذہن میں یہ بات پختہ ہو چکی ہے کہ ہنسی، تبسم اور شگفتگی ایک ہی کیفیت کے مختلف نام ہیں۔ لہذا جب اسے یہ بتایا جاتا ہے کہ انشائیہ سے شگفتگی اور مزاحیہ طنزیہ سے ہنسی یا تبسم پیدا ہوتا ہے تو وہ عام طور پر ان سب کو ایک ہی صنف ادب تصور کرتے ہیں۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے انشائیہ اور طنز ومزاح کو ایک ہی سمجھا جا رہا تھا۔ جبکہ طنز ومزاح کوئی صنف نہیں ہے۔ ادبی نگارشات میں مزاح، ہجو، طنز، درد والم، رومان، رجز، جوش ولولہ کی مائیت توصفی ہوتی ہے، یہ صنفی نہیں ہوتی ہے۔

طنز واسلوب اظہار جس میں ہنستے ہنستے سماج یا افراد کی برائیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ طنز نگار کی حیثیت ایک ایسے طبیب کی سی ہوتی ہے جو اپنے مریض کو کڑوی گولیاں شہد میں ڈبو کر کھلاتا ہے۔ غرض طنز ایک تیر

ہے اس کا وار اتنا گہرا ہوتا ہے کہ یہ غیر شعوری طور پر اس کی چبھن خود بخود محسوس ہونے لگتی ہے۔طنز کے وار کی شدت میں کمی کرنے کے لئے ظرافت کا سہارا ضروری ہے۔جس میں خوش طبعی ذوق کا بڑا دخل ہوتا ہے۔طنز میں وہ دہن و دل میں خلش پیدا کرتی ہے اور جبکہ ظرافت نگار اس خلش کو اپنے قہقہوں میں گم کر دیتا ہے۔

طنز اور مزاح کو عام طور پر مترادفات کی حیثیت سے لیا جاتا ہے۔حالانکہ ان میں لطیف سا فرق ہے۔مزاح کے ضمن میں اسٹیفن لیکا یک (LEACOCK) کی یہ تعریف تو بڑی معروف ہے۔

''مزاح کیا ہے؟ یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے۔جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے''۔(۶۱)

ڈاکٹر سید محمد حسنین اپنے مضمون ادب کی ایک خاص صنف انشائیہ میں تحریر کرتے ہیں:

''انشائیہ نگاری کے لئے ظرافت نگاری لازمی ہے ظرافت اس کا ایک شوق اور چمکیلا رنگ ہے۔اس کی زعفران زار سرزمین میں ہنسنے اور ہنسانے کے خوب موقع ملتے ہیں''۔(۶۲)

طنز کیا ہے؟ اس بابت ڈاکٹر وزیر آغا رقمطراز ہیں:

''طنز۔بنیادی طور پر ایک ایسے باشعور، حساس اور دردمند انسان کے ذہنی ردعمل کا نتیجہ ہے اس کے ماحول کو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں نہ تختۂ مشق بنالیا ہو''۔(۶۳)

طنز و مزاح کے فرق کو واضح کرنے کے لیے رونالڈ ناکس (Ronald Knox) نے مزاح نگار کو گوشت کے ساتھ بھاگنے والا، اور طنز نگار کو کتوں کے ساتھ شکار کھیلنے والا قرار دیا ہے۔مگر یہاں بھی وزیر آغا کی بیان کردہ تعریف، بات کی تفہیم میں آسانی پیدا کرتی ہے:

''طنز زندگی اور ماحول سے برہمی کا نتیجہ ہے۔اور اس میں غالب عنصر نشتریت کا ہوتا ہے۔طنز نگار جس چیز پر ہنستا ہے۔اس سے نفرت کرتا اور اسے تبدیل کر دینے کا خواہاں ہوتا ہے۔اس کے برعکس مزاح اور ماحول سے انس اور مفاہمت کی پیداوار ہے۔مزاح نگار جس چیز پر ہنستا ہے۔اس سے محبت کرتا ہے۔اور اسے ''اپنے ہنسنے سے چمٹا لینا چاہتا ہے''۔(۶۴)

ڈاکٹر سلیم اختر رقمطراز ہیں:

''طنز عموماً نفرت، حقارت یا استکراہ کی بنا پر جنم لیتا ہے۔طنز نگار کی ہنسی کا

سرچشمہ تلخی سے پھوٹتا ہے۔ وہ تلخی جو ناپسندیدہ میں تبدیل نہ کر سکنے کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ مزاح نگاری کا رویہ دوسروں کو ہنسی میں شریک کرنے کا ہوتا ہے۔ جبکہ طنز نگار کیونکہ دوسروں پر ہنستا ہے۔ اس لیے دوسروں کو اپنی ہنسی میں شریک کرنے کی خواہش نہیں ہوتی''۔ (۶۵)

طنز و مزح کی ان تعریفوں کی بناء پر اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ انشائیہ میں طنز و مزاح کی موجودگی کیسے اور کہاں تک مناسب ہے آیا طنز و مزاح انشائیہ کا جزو لاینفک ہے یا محض خشک مضمون میں دلچسپی اور جاذبیت پیدا کرنے کا ایک ذریعہ اس بات پر تو کم و بیش سارے ناقد متفق ہیں کہ انشائیہ میں مزاح ہونا چاہئیے۔ مگر کتنا ہونا چاہئے۔ اس بارے میں ادیبوں اور نقادوں کی مختلف رائے ہے کہ انشائیہ اردو ادب کی ایک باقاعدہ منفرد صنف ہے۔ اور بے پناہ مخالفتوں کے باوجود اپنا لوہا آپ منوا چکی ہے۔ اس کی مقبولیت دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مستقبل بڑا روشن اور تابناک ہے۔ ڈاکٹر انور سدید ''انشائیہ اردو ادب'' میں رقمطراز ہیں:

''رواں صدی کے آٹھویں عشرے تک اس صنف نے اپنا سفر بڑی کامیابی سے جاری رکھا تاہم، آٹھویں عشرے کے نصف آخر میں انشائیہ کو بہت مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک طرف انشائیہ کو طنز و مزاح سے مغلوب کرنے کی سعی کی گئی تو دوسری طرف بعض مزاح نگاروں نے اپنی خندہ آفریں تحریروں پر انشائیہ کا نام چسپاں کر کے یہ باور کرایا کہ انشائیہ ایک برتر صنف ادب ہے۔ اور طنز و مزاح پر مبنی تحریریں نسبتاً کم درجہ رکھتی ہیں۔ یہ احساس مبنی پر حقیقت نہیں تھا۔ لیکن اس کی افزائش خاصے بڑے پیمانے پر ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اس دور میں انشائیہ نگاری کو ایک مقبول عام فیشن کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ انشائیہ لکھنے والوں کی ایک نئی کہکشاں مرتب ہو چکی تھی۔ اور اب اس صنف کا اجالا افقی اور عمودی اکتاف میں پھیل رہا تھا۔

''اخبارات و رسائل میں اثبات و اختلافات کے زاویہ ابھر آتے تھے۔ اور عوام و خواص اس میں گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ چنانچہ غزل کی طرح اس صنف کو بھی قبول عام حاصل ہوگیا تو متذکرہ مزاح نگاروں نے انشائیہ کے مزاح کو قبول کرنے اور اس کے فنی تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے ہمہ اقسام تحریروں پر انشائیہ لکھ کر اس صنف ادب میں اپنا مقام بنانے کی سعی کی''۔ (۶۶)

بشیر احمد قادری لکھتے ہیں:

''انشائیہ طنز و مزاح اور ظرافت نگاری سے یکسر الگ صنف ہے۔طنز و مزاح اور ظرافت انشائیہ کا حصہ بن سکتے ہیں۔مگر انشائیہ کو طنز و مزاح کا نمونہ کہنا کسی بھی اعتبار جائز نہیں''۔(٦٧)

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''انشائیہ کو طنزیہ اور مزاحیہ مضمون سے خلط ملط کرنے کی روش تا حال خاصی توانا ہے اور دراصل یہی وہ مقام ہے جہاں انشائیہ کے دامن کو کشادہ کر کے سخت غیر انشائی مضامین پیش کرنے کوشش ہو رہی ہے۔طنزیہ مزاحیہ مضامین انشائیہ نگاری کے مختلف اسالیب نہیں بلکہ قطعاً الگ قسم کی تحریریں ہیں۔اور یہ فرق محض لہجے اور انداز کا فرق نہیں مزاح کا فرق بھی ہیں''۔(٦٨)

ڈاکٹر وزیر آغا ، پروفیسر محمد حسنین ، انور سدید، ڈاکٹر سلام سندیلوی، مرزا ادیب ، نذیر صدیقی ،اختر اورینوی اور احمد حسین آزاد نے اپنے اپنے اندازِ تحریر میں اس بات کو واضح کیا ہے کہ''انشائیہ طنز و مزاح اور ظرافت سے بالکل مختلف صنف ہے۔انشائیہ کو طنز و مزاح کا نمونہ کہنا کسی بھی اعتبار سے درست نہیں ہے۔انشائیہ میں طنز و مزاح کا ہونا لازمی نہیں ہے طنز و مزاح ایک وصف ہے جو مواد اور مضمون کے تحت انشائیہ میں شامل رہتی ہے۔ ضروری نہیں کہ صرف طنز ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اس میں صرف مزاح ہو یا پھر طنز و مزاح دونوں شامل ہو۔

طنز و مزاح ایک وصف ہے جو انشائیہ میں ضرورت کے لحاظ سے شامل ہوتی ہے مثلاً آٹے میں نمک کی طرح اور دودھ میں شکر کی طرح ہوتا ہے،اس میں شامل تو ہوتی ہے مگر دکھائی نہیں دیتی۔انشائیہ میں طنز ہو یا مزاح اس طرح لازمی ہوتا ہے جس میں موقع کی مناسبت سے شامل تو ہو مگر غالب نہ ہو۔

ذیل میں اس فرق کو واضح کیا گیا ہے۔

طنز،مزاح اور ظرافت	انشائیہ
طنز،مزاح اور ظرافت کی نوعیت توصیفی ہے۔	انشائیہ صنفی ہے۔
مزاح ،طنز اور ظرافت ادب کی کوئی مخصوص صنف نہیں۔	انشائیہ ادب کی ایک خاص صنف ہے اور تحریر کی ایک مخصوص صورت ہے۔
مزاحیہ مضمون میں ''فاضل جذبہ'' خارج ہو جاتا ہے۔	انشائیہ میں جذبہ صرف ہوتا ہے۔

طنز ومزاح سے ہنسی یا تبسم پیدا ہوتا ہے۔	انشائیہ سے شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔
طنز معاشرے سے غلاظت کو دور کرنے کا اہتمام کرتی ہے مزاح گندگی کو گرد وغبار کم کر کے اس کو پھیلنے سے روکتا ہے۔	انشائیہ فرد کو تخلیقی سطح پر لا کر اسے ارتقا کی دوڑ میں آگے جانے کی ترغیب دیتا ہے۔
طنز ومزاح کی حیثیت سماجی واخلاقی ہوتی ہے۔	انشائیہ کی اہمیت اس بات میں ہے کہ وہ پورے معاشرے کو تخلیقی سطح پر فعال بناتا ہے۔
اردو میں ظرافت کے نثری اسالیب آٹھ ہیں۔	انشائیہ میں مزاح کی دو قسمیں استعمال کی جاتی ہیں۔ (ظرافت اور ہجو)۔
ظرافت کے لئے بالغ ذہن اور نفاست وشائستگی شرط ہے۔	مزاح انشائیہ کا جوہر اعظم ہے۔
قہقہوں کی چھوار ہوتی ہے۔	اس میں زیر لب تبسم ہوتا ہے۔
ظرافت مصنوعی یا ملمع ہوتے ہیں۔	ظرافت اور ہجو کے رنگ اصلی اور پکے ہوتے ہیں۔

سلیم آغا قزلباش کے انشائیہ ''گرہ'' کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''شادی بیاہ کے شعبہ خاص بھی ایک مقدس گرہ کی ایک شکل ہے۔ گو اس ضمن میں ضرورتِ رشتہ کے اشتہارات اس غور وخوص سے پڑھے جاتے ہیں جیسے ان میں کسی ایسے اشتہاری مجرم کے کوائف درج ہو کے جس کی گرفتاری میں تعاون کرنے والے کو سرکار نے ایک خطیر رقم دینے کا وعدہ بھی کر رکھا ہو ۔دوسری طرف بعض لوگ منگنی کی انگوٹھی کو ایک ایسی گرہ کا نام دیتے ہیں اس کے اندر مستقبل قریب یا بعید میں رونما ہونے والے سہانے خواب نگینے کی طرح جڑے ہوتے ہیں۔ حالانکہ کے بعض اوقات یہ سندر سپنے، خوابِ محض شگبت ہوتے ہیں۔ سو جب خواہشوں کا قتیل مرد اپنے لئے کسی مالدار گھرانے کی ''نور چشمی'' سے رشتہ جوڑتا کر، جراثیم سے پاک بند پیکٹ کے دودھ سے پلے ہوئے مختلف عمروں کے نصف درجن گول مٹول نونہالوں کا والد گرامی کہلانے اور موٹی تنخواہ کی ملازمت حاصل کرنے کا حسین جال بن لیتا ہے تو پھر ایک دن اپنے ہی تیار کردہ اس آکٹوپس کے نرغے میں آجاتا ہے اور کچھ مدت گزرنے کے

بعد اسے بیگم صاحبہ کے ''تریا ہٹ'' بچوں کی ''بالک ہٹ'' اور بڑے صاحب کی ''راج ہٹ'' کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ان حالات میں وہ اپنی ہٹ کا پکا ثابت نہ ہوتو اس کے سارے حسین ارمان، گانٹھوں کا ایک ایسا انبار بن جاتے کہ جسے سلجھانے کی کوشش میں وہ اور بری طرح سے الجھتا چلا جاتا ہے حتی کے کسی روز وہ ایک عدد پھولی ہوئی توند، اڑے ہوئے بالوں اور دائمی قبض میں مبتلا ایک بدوضع گرہ بن کر رہ جاتا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ خواہشوں اور آرزؤں کی گرہیں کم سے کم ہوتا کہ زندگی کے تاگے میں الجھاؤ کم سے کم پیدا ہو''۔ (۶۹)

طنز ومزہ کا اقتباس ملاحظہ فرمائے:

''بیوی نے بات کو کاٹ کر کہا ''تمہیں یاد ہوگا ایک مالک مکان کو یہ شکایت تھی کہ لکڑی کے چولھے پر پکوان کرنے کی وجہ سے اس کا رسوئی گھر خراب ہو رہا تھا۔آخر کو اسی نے تنگ آ کر اور ہم پر ترس کھا کر گیس کے چولھے کا کنکشن دلوایا تھا۔اگر ہمارا ذاتی مکان ہوتا تو ہمارے پاس گیس کا کنکشن کہاں سے آتا؟

میں نے کہا ''بیگم تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔صبر کرو۔مجھے یقین ہے ہمیں اپنا ذاتی مکان ملنے کی اطلاع جھوٹی ہے۔ہاؤسنگ سوسائٹی پر پورا بھروسہ رکھو۔کیونکہ یہاں نہ صرف دیر ہوتی بلکہ اندھیر بھی ہوتی ہے''۔ (۷۰)

مندرجہ بالا اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ طنز ومزاح وصف ہے صنف نہیں۔

انشائیہ ایک ایسی تحریر کا نام ہے جو دل کے اندر موم بتی کی طرح سلگتی اور تادیر سلگتی رہتی ہے۔جبکہ طنز و مزاح سے پیدا ہونے والا قہقہہ فاضل اسٹیم کے اخراج کا اہتمام کرتا ہے اور قہقہہ لگانے کے بعد انسان کی حالت اس کارتوس کی سی ہوجاتی ہے جس میں سے چھرے نکل چکے ہوں۔انشائیہ کا مقصد تحریک دینا نہیں بلکہ اس کا مقصد ذہن کو تازہ دم کرنا ہے۔وہ بقدر ضرورت تبسم زیرلب کا اہتمام کرتا ہے۔

انشائیہ میں ظرافت اور ہجو کو شامل کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیئے ذہن کی پختگی اور نفاست وشائستگی کا ہونا بہت ضروری ہے۔اگر یہ اوصاف نہ دکھائی دیں تو انشائیہ میں طنز ومزاح بناوٹی معلوم ہوتا ہے۔ظرافت اور ہجو کے رنگ بہت گہرے ہونے چاہئے۔ایک اچھے انشائیہ نگار کے پاس قاری پر چلانے کے لیے خود کو تیر کمان سنبھالنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔وہ صرف مضامین ''ایسیز'' اچھالتا ہے اور وہ تیر ہی مختلف کمانیں حاصل کر کے قاری کی آنکھوں کے ذریعہ دل ودماغ میں پیوست ہوجاتے ہیں۔تحریر کا یہ طریقہ بالراست ہوتا ہے۔اس ہتھیار کو کبھی شخصیت کے

پہلو کو تنقیدی اشعار یا ناصحا اقوال کے ذریعہ اسطرح بیان کرتا ہے کہ وہ خوبی یا خرابی خود بخود سامنے آجاتی ہے۔ یا پھر کبھی کھلم کھلا خود سامنے آکر قاری کو بے پردہ کر دیتا ہے۔ ان مقاصد کو پورا کرتے کرتے وہ نصیحت بھی کرتا جاتا ہے۔ اور ہجو وطنز کے تیر بھی چلاتا ہے۔ ایسی تحریروں سے ظرافت اور ناصحانہ رنگ ٹپکنے لگتا ہے۔ کسی موضوع کو زبان و بیان کے تمام اوصاف کے ساتھ دلگداز طریقے سے بیان کرنا اور سماج کے بعض اہم مسائل پر چوٹ کرنا انشائیہ کا وصف خاص ہے۔ یہ مزاحیہ مضمون نہیں ہوتا اور نہ ہی فلسفیانہ اور سنجیدہ مضمون ہوتا ہے۔ بلکہ یہ دونوں کے درمیان خوش بختی اور خوش مزاجی کا نمونہ ہوتا ہے۔ اس میں زبان سے لطف اندوزی کا موقع تو دیا جاسکتا ہے۔ لیکن کسی کو مجروح کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔ یہی احتیاط انشائیہ کے حسن وخوبصورتی کو قائم رکھتی ہے۔

طنز نگار سماج کے ناہموار مسائل کو ہموار بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں کہیں کہیں وہ تکلیف بھری باتیں بھی کہہ گزرتا ہے لیکن اس کے مدنظر سماج سدھار کا عظیم مقصد ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اسے قابل جرم نہیں گردانتا مزاح نگار جو خود ایک ناہموار مسئلہ بن کر قاری کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ اور اسے اس پر ہنسنے کی ترغیب دیتا ہے اور ہنسی ہنسی میں اور خود کا مذاق اڑاتے ہوئے وہ ان سماجی مسائل کی اصلاح کرتا ہے۔

لیکن انشائیہ نگار ان دونوں سے الگ ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنے اسلوب کو اہمیت دے کر تازگی کے ساتھ خود کے ذاتی تجربات بیان کرتے کرتے آپ کو اپنی ایک نئی دنیا میں لیجا کر وہاں کی سیر کرواتا ہے اور مسائل کا حل نکال کر بتاتا ہے اور فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہے۔

ان تمام تقابلی تحریریوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انشائیہ ایک صنف سخن ہے اور طنز ومزاح ایک وصف ہے۔

ادبِ لطیف، کیفیہ اور انشائیہ:

''ادبِ لطیف = باریک بینی، خوشی، ذائقہ، مزے کا، کرم فرما، پوشیدہ بات کو جاننے والا، خدا کا ایک نام''۔ (۱۷)

ادبِ لطیف کے معنی ادبی نگارشات خصوصا مضامین اور تنقید جس میں اسلوب موضوع پر مقدمہ ہو نظم منثور، رمانیت اور شگفتہ نگاری پر مشتمل لٹریچر۔

پہلے انشائیہ کو ادب لطیف سے بھی موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ یہ نامزدگی صحیح نہیں ہے۔ یہ لوگوں کا قیاس ہے انشائیہ ایک صنف ہے ادبِ لطیف انسان کی حسی و ذہنی کاوشوں کا وہ لطیف سرمایہ ہے جو محسوسات اور مشاہدات کا نتیجہ ہے۔

ادبِ لطیف کے بارے میں محمد حسنین لکھتے ہیں۔

''ادبِ لطیف زبان و ادب کا ایک گوشہ اور تخلیق کارانہ عقل و عمل کی دنیا ہے''۔ (۷۲)

انشائیہ اور انشائیے میں محمد حسنین اردو زبان و ادب کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ادب لطیف اور ادب سنجیدہ جس کو انگریزی میں Light literature اور Serious Literature کہا جاتا ہے۔ ادب سنجیدہ کا تعلق علمی اور سائنسی مضامین سے ہوتا ہے۔ ادب سنجیدہ کا دائرہ بہت وسیع ہے اس میں تحقیق، تنقید، نفسیات، معاشیات، عمرانیات، فلکیات، سیاسیات وغیرہ سب کی گنجائش ہے۔

ادب لطیف کو بھی ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں وہ یہ ہیں۔ ادبِ لطیف میں مختلف شعری و نثری اصناف کے بارے میں ذکر کرتے ہیں جیسے نظم، غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مرثیہ، شہرِ آشوب، سہرا، گیت وغیرہ نثری اصناف میں حکایات، تمثیلہ، ناول، مختصر طویل افسانہ، کیفیہ، ریپورتاژ، مکالمہ، فکاہیہ، سوانح، خاکہ، داستان، ڈرامہ، مقالہ اور انشائیہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔

نثر میں مشاعرانہ انداز بیان اختیار کیا گیا۔ اس میں حسن و عشق صنف نازک سے جو لطافت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی وہ اردو کے خشک وعظانہ تحریروں کے خلاف ردعمل کا نتیجہ ہے۔ یقیناً یہی لطافت مذاق کے نتیجے کے طور پر ادب لطیف کی اصطلاح میں وجود میں آئی۔ یہ اصطلاح light literature کا ترجمہ ہے۔ اس تحریک کو ادب لطیف کہا گیا ہے۔ جس کا فکر و فلسفہ سے کوئی تعلق نہ ہو اور جو ذوق حسن کو آسودہ کرتی ہو۔ ناصر علی میں ۱۹۱۰ء کے صلائے عام کے دیباچہ مضامین میں مہدی کے مضمون ''خواب طفلی'' اور آرزوئے شباب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''خواب طفلی اور آرزوئے شباب اردو میں نیا انداز بیان ہے جس کو صاحب مضمون نے ادب لطیف یعنی light literature کے نام سے لکھا ہے''۔ (۷۳)

ادب لطیف کو نیاز یت اور ٹیگور یت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ رومانی تحریک کا نتیجہ ہے۔ رومانی تحریک کا آغاز ٹیگور اور آسکر وائلڈ کی تحریروں کے تراجم سے ہوا۔ ادب لطیف کا موضوع خاص طور پر عورت اور فطرت کے حسین مناظر ہیں۔ یہ انسان کی حسی و ذہنی کاوشوں کا وہ لطیف سرمایہ ہے جو خالصاً محسوسات اور مشاہدات کا نتیجہ ہے۔ یہ براہ راست ہماری اس اعلیٰ قوت سے رشتہ رکھتی ہیں جسے حسیت کہتے ہیں یا Sensibility کہتے ہیں۔ اور جو قلبی ملوثات سے آلودہ ہوتی ہے۔

''انشائیہ'' کے نام زدگی سے پہلے انشائیہ کو ادبِ لطیف سے موسوم کیا جاتا تھا چونکہ ابتداء میں چند ادیبوں کو غلط فہمی ہوگئی تھی اوران کی تحریروں میں رومانی اثرات حاوی ہو چکے تھے جس کی وجہ سے ادب لطیف کو انھوں نے انشائیہ سمجھ لیا۔

پروفسر محمد یاسین لکھتے ہیں:

''انشائیہ ،ادب لطیف کی وہ صنف ہے ، جسے عام طور پر ہلکے پھلکے ادب (لائٹ لٹریچر) سے منسوب کرتے ہیں۔یعنی جس میں انشاپردازی کا مقصود علمی وادبی یا سماجی واصلاح نہیں بلکہ محض نشاطی اور انبساطی ہے۔مقالہ نگاری کی سنجیدگی کے بغیر بھی ایک کامیاب انشاپرداز محض اپنی انفرادیت کے بل بوتے پر اپنے فن میں وہ کمال کرسکتا ہے جو دوسروں کو باآسانی نصیب نہیں ہوتا''۔(۷۴)

پروفیسر علیم اللہ حالی نے اپنا خیال یوں بیان کرتے ہیں:

''انشائیہ دراصل ایسّے اور ادب لطیف کے درمیان واقع ہوتا ہے نہ یہ ادب لطیف اور ادب پاروں کی طرح کھوکھلا اور بے مغز ہوتا ہے اور نہ ایسّے کی طرح خشک۔انشائیہ ادب لطیف اور ادب پاروں سے حسن بیان لیتا ہے اور ایسّے سے موضوع کی stability اول الذکر ہے ہمیشہ جز واعظم ہوتا ہے''۔(۷۵)

وزیر آغا کے انشائیہ خدوخال میں نثر کے اصناف کا ایک مختصر سا شجرہ درج کیا ہے۔جس میں ادبِ لطیف کا کوئی ذکر نہیں۔اس سے ہم یہ واضح کرتے ہیں کہ ادبِ لطیف کا کوئی صنف نہیں بلکہ ادبِ لطیف وصف ہے۔اس بات کو محمد حسنین،سید ظہیر الدین مدنی نے بھی اپنے اپنے انداز میں انشائیہ کو صنف قرار دیا ہے۔

ادب لطیف کی تاریخ میں شرر کو اس کا امام اور سجاد حیدر، نیاز فتح پوری اور خلیقی دہلوی وغیرہ کو اس قصر ادب کے ستون تصور کیا جاتا ہے۔مگر ان ادیبوں کے کارنامے ادب لطیف (بحیثیت صنف) سے زیادہ ایسے نگاری سے قریب ہیں۔ان ادیبوں نے عموماً انگریزی کے طور پر ماہرین فن کی طری ایسیز لکھے ہیں۔ان کے علاوہ حجاب اسماعیل، چودھری افق الحق، گوردھن داس، ملک محمد باقر نسیم رضوانی وغیرہ نے بھی اس صنف کو نوازا ہے۔ان کے کارناموں میں زیادہ ادب لطیف ہے۔مگر خال خال ایسے کے طرز کے مضامین بھی ملتے ہیں۔انشائیہ نگار کا تعلق ادب سنجیدہ سے نہیں، ادب لطیف سے ہوتا ہے۔اس تعلق میں قربت ہوتی ہے اور رفاقت بھی۔

انشائیہ نگار کی زبان اور ذہن مفکر یا سائنس داں کے نہیں ہوتے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا

کہ انشائیہ میں ادب سنجیدہ کی لہریں نہیں بہتیں یا فلسفہ وحکمت ،علوم اور سائنس جیسے ادب سنجیدہ کے شعبے انشائیہ نگار کے لیے آوٹ آف باونڈ ہوتے ہیں۔نہیں قطعاً ایسا نہیں ہے۔

انشائیہ نگار ادب کے ہر شعبے اور زندگی کے ہر گوشے میں قدم رکھ سکتا ہے۔اسے کہیں اور کوئی روک ٹوک نہیں۔وہ آزاد اور مختار ہے۔یہاں ادب سنجیدہ کی وادی سنگلاخ و دشوار گزار میں اس کے لئے ٹھرنا اور تادیر ٹھرنا مشکل ہے۔یہ نہ اس کا مسکن ہے اور نہ ہی وطن۔انشائیہ نگار ادب سنجیدہ کی جھلکیاں بتا سکتا ہے۔لیکن اس کی نظر اس کا مزاج فلسفہ وحکمت یا علوم اور سائنس کی ٹھوس اور مجرد صداقتوں کا خوگر نہیں ہوسکتا۔انشائیہ کا تعلق ادب لطیف سے اتنا گہرا ہے کہ ایک پر دوسرے کا گمان ہوتا ہے۔اور ادب لطیف میں خاص طور پر غزل اور مختصر افسانے سے قریب ہے۔ذیل میں ادب لطیف اور انشائیہ میں فرق کو واضح کیا جارہا ہے ملاحظہ ہو:

ادبِ لطیف	انشائیہ
ادبِ لطیف کا خاص موضوع عورت اور فطرت کے حسین مناظر پر مشتمل ہوتا ہے۔	انشائیہ کا موضوع عورت اور فطرت کے حسین مناظر سے عاری ہوتا ہے۔
ادبِ لطیف کا ایک خاص رنگ اور لب و لہجہ ہوتا ہے۔	انشائیہ میں کوئی خاص رنگ نہیں ہوتا۔
اس کا خالق واعظ ومبلغ ہوتا ہے۔	اس کا خالق آزاد ہوتا ہے۔
اس میں خالق کی شخصیت ادب پاروں کے تہہ میں چھپی رہتی ہے۔	انشائیہ نگار کی شخصیت ہر وقت ظاہر ہوتی رہتی ہے۔
ادبِ لطیف میں ہیئت ہوتی ہے۔	یہ ہیئت سے عاری ہوتا ہے۔
جذبہ کی شدت ہوتی ہے۔	جذبہ کی شدت نہیں ہوتی۔
ادب لطیف کا زبان و بیان مصنوعی ہوتا ہے۔	یہ حقیقی ہوتا ہے۔
ادب لطیف میں مصنوعیت اور رومانیت اس کے شناختی اجزاء ہوتے ہیں۔	انشائیہ میں کوئی اجزاء نہیں ہوتے۔

ان دونوں کے فرق کو مزید واضح کرنے کے لئے اقتباسات دیکھئے۔

انشائیہ کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''جنگلی جانوروں کے تحفظ کے لئے بنائے گئے زرین اصولوں جیو اور جینے

دو کا اطلاق اب اس فیلڈ میں بھی ہونے لگا ہے۔رشوت ستانی سے متعلق یہ غلط فہمی عام ہے کہ یہ وباء صرف ہمارے ملک میں پائی جاتی ہے۔مگر صاحب ایسا کچھ بھی نہیں ہے یہ تو گلوبل پرابلم ہے جو کرہء ارض کے طول وعرض کو محیط کئے ہوئے ہے۔گذشتہ دنوں پڑوسی ملک سے ایک صاحب ہمارے مہمان ہوئے۔ہم نے ان سے استفسار کیا۔کہ آپ کے ملک میں رشوت کمائی جاتی ہے؟ ہمارے اٹ پٹے سوال پر وہ بے ساختہ ہنس پڑے پھر گویا ہوئے۔ارے صاحب ہمارے ہاں کھانے کے لئے اور ہے ہی کیا؟۔۔۔اور اگر کچھ ہوتا بھی تو کیا ہم وہ کھاتے یہ نہ کھاتے۔پھر کوا تو ہر جگہ ہی کالا ہوتا ہے نا۔۔۔۔پہلی بار ہمیں احساس ہوا کہ واقعی کوا ہر جگہ کالا ہی ہوتا ہے پھر ہم سفید کوے کی موجودگی کے امکانات پر کیوں غور کرتے رہتے ہیں''۔(۷۶)

سجاد حیدر یلدرم کا ادبِ لطیف سے متعلق اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ گلابی، چمپئی، دھانی، ریشمی ساڑیاں جو پریوں کے سڈول جسموں سے لپٹی ہوئی تھی وہ اسٹیج ناچ کے چکروں میں مل کر طرح طرح کے نئے رنگ پیدا کرتی تھی۔پریاں تیتری کی ہلکی پرواز کی طرح ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر ٹھک ٹھک کے آتی جاتی تھی کبھی ایک دوسری سے ملتیں۔کبھی علحدہ ہو جاتی کبھی دو کے درمیان میں سے تیسری گزر جائے، کبھی حلقہ بندھ جائے، کبھی ٹوٹ جائے۔اس ملنے، جدا ہونے، چکر کھانے سے رنگ اور نور کا انحلال واجتماع ایسا مختلف ہوتا جیسے ہشت پہلو شیشے میں سے آفتاب کی کرنیں گزر رہے ہوں۔ان پریوں کا تھرک تھرک کر ملنا، پھر تیتر بیتر ہو جانا، شانوں کا ہلنا، بالوں کا جور سنبل کی طرح لہرانا، نازک کمروں کا ہچکیکھانا، جھک جھک کر دہرا ہو جانا۔یہ سب باتیں سلیس وبلیغ گتوں سے (جو ساز سارے پریاں بجا رہی تھیں) مل کر ایک ایسا نشہ آور منظر پیش کرتی تھی کہ کان موسیقی ورقص کر رہی ہیں یا رقص نغمہء ساز ہے کیا ہو رہا ہے''۔(۷۷)

ادبِ لطیف کے تمام نمونے میں نہ خیالات کی یکسانیت ہے اور نہ اسلوب کی جس طرح ممکن ہوتا ہے مصنفین اصناف وسخن میں لطافت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔چند خصوصیات قدر مشترک حیثیت رکھتی ہیں اس میں حسن تحریر کہ علاوہ جمالیاتی احساس ہر ایک کے یہاں نمایاں ہے اور رومانیت بھی۔لیکن مختلف فنکاروں کے

یہاں یہ مختلف انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

کیفیہ اور انشائیہ:

سید حسنین انشائیہ اور انشائیے میں لکھتے ہیں کہ ادب لطیف زبان و ادب کا ایک حصہ ہے۔ یہ ادب اور تخلیق کارانہ عقل و عمل کی دنیا ہے۔ لیکن عام طور پر اسے نہیں سمجھا جاتا۔ ادب لطیف کو تحریر کی ایک خاص صورت یا ادب کی ایک خاص صنف خیال کیا جاتا ہے۔ ادب لطیف سے مراد عموماً ایک خاص رنگ اور روپ کی تحریر لی جاتی ہے۔ تو ایک زمانے میں نیازیت یا ٹیگوریت، کہی جاتی تھی۔ ان دنوں ہمارے ادب میں ان تحریروں کا بڑا چرچا تھا۔ انشائیے لطیف کے نام پر نوخیز اہل قلم ان نگارشات کے لیے اپنی راتیں حرام کرتے تھے۔ انھیں محبوبہ کا تحفہ تصور کرتے۔ رنگین اور عطر میں بسا دیا گا رومال سمجھتے۔

بلاشبہ یہ تحریریں جو کسی شدید داخلی اور پراز پہچان کیفیت رقت خیز اور دیگر آگیں کیفیت کی ترجمانی تھیں۔ اپنی نیم گفتی یا لذت انگیز ابہام کا نمونہ تھی۔ یہ شوخ رنگ و پر آہنگ تحریریں اگرچہ ایک منفرد شکل اور ساخت کی حاصل تھیں مگر صنفی لحاظ سے یہ بے نام و نشان رہیں۔ دیگر نثری اسالیب مختلف ناموں نام زد ہوئے۔ پر ان کا کوئی نام نہ پڑے گا۔ اپنے نومشق قلم کاروں کے ہاتھ یہ نیم گفتیاں ابتداء ہی سے بے نام رہیں۔ اور آخرش گمنام مریں۔ آسانی کے لیے ان کو ہم ''کیفیہ'' سے یاد رکھیں گے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ کیفیہ وہ پیدند پھل تھا جو پکنے سے پہلے سڑ گیا! داخلیت کیفیہ میں نظر آتی ہے۔ یہ اس صنف کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ پر کیفیہ داخلیت پر درد اور پر سوز ہوتی ہے۔ یہ براہ راست قلب تک اتر جاتی اور لذت اضطراب بن جاتی ہے۔ انشائیہ کی داخلیت پہچان خیز یا شدید ہوتی ہے۔ انشائیہ اور کیفیہ دونوں اصناف تاثراتی تحریریں، خالص جذباتی لیکن اول الذکر میں دھوپ چھاؤں کی بہار ہوتی ہے۔ ساتھ ہی لیل و نہار کا سماں بھی کیفیہ میں نظر آتا ہے۔

انشائیہ اور انشائیے میں پروفیسر حسنین ادبِ لطیف اور کیفیہ (داخلیت) کو الگ الگ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح لکھتے ہیں۔

> ''داخلیت ہمیں کیفیہ میں بھی نظر آتی ہے۔ کیفیہ کی داخلیت پر درد اور پر سوز ہوتی ہے، یہ براہ راست قلب تک اتر جاتی ہے اور لذت اضطراب بن جاتی ہے''۔ (۷۸)

ادب لطیف کی ایک شاخ کیفیہ ہے۔ کیفیہ اور انشائیہ میں فرق دیکھئے۔

کیفیہ	انشائیہ

کیفیہ میں ایک ہی ذائقہ ہوتا ہے۔	انشائیہ میں کئی پھلوں کا ذائقہ ہوتا ہے۔
کیفیہ نثر کی شاعری ہے	انشائیہ نثر کی غزل ہے۔
کیفیہ میں انگریزی صنف شاعیر Ballad جیسی تاثیر ہوتی ہے۔	مرصع غزل جس کا ہر شعر نیا افق اور نئی سمت سامنے لاتا ہے۔
کیفیہ کی داخلیت ایت قلب تک اتر جاتی ہے۔	انشائیہ کی داخلیت صرف دل ہی کو نہیں چھیڑتی بلکہ دماغ کو بھی قلابازیاں کھلاتی ہے۔
کیفیہ میں داخلیت لذت اضطراب ہوتی ہے۔	انشائیہ میں داخلیت ہیجان خیز یا شدید ہوتی ہے۔
صرف سپیدہ سحر کی پاکیزگی کی نظر آتی ہے۔	اس میں دھوپ چھاؤں کی بہار، لیل ونہار کا سماں ہوتا ہے
قلم کار کی ادبی شخصیت کا نہ صرف غمازہ ہوتا ہے۔ افتاد اور نظر وفکر کی پرواز کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔	انشائیہ کے افق کی طرح نمودار ہوتی ہے۔ قلم کار کی شخصیت کے طبعی نقش ونگار کی نمو کا ظہور ہوتا ہے
کیفیہ نگار قنوطی ہوتا ہے۔	انشائیہ نگار زندہ دل، خوش فکری اور شگفتہ بیان ہوتا ہے۔

اردو کے غیر نثری اصناف سخن میں انشائیہ ایک ایسی صنف ادب ہے جو تقریباً پچاس ساٹھ برس سے ایک مسئلہ بنی ہے۔ چونکہ اس صنف کو مغرب سے اخذ کیا گیا اور انھیں من وعن مشرقی صنف ادب میں پیش کرنا چاہا۔ انشائیہ کے بارے میں آج تک بھی کچھ نہ کچھ لکھا جا رہا ہے لیکن آج بھی اس صنف کے تعین کے سلسلے میں کوئی رائے ہموار نہیں ہوئی۔

اردو انشائیہ میں دو طرح کے انشائیہ کی مثال دکھائی دیتی ہے۔ ایک وہ مضامین ہیں جن میں انشائیہ کے بعض نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ دوسرے وہ مضامین ہیں جنھیں ہم بڑی حد تک انشائیہ کا نام دے سکتے ہیں۔ ہر صنف کے بعض عناصر دوسری صنف پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں یا ایک دوسرے کے حدود کو توڑتے ہیں۔ کبھی انشائیہ میں مضمون کا کوئی عنصر داخل ہوتا ہے تو کبھی مقالہ بعض حصہ انشائیہ کا شبہ ہوتا ہے تو تھوڑا حصہ طنز ومزاح کا کبھی کسی قصہ کا یا افسانے کا۔ ہمارے بادیبوں نے مختلف تکنیکوں میں انشائیے تحریر کیے ہیں لیکن پوری حد تک ان کی کوشش کامیاب

نہ ہوسکی اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ جس طرح انگریزی میں ادب خالص انشائیے بہت کم ملتے ہیں۔اسی طرح اردو ادب میں بھی اصلی انشائیے کم ہیں۔اس کی وجہ Personal Essay میں لفظ کو درہم برہم کرنے کے ہیں۔

اکثر آج بھی یہ بحث جاری ہے کہ انشائیہ کیا ہے؟ کیا ہونا چاہئے یہ مضمون کی ایک قسم ہے یا پھر منفرد صنف ہے۔انشائیہ کیا ہے یہ واضح کرنے کے لیے میں نے مختصر انداز میں مضمون اور انشائیہ میں فرق، مقالہ اور انشائیہ میں تقابل کیا ہے۔مزاحیہ مضمون اور انشائیہ کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔تاکہ انشائیہ اور دوسری اصناف سخن کا فرق محسوس ہو سکے۔

اردو انشائیہ بیسویں صدی کی شروع کی دہائیوں میں اُبھر کر سامنے آتا ہے۔اس دور میں شعوری اور غیر شعوری طور پر ان گنت انشائیے لکھے گئے جو کبھی مضمون پرسنل ایسے یا لائٹ ایسے کی حیثیت سے تحریر ہوئے تو کبھی انشائیے لطیف کے،اہم ادبی شہہ پاروں کے طور پر بھی انھیں پہچانا گیا۔انشائیہ نگاروں نے قاری کے ذہن میں اتر کر اسے مختلف پہلوؤں پر منفرد زاویہ نظر سے دیکھنے پر مجبور کیا اور ان کی تحریریں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج بھی زندگی میں ہزاروں رہ گزر ایسی ہیں جن تک ہم پہنچ نہیں پاتے۔انشائیہ نگار یہاں قاری کا بہترین رہنما ثابت ہوتا ہے اور یہی مرکزیت تمام اصناف ادب میں وہ بلند مقام حاصل کرتی ہے جو دوسرے نثر نگاروں کو نصیب نہیں ہوتی۔ یہی خوبی انشائیہ کو دوسرے اصناف سخن سے منفرد رکھتی ہے۔

انشائیہ اردو ادب میں ایسی صنف کہلانے کی حقدار ہے جس نے ادب کے مختلف گوشوں یعنی تاریخی، سیاسی، سماجی، جغرافیائی، سائنسی اور اخلاقی وغیرہ کا احاطہ کیا ہے۔مختلف گوشوں میں سینکڑوں انشائیہ نگاروں نے اپنے انشائیہ تحریر کئے ہیں۔جن میں ملا وجہی، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، سرسید احمد خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، ماسٹر رام چندر، عبدالماجد دریابادی، میر ناصر علی، عبدالحلیم شرر، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، وزیر آغا، مشتاق احمد یوسفی، داؤد رہبر، جاوید صدیقی، رشید احمد صدیقی، احمد جمال پاشا، ظفر صدیقی، مشکور حسین یاد، محمود اختر، اقبال انجم، جمیل آزار، انور سدید، آدم شیخ، فرحت اللہ بیگ، اشرف صبوحی یوسف بخاری، خواجہ محمد شفیع، آصف علی مرزا محمد بیگ، مہیشور دیال، جاوید وششٹ، ضمیر حسن دہلوی، سجاد انصاری، پطرس بخاری، فکر تونسوی، کہنیا لال کپور، سید عابد حسین، کرشن، فرحت کاکوری، محمد حسنین، سیدہ آوارہ، اندر جیت لال، محمد حسن، جوگندر پال، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، معین اعجاز، وحیدالدین، سلیم محمد، محمد اسماعیل، سجاد حسین، عبدالقادر سلطان، حیدر جوش، خلیقی دہلوی وغیرہ وغیرہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انشائیہ کا گلشن مہکدار ہے۔

حواشی

(۱) فیروز اللغات، الحاج مولوی فیروز الدین، صفحہ۔ ۱۳۱

(۲) مہذب الاخلاق، حضرت مہذب لکھنو، صفحہ۔۳۸۶

(۳) فرہنگ آصفیہ، صفحہ۔۲۵۸۔۲۵۹

(۴) فرہنگ عامرہ، محمد عبداللہ خان، ص۔۶۷

(۵) انشائیہ کے فنی سروکار، دیباچہ احمد امتیاز، صفحہ نمبر۔۱۰

(۶) انشائیہ کیا ہے؟ نظیر صدیقی، صفحہ نمبر۔۲۱۔۲۲

(۷) انشائیہ کیا ہے؟ نظیر صدیقی۔ صفحہ۔۲۲۔۲۳

(۸) انشائیہ کیا ہے؟ نظیر صدیقی۔ صفحہ۔۲۳

(۹) انشائیہ کے فنی سروکار دیباچہ احمد امتیاز۔ صفحہ۔۱۱

(۱۰) صنف انشائیہ اور اردو انشائیے

(۱۱) اردو ایسیز، نیاز فتح پوری، دیباچہ

(۱۲) اردو ایسیز، سید ظہیر مدنی، دیباچہ

(۱۳) ادبی شمارہ نمبر۹ انشائیہ کیا ہے؟

(۱۴) انشائیہ کے فنی سروکار، ادیب علی گڑھ، صفحہ۔۴۳

(۱۵) ماہنامہ پٹنہ، اشارہ، مارچ ۱۹۶۰ء

(۱۶) اردو انشائیہ، صفی مرتضی۔۹۲

(۱۷) جدید اردو انشائیہ، انشائیہ ایک ہمہ جہت صنف نثر، سلیم آغا قزلباش، صفحہ۔۳۷

(۱۸) انشائیہ، محمد حسنین، صفحہ۔۱۶

(۱۹) انشائیہ کے فنی سروکار، انشائیہ کیا ہے؟، صفحہ۔۲۶

(۲۰) انشائیہ اور انشائیے، محمد حسنین، صفحہ۔۶۶

(۲۱) انشائیہ کے فنی سروکار، سلیم اختر، انشائیہ مبادیات، صفحہ۔۱۵۷

(۲۲) اردو ایسیز، صفحہ۔۱۱

(۲۳) سہیل کی سرگزشت، صفحہ۔۲۸۰

(۲۴) انشائیہ کے خدوخال، وزیر آغا، صفحہ۔۱۲

(۲۵) انشائیے کے فنی سروکار، انشائیہ کیا ہے، نظیر صدیقی، صفحہ۔۳۲

(۲۶) انشائیہ اور انشائیے، پروفیسر محمد حسنین، صفحہ۔۲۷

(۲۷) انشائیہ اردو ادب میں، ڈاکٹر انور سدید، صفحہ۔۱۰۴۔۱۰۵

(۲۸) انشائیہ نمبر، ادیب علی گڑھ

(۲۹) انشائیہ کے فنی سروکار، احمد حسین آزاد، صفحہ۔۴۵

(۳۰) انشائیہ ایک ہمہ جہت صنف نثر، سلیم آغا قزلباش، صفحہ۔۱۸۶

(۳۱) ماہنامہ، ادیب علی گڑھ، انشائیہ نمبر، مئی ۱۹۵۹ء

(۳۲) مجلس نصاب ایم اے، انشائیہ اور عمل انشائیہ، صفحہ۔۶۰

(۳۳) جدید انشائیہ، ڈاکٹر اسلم اختر

(۳۴) انشائیہ ایک ہمہ جہت صنف نثر، سلیم آغا قزلباش، صفحہ۔۱۷۲

(۳۵) انشائیہ کا فنی سرورکار، انشائیہ، از: اطہر پرویز، صفحہ۔۹۴

(۳۶) انشائیہ کے فنی سروکار، انشائیہ ایک ہمہ جہت صنفِ نثر، سلیم آغا قزلباش، صفحہ۔۱۷۲

(۳۷) انشائیہ کا فن، حامد برگی، صفحہ۔۳۸

(۳۸) انشائیہ کے فنی سروکار، ادب کی ایک خاص صنف انشائیہ، پروفیسر سید محمد حسنین، صفحہ۔۱۳۶

(۳۹) ادبی دنیا، بحث انشائیہ کیا ہے؟، خاص نمبر۔۹

(۴۰) انشائیہ اور انشائیے، پروفیسر محمد حسنین

(۴۱) اوراق ۱۹۶۶ء، انشائیہ ایک لطیف صنف نثر

(۴۲) اوراق ۱۹۷۲ء، افسانہ انشائیے نمبر

(۴۳) انشائیہ کے فنی سروکار، انشائیہ اطہر پرویز، صفحہ۔۹۳۔۹۴

(۴۴) انشائیہ اردو ادب، ڈاکٹر انور سدید

(۴۵) انشائیہ اور انشائیے، پروفیسر حسنین، صفحہ۔۶۶۔۶۷

(۴۶) انشائیہ کے فنی سروکار، سلیم اختر، صفحہ۔۵۴

(۴۷) جدید اردو انشائیہ، صفحہ۔۴۴

(۴۸) اوراق،انشائیہ کیا ہے؟۔۔۔افسانہ انشائیہ،۱۹۷۲ء

(۴۹) انشائیہ کے خدوخال،صفحہ۔۱۹

(۵۰) انشائیہ،صفحہ۔۳۲

(۵۱) انشائیہ کے خدوخال،ڈاکٹر وزیر آغا،صفحہ۔۲۹

(۵۲) انشائیہ کے خدوخال،ڈاکٹر وزیر آغا،صفحہ۔۲۱

(۵۳)مضمون انشائیہ اور انشائیہ نگاری،وزیر آغا

(۵۴) گالیاں۔پریم چند

(۵۵)انشائیہ اور انشائیے۔رام لال نا بھوی،صفحہ۔۲۰۸۔۲۰۹

(۵۶) گالی۔غلام جیلانی اصغر

(۵۷)الحاج مولوی فیروزالدین،صفحہ۔۶۴۵

(۵۸)اردو مضمون کا ارتقا،ڈاکٹر سیدہ جعفر،صفحہ۔۵۳

(۵۹) خاص نمبر اوراق،بلراج کومل کی شعری شخصیت،ایک تاثر،انور سدید،صفحہ۔۲۷۹

(۶۰) خاص نمبر اوراق،گرہ،سلیم آغا قزلباش،صفحہ۔۵۴

(۶۱)(Stepphen Leacock ,Humor and Humanity. P.II)

(۶۲) اردو نثر کا فنی ارتقاء۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری

(۶۳)اردو ادب میں طنز و مزاح،صفحہ۔۵۱

(۶۴)اردو ادب میں طنز و مزاح،صفحہ۔۵۱

(۶۵) اوراق مارچ،اپریل ۱۹۷۲ء

(۶۶) انشائیہ اردو ادب،انور سدید

(۶۷)خاص نمبر بشیر احمد قادری،انشائیہ میں طنز و مزاہ نگاری،صفحہ۔۲۶۹

(۶۸) انشائیہ نمبر اوراق،اکتوبر،نومبر ۱۹۸۲ء

(۶۹) اوراق،خاص نمبر،وزیر آغا،صفحہ۔۵۲

(۷۰)مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں،حسن چشتی،جلد اول،صفحہ۔۳۰

(۷۱) (https://www.urduinc.com)

(۷۲)صنف انشائیہ،محمد حسنین،صفحہ۔۲۹

(۷۳)اردو نثر میں ادب لطیف، قاضی عبدالودود، صفحہ،۸۵

(۷۴)انشائیہ نمبر۔''ادیب''، علی گڑھ، انشائیہ کے فنی سروکار، صفحہ۴۲،۴۳

(۷۵)انشائیہ کے فنی سروکار، اشارہ ماہ نامہ، پٹنہ مارچ ۱۹۶۰ء، صفحہ۔۴۳

(۷۶)شگوفہ سال نامہ، سفید کوا، مشتاق رضا، صفحہ۔۸۷

(۷۷)خارستان وگلستان، خیارستان، اردو نثر میں ادبِ لطیف، ڈاکٹر عبدالودود خان، صفحہ۔۱۱۸

(۷۸)انشائیہ اور انشائیے، پروفیسر حسنین، صفحہ۔۳۱

****

باب دوم

انشائیہ کی تاریخ

انشائیہ کا آغاز

اردو ادب اپنے اصناف کی بے مثال اور لچکدار تاریخ رکھتا ہے جس میں نظم کے اصناف بھی ہیں اور نثر کے اصناف بھی شامل ہیں۔نثر ایک ذریعہ ترسیل ہے اور صنفی و ادبی حیثیت بھی رکھتی ہے اور توضیحی اظہار کے لئے مشہور ہے۔شاعری کے دوش بہ دوش نثر نے ہر خاص و عام کو متاثر کیا اور اہل علم وفن نے اپنے علمی و ادبی سرمائے کو نثری اسلوب میں پیش کیا ہے۔نثری اصناف کا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں سب سے قدیم اصناف داستان، ناول اور افسانہ سے لے کر جدید اصناف رپورتاژ اور انشائیہ بھی شامل ہیں۔

اردو کی ہر صنفِ ادب اپنی ایک الگ تاریخ رکھتی ہے جو اپنے آپ میں مکمل اور اعلی معیار کی ضامن ہیں۔ انشائیہ بھی اسی ضمن میں آتا ہے جس میں اس کی اپنی ایک طویل تاریخ موجود ہے۔اس کی تاریخ فرانس، انگلستان سے لیکر ہندستان تک پھیلی ہوئی ہے۔جس کے موجد کبھی مونٹین تو کبھی بیکن تو کبھی وزیر آغا کو کہا گیا ہے۔

مونٹین(Montasign):

انشائیہ نگاری کا آغاز فرانس میں مونٹین (Montaigne) سے ہوا۔ جسے انشائیہ کا موجد اور باوا آدم کہا جاتا ہے۔اس کی تحریریں نہ کوئی عملی نظریہ یا ادبی دعویٰ ہے، اور نہ ہی یہ کوئی منظّم و مرتب مضامین ہیں۔ان میں اس نے مختلف موضوعات پر ہلکے فلسفیانہ رنگ میں اپنے تاثرات بیان کیے ہیں۔جن سے کوئی نہ کوئی اخلاقی درس ملتا ہے۔انداز بیان کے لحاظ سے بے ساختہ پن اس کا وصف خاص ہے۔ مانٹین کے انشائیے اس کی شخصیت کا مکمل عکس پیش کرتے ہیں۔اس سلسلہ میں اس کا یہ قول ذیل میں درج ہے۔

> ''ساری دنیا مجھ کو میری تصنیف سے پہچان سکتی ہے۔اور میرے ذریعہ میری کتاب سے واقف ہوسکتی ہے''۔(۱)

> ''مونٹین کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے یہ تحریر آتشدان کے پاس کسی آرام دہ کرسی پر لیٹے لیٹے لکھا ہو۔اور ہم اس کی دلچسپ گفتگو سے لطف اندوز ہو رہے ہوں''۔ (۲)

دنیا کی مختلف زبانوں میں انشائیہ کے نمونے صرف ادب پاروں کی شکل میں موجود تھے۔لیکن انگریزی نثر نگاروں نے انشائیہ کو نثر کی ایک علحدٰہ صنف کی حیثیت سے دنیائے ادب سے روشناس کیا اور لیکن ایڈیسن،

لیمب، ہیزلٹ، جانسن، گولڈاسمتھ، چرٹن، گارڈ نر وغیرہ نے بہترین انشائیے لکھے۔ فرانسی ادیب مانٹین کے انتقال کے سترہ سال بعد انگریزی کے امام بیکن نے اس طرز کو اختیار کیا اور اپنے انشائیوں کو افکار پریشان (Dispersed Meditation) سے موسوم کیا۔

فرانسس بیکن (22 Iam 1561-9 April 1629):

فرانسس بیکن اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم اور ذہین ادیب تھا۔ اور فلسفہ سائنس اور ادب میں کئی حیثیتوں سے اسے انگلستان میں اولیت کا شرف حاصل رہا۔ جدید مغربی فلسفہ میں بھی بیکن کو تاریخی شہرت حاصل ہے۔ بیکن نے اپنی مشہور تصنیف (Nounm onganum) میں اپنے نصب العین کا اعلان کچھ اس طرح کیا کہ

> ''مجھے حقیقت کا ذاتی ادراک ہوا جس کے لیے مجھے تحقیق و تفحص سے کام لینا پڑا میں غور و فکر کی کٹھن وادیوں سے گزر کر نتائج اخذ کرتا رہا۔ میرے نزدیک جدت کی کوئی قدر نہ تھی۔ اور نہ علوم کو اپنے دائرہ میں سمیٹ لیا''۔ (۳)

بیکن کی بیشتر تصانیف لاطینی زبان میں ہیں۔ لیکن اس کی اہمیت اور انگریزی ذہن پر ان کے اثرات سے کسی کو انکار نہیں۔ انگریزی ادب میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ وہ انشائیے ہیں جن کی بدولت وہ انگریزی انشائیہ کا باوا آدم کہلایا جاتا ہے۔ اس کے انشائیے دل سے زیادہ عقل کو متاثر کرتے ہیں۔ اس کے انشائیوں کی خصوصیت اختصار اور جامعیت ہے۔ بیکن کے انشائیے اپنے انداز اور بیان اخلاق و آموز ہونے کے سبب بیحد پسند کئے گئے۔ اس کا انشائیہ ''مطالعہ'' کا اقتباس کا نمونہ درج ذیل ہے۔

> ''مطالعہ مسرت، حسن اور قابلیت کا ضامن ہے۔ مسرت کو ہمیں نجی طور پر حاصل ہوتی ہے۔ مگر حسن مطالعہ کا انداز ہمیں گفتگو کے دوران میں ہوتا ہے۔ اور قابلیت کا امتحان کاروباری زندگی کے متعلق فیصلوں میں۔ کیونکہ مشاق عملی طور پر زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان معاملات پر صحیح رائیں اہل علم ہی دے سکتے ہیں۔ مطالعہ میں ضرورت سے زیادہ وقت صرف کرنا محض تساہل ہے۔ اور محض آرائش بیان کے لئے اس کا استعمال تکلف اور محض اصولوں کی بنا پر رائے زنی علماء کا مزاج ہے۔ مطالعہ سے ہمارے اندر ایک قسم کی پختگی آتی ہے۔ اور تجربے سے تکمیل ہوتی ہے کیوں کہ ہماری فطری صلاحیتیں ایسے خودرو پودوں کی طرح ہیں۔ جن کی کاٹ چھانٹ لازمی ہے۔ اور مطالعہ زیادہ حد تک

اسی سمت انگریزی انشائیہ کا بانی ہے''۔(۴)

انگلستان میں بیکن کو انگریزی انشائیہ کا بانی مانا جاتا ہے۔جبکہ فرانس میں مونٹین کو انگریزی انشائیہ کا موجد کہا جاتا ہے۔لیکن بیکن کو مقبول عام بنانے کے سلسلہ میں ولیم کارون والس ۱۶۶۰ء اور ابراہم کاولی ۱۸۶۶ء کا نام زیادہ قابل ذکر ہے۔کیوں کہ ان دونوں کے انشائیے مونٹین کے انشائیے سے زیادہ قریب ہیں۔دور اصلاح (۱۶۶۰ء تا ۱۷۰۰ء) کے انشائیہ نگاروں میں ولیم کارون والس اور ابراہم کاولی کے علاوہ سرٹامس براون اور ڈرائڈن کے نام بھی قابل ذکر ہیں، جو اچھے ''ایسّے نگار'' یعنی انشائیہ نگار تھے۔ براؤن نے انشاء پردازی کو ایک نیا رخ دیا اس نے اس میں اپنے اعلیٰ خیالات کو موزوں اور شیریں الفاظ کے قالب میں ڈھالا۔اور ڈرائڈن نے پر تکلف اور مصنوعی نثر کی جگہ سادہ رواں اور فکر انگیز نثر کو رواج دیا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں جب اخبار کا اجراء عمل میں آیا تو ٹٹیلر اور اسپیکٹر کے ذریعہ انشائیہ نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔ان اخباروں کے ذریعہ سے ایڈیسن اور اسٹیل جیسے عظیم انشائیہ نگاروں کی انشائیہ نگاری سامنے آئی۔اوران کی بدولت انشائیے کی دو قسمیں وجود میں آئیں۔(۱) سنجیدہ انشائیے (Serious Essays) اور (2) لمحاتی انشائیے (Occasianal papers)۔

ڈاکٹر آدم شیخ اس سلسلے میں صراحت کرتے ہیں کہ:

> ''پہلی قسم میں اولین فلسفہ، منطق، تاریخ اور تحقیق سے دامن بچاتے ہوئے پر تکلف اور عالمانہ انداز میں موت، دوستی شادی اور تعلیم جیسے اہم مسائل پر اپنے ذاتی تاثرات پیش کرنا جس کو ایڈیسن نے بخوبی پیش کیا ہے۔اور دوسری قسم میں ایڈیسن نے بے حد تکلف، پر مزاح موڈ اور نجی ترنگ میں نظر آیا ہے۔اور لیمب کے ملاح جو اسے پہلا حقیقی انشائیہ نگار قرار دیتے ہیں۔دراصل یہ بھول جاتے ہیں۔کہ بیکن اور اس کے بعد ایڈیشن (Adison) نے ہی لیمب کے لیے راستہ بنایا تھا''۔ (۵)

سوزن کوپر نے ان ہی لوگوں کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''انشائیہ نثر میں سانیٹ کا نعم البدل نہیں ہے۔اس کی ہیئت میں کسی قسم کی تبدیلی ہی نہ ہوسکتی اور جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک روایتی اور جامد ڈھانچے سے بندھا رہے۔انشائیہ ایک ایسا فنی ڈھانچہ ہے۔جو زبان وادب کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ خود بھی بدلتا رہتا ہے۔جو لوگ اس تبدیلی کو قبول نہیں کرتے ان کے یہاں ناقابل برداشت یکسانیت پیدا ہوجاتی ہے''۔(۶)

اسٹیل (Steal) کے انشائیوں میں خاص طور سے دوستی نظر آتی ہے۔اور ساتھ ہی اس نے اپنے انشائیوں میں بے باکی کا بھی مظاہرہ کیا۔اس کے انشائیوں کی ایک صفت کشادہ دلی بھی ہے۔ایڈیسن کے انشائیوں میں اخلاقیات اور ظرافت دکھائی دیتی ہے۔ایڈلین ایک خوش مزاج مصنف اور بہترین ادیب وفن کار ہے۔اسٹیل اور ایڈیسن کی پیروی کرنے والوں میں ڈاکٹر جانسن اور گولڈاسمتھ کے نام قابل ذکر ہیں۔ڈاکٹر جانسن کے انشائیے صحیح معنوں میں اس کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔اس کے گوناگوں تحریرات میں تازگی اور بے تکلفی جیسی خصوصیات کے عناصر نمایاں ہیں اور اس کا تحریری مجموعہ ''جانسنی اسلوب'' کے نام سے مشہور ہے۔گولڈاسمتھ کے انشائیوں میں بے باکی اور جدت اور اس کے ظریفانہ اسلوب میں بڑی دل کشی پائی جاتی ہے۔ولیم ہیزلٹ بھی اس صدی کا ایک ممتاز انشائیہ نگار ہے۔جو موقع ومحل دیکھ کر الفاظ کا مصرف لیتا ہے۔اور دوسرے ادیبوں کے فقروں کو بطور کثرت سے استعمال کرتا ہے۔اس کی تحریروں میں جوش واشتعال انگریزی ملتی ہے۔غرض یہ کہ انگلستان میں اٹھارہویں صدی کا ادب بیشتر اخلاق پر تخلیق کیا گیا تھا۔

انیسویں صدی دراصل ناول نگاری کی ترقی کا عہد مانا جاتا ہے،اور انشائیہ نگاری کی کساد بازاری کا زمانہ۔جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ناول نے انشائیہ کے طنز وظرافت،تخیل پردازی اور شگفتہ بیانی جیسے عناصر کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔پھر بھی اس عہد میں چارلس لیمب اور ایونسن جیسے ممتاز انشائیہ نگار موجود تھے۔

چارلس لیمب (1775ءتا1934ء):

چارلس لیمب انگریزی مضمون نگاروں کا بادشاہ تسلیم کیا گیا ہے،وہ کولرج نفاذ کا ہم عصر تھا۔لیمب کے مضامین خوبصورتی،الفاظ کا حسن اور تحریرات،فن کے نقطہ عروج پر پہنچے ہوئے ہیں۔لیمب کے حصہ میں وہ دل کشی آئی جو کسی مضمون نگار کے حصہ میں نہیں آئی۔لیمب کے مضامین اس کی شخصی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔لیمب کے مضامین اس کے خودنوشت سوانح ہیں۔وہ اپنے قاری کو اپنا ہم راز بنا کر اس کے سامنے دل کھول کر رکھ دیتا ہے۔اس کی تحریرات میں حکمت وفلسفہ بھی ہیں۔اور شاندار انسانیت بھی۔۱۸۲۰ء میں لکھے گئے ایسیز آف ایلیا'' (Wssay of elia) اس کے مشہور ایسیز ہیں۔اس نے دوسرے اصناف سے بھی انگریزی ادب کو مالا مال کیا۔اس خوبصورت اور دلکش تحریریں نثر نگاری کی جان ہے۔اس کے انشائیے دل ودماغ دونوں کو متاثر کرتے ہیں۔چارلس لیمب کے ایک خوبصورت انشائیہ ''کنوارے کی شکایت'' کا ایک اقتباس ذیل میں درج ہے ملاحظہ فرمائیں:

''یکا وتنہا فرد کی حیثیت سے میرے وقت کا بیشتر حصہ شادی شدہ لوگوں کی

ان کمزوریوں کے مشاہدے میں صرف ہوا ہے جو میرے اس طرح کنوارانہ رہنے پر شاید میری تسکین دل کا بھی باعث ہوتیں ۔میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مردوں اوران کی بیویوں کے جھگڑوں کا میرے اوپر کوئی اثر ہوا۔لیکن شادی شدہ لوگوں کے گھر میں مجھے جس بات کا سب سے زیادہ رنج ہوتا ہے۔وہ یہ کہ اپنی محبت کا شدید طور پر اظہار کرتے ۔۔۔۔اپنے کو دنیا سے الگ تصور کہ وہ ایک دوسرے کی دنیا میں کھو جانے کا مقصد ہی اس امر کا بین ثبوت ہے۔کہ وہ ایک دوسرے کو دنیا پر ترجیح دیتے ہیں۔شادی دراصل ایک قسم کی اختیار کلی ہے جو ہمارے لئے کم دلشکن نہیں اس حق خود اختیاری کا مقصد تو یہ ہونا چاہئے تھا۔کہ شادی شدہ جوڑے کنواروں کا لحاظ رکھتے ہوئے انہیں اپنے حق وحصہ کی ترغیب نہ دیتے۔لیکن یہ لوگ خواہ مخواہ اپنی حرکتوں سے ہمیں چھیڑنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔''(۷)

اسٹیونسن (۱۸۵۰ءتا۱۸۹۴ء):

اسٹیونسن پیدائشی مضمون نگار تھا۔یہ ذہین تھا اور اس کی ذہانت و اسلوب میں لیمب کے بعد مضمون نگاری کی مسند اس کو ملی اس کے مضامین میں اس کی شخصیت کی عکاسی ہوتی ہے۔اس کی تحریریں قاری کو متاثر کرتی ہیں۔اس کے انشائیوں میں اس کی وعظانہ اور معلمانہ شخصیت کا اظہار ہوا ہے۔الفاظ کے استعمال میں وہ فن کار تھا۔

عصر حاضر میں چیسٹرٹن شاعر ناول نگار مضمون نگار نا قد سب کچھ ہے۔لیکن مضمون نگار سے زیادہ صحافی ہے۔بلکہ مضامین موجودہ عہد میں سب سے بہتر ہیں۔اس کے اسلوب میں مزاح اور ظرافت کی خصوصیت پائی جاتی ہیں۔اس کے علاوہ بائرلؔ کے مضامین مختلف عنوانوں کے ماتحت ہیں۔اس کے مضامین کے مطالعہ سے قاری کے دل میں ادب سے محبت کرنا سکھاتا ہے اور ادیبوں کی قدر و محبت بڑھاتا ہے۔آگے بڑھتے ہیں تو لیوکسؔ لیمب کی تحریروں میں کچھ عمیق اور، کچھ سطحی سنجیدہ فکر ہیں اس کے علاوہ دلکشی اور ظرافت اور زندہ دلی کا نمونہ ہیں۔اور دوسرے طرف ٹھوس اور خالص مواد سے پر ہیں۔اے۔کی گارڈنر کے مضامین دلچسپ ہے۔جس میں جذبہ ہمدردی، روشن دماغی اور خوش دلی پائی جاتی ہے۔اس کے اسلوب میں روانی، زندہ دلی، ظرافت اور ادبی و تاریخی تلمیحات کے خصائص ملتے ہیں۔

انگریزی مضمون نگاری کی تاریخ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس قسم کے میلانات اور کیا اسالیبِ بیان انگریزی زبان کے پیش نظر رہے ہیں۔جن سے ہمیں انشائی ادب کا سراغ ملتا ہے۔جو آگے چل کر انشائیہ کو

ایک صنف کی حیثیت بخشنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

*****

اردو زبان میں انشائیہ کا آغاز

اردو ادب میں انشائیہ کا آغاز اس وقت ہوا جس وقت مغرب میں مونٹین اور بیکن فرانس کے دو مشہور ''ایسّے'' نگار اپنے انشائیے لکھ رہے تھے۔ اور عین اسی وقت ملاّ اسد اللہ وجہی نے انشائیہ پیش کیا جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ جس دور میں ملاّ اسد اللہ وجہی نے اپنا یہ انمول کارنامہ پیش کر رہے تھے وہ عصر صوفیانہ تحریریں، داستانوں اور مثنویوں کا عصر تھا۔ چونکہ اس وقت تحریر کی اس مجموعہ کا کوئی نام نہیں تھا لیکن اس میں انشائیہ کی خصوصیات پائے جانے کی وجہ سے انشائیہ کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ''سب رس'' کے اسلوب، الفاظ کی شگفتگی، سادگی اور جملوں کی عنائیت اور موسیقیت یہ سب انشائیہ ہونے کی دلیل ہے لیکن باضابطہ اس وقت تک انشائیہ کو ''انشائیہ'' کا نام نہیں دیا گیا تھا جب کہ اس کی بنیاد سولہوی صدی میں رکھ دی گئی تھی۔

لیکن اس کے بعد چند ایک صدیوں تک اس صنف پر کوئی تصنیف تحریر نہیں کی گئی، اور نہ ہی ایسے مضامین یا تصانیف کی طرف پیش رفت کی گئی جس کا تعلق راست طور سے یا بالواسطہ طور پر انشائیہ سے مطابقت رکھتے ہوں۔ جس کی وجوہات کئی ایک ہیں۔ جن میں خاص طور سے اس دور کے سماجی، معاشی اور سیاسی حالات موجود ہیں جس کی وجہ سے اردو زبان کی ترقی و ترویج میں رکاوٹ حائل ہوگئی۔ اور مصنفین، ادیبوں یہاں تک کے عوام میں بھی اردو زبان سے دلچسپی جاتے رہی۔ اس وقت کے حالات پر سید صفی مرتضٰی رقمطراز ہیں:

> ''اول تو یہ (اردو) بازاروں میں پھرتی رہی اور صرف عوام سے سابقت رہا پھر بزم شعراء میں داخل ہوئی۔ نغمہ و موسیقی کی تانیں اُسے لے اُڑیں۔ ایک طرف خانقاہوں کی مقدس فضا میں سبحی و سجادہ سے دست بوس تھی تو دوسری طرف درباروں میں راش و رنگ کی نیلم شاعری پر قابو پا لینے کے بعد نثر کے میدان میں قدم رکھا تو داستانوں فقہ و تصوف کے رسالوں میں نظر آنے لگی۔ جیسا ماحول پایا اسی سے ساز کرنے لگی۔ جیسا اس وقت کا مزاج تھا اور جو اس وقت کی دلچسپیاں تھیں ان ہی میں یہ بھی شریک تھی اس وقت نہ علمی ماحول تھا اور نہ ماحول کو بدلنے کی کوشش کے آثار کس طرف سے ظاہر ہو رہے تھے''۔ (۸)

اسی طرح اٹھارویں صدی کے اوائل میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہر طرف حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ خاص طور پر دلی میں چاروں طرف خانہ جنگی اور جنگ کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ ہندوستانی کلچر اور ثقافت ہر

لحاظ سے اپنے ہی قدموں تلے روندھی جارہی تھی۔ اورنگ زیب کے بعد کے حکمران اپنی حکومت اور اقتدار بچانے کی کوشش میں لگے رہے۔آئے دن ان کا مقابلہ راجپوت، جاٹ، سکھ اور روہیلوں سے ہونے لگا۔مغل حکمراں نے اپنی تمام توجہ بغاوتوں اور لڑائیوں کا سامنا کرنے میں صرف کر دیا جس کی وجہ سے اردو ادب کے نظم ونثر کی خوبصورتی کا خون خرابہ ہوا۔

دلی کی خانہ جنگیوں کی وجہہ سے وہ تو برباد ہو چکی تھی رہی سہی کثر نادر شاہ کے حملوں نے پوری کر دی۔ یعنی دلی پوری طرح تباہ وتاراج ہو چکی تھی۔۔اسی دوران جنگ بکسر شروع ہوگئی۔اس جنگ نے دلی کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کی کمر توڑ دی۔اور عیاش پسند نوابوں کی عیاشی کی وجہہ سے صنف شاعری کا عروج ہوا اور نثر بے توجہی کا شکار ہوگئی۔ان کی حسی اور ذہنی آسودگی کی خاطر اس عہد میں واسواخت اور ریختی جیسی اصناف عروج پر تھیں ساتھ ہی فن بلاغت وعروض اور قواعد کو اہمیت دی گئی۔

اس بات سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ ان دنوں ہندوستان میں ایسے حالات برپا ہو چکے تھے کہ جس میں ادب اور ادب پاروں کی طرف متوجہ ہونا تقریبا ناممکن تھا باوجود ان حالات میں رجب علی بیگ نے ''فسانہ عجائب'' جیسی عظیم تحریر پیش کی لیکن اس میں انشائیہ کی کوئی خصوصیت نہیں پائی گئی۔مصنفین اور ادباء کی ذہنی ومعاشی حالت کچھ اس طرح ابتر ہوگئی تھی کہ انشائیہ کی شگفتہ ورعنائی کو تحریر کرنے سے قاصر تھے۔اس دور میں میر کے ''نوحہ دلی'' اور داغ کے ''شہر آشوب'' ہی دیکھنے کو ملیں۔ اس کے علاوہ اس وقت مرزا غالب نے بھی اپنے غموں کو بھلانے کے لئے ''خود پر'' طنز کیا اور اپنے شکستہ دل کو سنانے کی کوشش کی۔اسی طرح غالب کے کئی خطوط میں انشائیہ کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔

ملا وجہی کے بعد انشائیہ کی خصوصیات عطا حسین خاں تحسین کی کتاب ''نوطرز مرصع'' میں ملتی ہے۔سید انشاء کی وہ کتاب جس میں انہوں نے رانی کیتکی کا قصہ نکھری ہندی میں لکھا ہے۔اور ''طلسم ہوشربا'' وغیرہ یہ چند ایسی کتابیں ہیں، جن میں انشائیہ کے آدھے ادھورے خام مواد ملتے ہیں جو انشائیہ کی ابتدائی اور ارتقائی تاریخ کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

انشائیہ کے کچھ نمونے ''تہذیب الاخلاق'' رسالے میں ملتے ہیں۔مگر ''تہذیب الاخلاق'' کے اکثر مضامین میں زور استدلال پایا جاتا ہے جس میں سرسید اپنی اصطلاحی تحریک کو بڑھاوا دینا چاہتے تھے لہذا یہ طرز بیان انشائیہ کے اصولوں کے منافی ہے۔''تہذیب الاخلاق'' میں مضامین تحریر کرنے والوں میں حالی، ذکاء اللہ، چراغ علی، محسن الملک اور وقار الملک شامل ہیں۔یہ سب مذہبی، سماجی، سیاسی، تہذیبی، اخلاقی اور تعلیمی مضامین لکھتے تھے۔اسی وجہ سے ان مضامین کو انشائیہ کا درجہ نہیں دیا جاسکتا لیکن سرسید کے کچھ مضامین کو انشائیہ میں شمار کیا جاسکتا

ہے کیونکہ ان مضامین میں مصنف کی ذات کا عکس ملتا ہے جو انشائیہ کے اصول وضوابط میں سے ہیں۔ جیسے ہمدردی، خوشامد، بحث وتکرار اور امید کی خوشی وغیرہ۔

مولانا آزاد کو بھی انشائیہ نگاروں کے زمرہ میں کسی حد تک شامل کیا جاسکتا ہے۔ ان کی مشہور تصنیف ''نیرنگ خیال'' میں انشائیہ کا انداز تھوڑا بہت ملتا ہے۔ چونکہ ان کے مضامین میں فلسفیانہ جھلک بھی پائی جاتی ہے اور انشائیہ کو فلسفہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ان مضامین سے مصنف کی شخصیت جھلکتی ہے اور نہ اس کے ذاتی تجربات ظاہر ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ کہنا مشکل ہے کہ آزاد کی تحریرات مکمل طور پر انشائیہ ہے یا پھر انشائیہ نہیں ہے۔

خواجہ حسن نظامی بھی صنف انشائیہ کی ترقی میں بڑی حد تک کامیاب انشائیہ نگاری کی ہے۔ ان کے مضامین ''دیا سلائی'' آسمان کی آوازیں'' ''سیم لا'' اور ''گلاب تمہارا، کیکر ہمارا'' کو ہم انشائیہ کے صف میں رکھ سکتے ہیں۔ ان مضامین میں خواجہ حسن نظامی کی شخصیت پوری طرح سے نمایاں ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کو بھی انشائیہ نگار کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ دراصل انہوں نے اپنی مزاح نگاری سے فائدہ اٹھایا اور چونکہ انشائیہ میں مزاح نگاری کو ایک اہم مقام حاصل ہے اس لئے مرزا فرحت اللہ بیگ کو انشائیہ نگار کہا جاسکتا ہے۔ ان کے انشائیہ ''نذیر احمد کا حلیہ'' اور ''ایک وصیت کی تعمیل'' انشائیہ نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بھی بعض مضامین انشائیے سے قریب ہیں۔ کیونکہ ان میں انہوں نے اپنے ذاتی تجربات کو نہایت ہلکے پھلکے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے مضامین ''کرشمہ قدرت'' ''چڑیا چڑے کی کہانی'' ''فطرت کی بزم نشاط'' اور ''حکایات بادہ وتریاک'' کو ہم انشائیہ کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے بعض مضامین انشائیہ کے عمدہ نمونہ ہیں۔ ان کے انشائیہ میں ظرافت کا رنگ غالب ہے اور یہی رنگ ان کو انشائیہ نگاروں کی محفل میں جگہ دیتا ہے۔ بجرد، اور امتحانات میں انشائیہ کی رنگین جھلک موجود ہے۔ انشائیہ نگاروں کی بزم میں پطرس کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔ ان کا طرز بیان بھی بہت سبک ہوتا ہے۔ ان کے انشائیہ میں ظرافت کی چاشنی بھی شامل رہتی ہے اور طنز کی تلخی بھی۔ پطرس کے موضوعات بھی ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ پطرس کا مضمون ''لاہور کا جغرافیہ'' انشائیہ کے حدود میں آسکتا ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں جن انشائیہ نگاروں کا ذکر کیا ہے ان کے انشائیوں میں مکمل طور سے انشائیہ نگاری کی خصوصیات نہیں پائی جاتی ہیں۔ اور اگر سختی سے جانچا جائے تو ان میں بہتوں کو انشائیہ نگار بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے انشائیہ کی سختی میں لچک پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ اردو انشائیہ تہی دامن اور بے بضاعت نہ ہوجائے۔ اس کے علاوہ موجودہ دور کے بدلتے ہوئے رجحانات کے پیش نظر انشائیہ کے اصولوں میں تھوڑی بہت

ترمیم بیجانہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے کاروبار کو وسیع کرنے کے لیے انگریزی زبان وتعلیم کو عام کرنا شروع کیا۔ ہندوستان کو اس وقت انگریزی بہاو کے دھارے میں بہنا ضروری تھا۔سرسید اپنی قوم کو انگریزی کے برابر ترقی کرتے دیکھنا چاہ رہے تھے اور وہ وقت کے بدلتے تیور کو اچھی طرح سے بھانپ چکے تھے اس لئے انہوں نے انگریزی تعلیم کو ضروری سمجھا علاوہ ازیں ادبی حلقوں نے انگریزی ادب کی کئی اصناف کو مستعار لے کر اردو ادب میں انھیں داخل کیا اور انگریزوں کے مدمقابل کھڑے رہنے کی کوشش میں کافی حد تک کامیاب رہے۔انگریزی ادب کے عام ہونے سے جہاں دیگر زبانوں کو نقصان پہنچا وہیں اردو ادب میں کئی اصناف سخن کا اضافہ ہوا۔مثلاً سانیٹ، ناول، آزاد نظم، نظم معرا وغیرہ مضمون نگاری کی نہج کو سنجیدگی سے لیا گیا۔اور اس میں کچھ ترمیم کر کے ''انشائیہ'' منظر عام پر لایا گیا۔یہیں سے انشائیہ نے اپنے وجود کو شناخت دلانے میں کامیابی حاصل کی اس سلسلے میں سید صفی مرتضی کا قول ہے۔

> ''غدر کے بعد ہندوستان میں دو ایسی قوموں کا اتصال ہوا جو اپنے رنگ کی طرح اپنے کلچر، اپنی زبان، اپنے روایات، اور اپنے عقائد میں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ایک طرف ہندوستانی تھے جن کی قوت عمل کو عیش وعشرت نے چوس لیا تھا۔۔۔عقل وخرد کے سونے خشک ہو رہے تھے اور حکمت وتدبر کی جولانی فرار کی شکل اختیار کر لی تھی۔دوسری طرف ایک نئی قوم تھی جو فاتحانہ انداز سے داخل ہوئی تھی۔انہوں نے میدان عقل ودانش سے جیتا تھا۔وہ سیاست کی ماہر، علم وفنون میں آگے اور سائنس میں منفرد تھی۔ایسی دو قومیں ہندوستان میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی تھیں۔بڑھتے ہوئے حوصلے شکستہ ہمتوں کے متقابل تھے۔ہندوستانیوں کے احساس کمتری کا یہ منظر بڑا بھیانک اور تاریک تھا۔پریس کو قدرے آزادی مل گئی تھی۔اور اخبارات نکل رہے تھے۔ایسے عالم میں سرسید نے انگلستان سے واپس آ کر رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔جس کا پہلا نمبر 24/ڈسمبر 1870' میں نکلا۔اس رسالے نے اردو زبان کی ترقی میں اہم خدمات انجام دی اور مضمون نگاری کی بنیاد ڈالی''۔(۹)

یہی وجہ تھی کہ کئی لوگوں نے سرسید کو ہی انشائیہ کا بانی قرار دیا۔لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ سرسید کے مزاج اور طریقہ تحریر میں انشائیہ کی جھلک تو ملتی ہے مگر انشائیہ کے تمام اصولوں پر کھری نہیں اترتی۔سرسید نے خواجہ الطاف حسین حالی سے ''مقدمہ شعر وشاعری'' لکھوا کر اردو شاعری کا بھی رجحان بدلا۔اور سرسید نے نثر کے

میدان میں بھی اپنی کوشش جاری رکھی اور مغربی طرز پر مضمون نگاری میں بہترین طبع آزمائی کی۔

محمد حسین لکھتے ہیں:

''عہد آزاد اردو انشائیہ کی صبح کا ادب ہے اور عہد رشید صبح صادق''۔ (۱۰)

محمد حسین آزاد نے لیپل گریفن (Lapple Garaffin) اور کرنل ہالرائیڈ (Carnal Halriyed) کی قدردانی میں بہت ساری کتابیں تصنیف کی اسی دوران انہوں نے ''نیرنگ خیال'' لکھی جس میں چھ مضمون جانسن تین ایڈیسن اور بقیہ دوسرے انگریزی ادیبوں کے ہیں۔ان تمام انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ کیا گیا۔ جانسن اور ایڈیسن کے عمدہ خیالات پر محمد حسین آزاد کی ترجمانی اور الفاظ کا جادو اردو ادب میں کلاسیکل کا درجہ حاصل کر گئے۔اوران کی آزادی کی تحریروں میں افسانوں اور انشائیوں کے اولین نقوش ملتے ہیں۔

انیسویں صدی کے ابتداء میں مضمون یا انشائیوں میں طنز وظرافت کی جھلک نظر آنے لگی۔اس صنف میں بعض تو اتنے آگے نکل گئے کہ انشائیہ کی شگفتگی اور رنگینی ان سے چھوٹ گئی۔ان لوگوں کے مضامین خالص طنز و مزاح کے زمرہ میں آ گئے۔ جسے منشی سجاد حسین، احمد علی شوق، جوالا پرشاد، برق، مرزا مچھو بیگ، منشی احمد علی کمنڈوی وغیرہ۔ان کے بعد عبدالحلیم شرر کی چند تحریروں میں انشائیہ کا طرز نظر آتا ہے۔انہوں نے اپنے رسالے ''دلگداز'' میں مختلف موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا جیسے خلوص، لالہ خوردو، بدمستی، باغ آرزو، اچھوتا پن، پاس، ان تمام موضوعات میں انشائیہ نگاری کے عنصر پائے جاتے ہیں۔شرر اپنے ناولوں سے زیادہ اسطرح کی تحریروں میں کامیاب رہے ہیں۔اوراسی دور میں انشائیہ عصر حاضر سے ہم آہنگ ہوتا نظر آنے لگا، اس میں شوقی نظر آنے لگی، اس کے نقوش تیکھے ہونے شروع ہو گئے۔انیسویں صدی کی جو تحریریں تھیں وہ انشائیہ سے قریب ضرور تھیں لیکن پوری طرح انشائیہ نہیں کہلائی جاسکتی تھیں۔

وزیر آغا لکھتے ہیں:

''بیشتر لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ انشائیہ ادب کی مشکل ترین اور لطیف صنف ہے اور یہ صرف اس وقت نمودار ہوتی ہے جب زبان ارتقاء کے بہت سے مراحل طے کر چکی ہوتی ہے۔'' (۱۱)

انشائیہ بیسویں صدی میں اردو ادب کی دنیا میں ترقی کی منزلیں طئے کرتا رہا۔اور انگریزی کے راست اثرات اردو ادب پر پڑنے لگے اور ناول، افسانہ، ڈرامہ اور انشائیہ ارتقاء کی منزلیں طئے کرتے چلے گئے۔اس طرح انشائیہ کی ہیئت صاف اور واضح ہونے لگی، یہی انشائیہ کا جنم تھا۔اردو ادب کے مصنفین اور ادباء اس کی اہمیت سمجھنے لگے۔یہ ایسا وقت تھا جب انشائیہ مضمون سے آگے نکل گیا۔

ایک جانب تو ہندوستان مکمل طور سے انگریزوں کی حکومت اور سامراجیت میں آ چکا تھا۔ اور آزادی کے لئے مختلف تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ اسی دوران صحافت کو فروغ ملا۔ اردو صحافت نے بھی آزادی میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ اردو ادباء اور خاص کر مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ہندوستان کے خوابیدہ ذہنوں کے شعور کو بیدار کرنے اور آزادی کی جدو جہد میں شامل ہونے کی طرف راغب کرنے لگے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں نے اپنی تقریروں اور جوش و جذبے سے پُر خیالات کو الہلال، زمیندار، جیسے اخبارات میں شامل کر کے ایک نیا صحافتی انقلاب برپا کر دیا۔

ظفر علی خاں ایک ایسے ادیب اور مصنف ہیں جنہوں نے اپنے معمولی مسائل کو نہایت موثر طریقے سے انشاء پردازی کے نمونے پیش کیے۔ ابوالکلام آزاد کے خطوط ''غبار خاطر'' میں انشائیہ کا لب ولہجہ ملتا ہے۔ اس طرح انشائیہ کے مضامین میں اضافہ ہوتا گیا۔ جس طرح ابوالکلام آزاد کی تحریک زور پکڑنے لگی اسی طرح انشائیہ نگاروں اور انشائیوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اسی طرح میر ناصر علی نے ''صلائے عام'' میں بہترین انشائیہ کے نمونے پیش کئے اور انھیں ''خیالات پریشان'' کا نام دیا اور مقبول ہوئے۔ ان کے اس مجموعہ میں انشائیہ کی خصوصیات بھی پوشیدہ ہے۔ مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، مولانا عبدالماجد دریابادی، نیاز فتح پوری، سجاد انصاری کی بہترین تحریریں اور تصانیف دیکھ کر یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ انشائیہ کا مسکن فرانس برطانیہ نہ ہو کر صرف اور صرف ہندوستان ہی ہے اور اردو ہی اس کا اصل مرکز ہے۔

کئی سالوں کا عرصہ گذر جانے کے باوجود بھی انشائیہ کی شبیہ مکمل طور پر سامنے نہیں آئی تھی۔ آزادی کے بعد وزیر آغا نے اُسے واضح کیا۔ اور اس کو نام اور تعارف کے ساتھ اس کی خصوصیت کو پیش کیا۔ وزیر آغا سے پہلے اس صنف کا باقاعدہ نام نہیں تھا۔ اپنی کتاب انشائیہ کے خدوخال میں وزیر آغا تحریر کرتے ہیں:

> ''میں نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک کے عرصے میں ادب لطیف میں متعدد پرسنل ایسے تحریر کئے تھے، جنھیں لائٹ ایسے انشائیے لطیف لطیف پارہ، مضمون لطیف وغیرہ ناموں کے تحت شائع کیا گیا مگر چونکہ ''ایسے'' کے لفظ نے خود مغرب میں بہت ساری غلط فہمیوں کو جنم دیا تھا۔ جنھیں ہمارے انگریزی پڑھانے والوں نے وراثت میں حاصل کیا تھا۔ لہذا میں چاہتا تھا کہ پرسنل لائٹ ایسے کے لئے کوئی نیا اور منفرد اردو نام تجویز کیا جائے ان ہی دنوں میں میں نے بھارت کے کسی رسالے میں ''انشائیے'' کا لفظ پڑھا اور مجھے اچھا لگا کہ میں نے مرزا ادیب صاحب سے جو ان دنوں ''ادب لطیف'' کے مدیر تھے۔

اس نام کو پرسنل ایسے کے لئے مختص کرنے کی تجویز پیش کر دی جسے انہوں نے فوراً قبول کر لیا۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ مجھ سے پہلے ڈاکٹر سید حسنین ''انشائیہ'' کا لفظ لائٹ ایسے کے معنوں میں استعمال کر چکے تھے۔ مگر جن لائٹ ایسوں کے لئے انہوں نے یہ لفظ استعمال کیا تھا وہ سرے سے لائٹ ایسے تھے ہی نہیں''۔ (۱۲)

قابل غور بات یہ ہے کہ اس صنفِ نثر کا نام اور خصوصیات جس نے پیش کیا وہ وزیر آغا ہیں۔ انھوں نے اس صنف کے نام کے ساتھ اسی کے فنی خصوصیات بھی پیش کیں۔ اگر ہم ماضی کے اوراق الٹیں تو آزاد کے ''نیرنگ خیال'' میں کئی جگہ لفظ ''انشاء پردازی'' نظر آتا ہے۔ تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انشاء پردازی کا مخفف ''انشائیہ'' کرنے کا کام وزیر آغا نے کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس صنف کی خصوصیات اور اصول وضوابط وزیر آغا نے ہی پیش کئے اور اسی کے فروغ کے اہتمام کا سہرا ان ہی کے سر جاتا ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہیں کہ وزیر آغا انشائیہ کے موجد نہ ہوتے ہوئے اس کے بنیاد گزار ہیں۔

وزیر آغا کے بعد بیسویں صدی کے چھٹی تا نویں دہائی میں کئی قابل ذکر انشائیہ نگار منظر عام پر آئے اور اردو ادب میں وہ تصانیف ذخیرہ کا باعث بنی۔ پاکستان میں انور سدید، غلام جیلانی اصغر، داؤد رہبر، جمیل آزاد، مشتاق قمر، سلیم آغا قزلباش، انجم انصاری وغیرہ۔ ہندوستان میں یوسف ناظم، ڈاکٹر وجاہت علی سندیلوی، پروفیسر کنھیا لال کپور، شوکت تھانوی، بھارت چندکھنہ، مسیح انجم وغیرہ۔

*****

انشائیہ کا ارتقاء

اردو ادب میں انشائیہ کا ارتقائی سفر بڑا دلچسپ اور کئی سال طویل ہے۔ اردو انشائیہ نے مغربی انشائیوں کے چراغ سے چراغ ضرور جلائے لیکن اس کے اپنے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، اور اردو ادب نے انگریزی انشائیوں سے خوشہ چینی کرنے کے باوجود اپنا رنگ و آہنگ باقی رکھا۔ اردو انشائیہ کی اپنی ایک الگ پہچان ہے، اور انشائیہ کے الگ اصول وضوابط بھی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انگریزی انشائیوں کے مقابلے میں اردو انشائیہ کچھ اور ہی شئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس موقع پر اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اردو انشائیہ نہ تو انگریزی انشائیوں کے جیسا ہے اور نہ ہی اردو انشائیے جیسی وضاحت ہے، نہ یکسانیت ہے اور نہ اردو انشائیہ نگاروں کی طرح انگریزی انشائیہ نگاروں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے مطالعہ کیا ہے کہ انشائیہ کا آغاز کرنے والے مغرب کے مشہور ادیب مونٹین ہیں اس کے علاوہ ڈرائیڈن، بیکن اور برکن ہیڈ بھی انشائیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وقت انشائیہ کی الگ ومنفرد شناخت نہیں تھی اور نہ ہی الگ صنف مگر پھر بھی یہ دوسری اصناف کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔ انشائیہ کے ابتدائی دور میں اسے انگریزی ایسّے کی شکل ہی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود کسی نے نثر کا ٹکڑا کہا، کسی نے گفتگو کہا، آہستہ آہستہ یہ اپنی ہئیت تبدیل کرتا گیا اور اپنی ایک الگ پہچان بنالی۔ یہی وہ فن ہے جس میں سب سے پہلے ملا وجہی نے ''سب رس''، لکھی جس میں تقریباً ۶۱ انشائیہ مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ہر موضوع پر ملا وجہی نے لکھا ہے کسی پہلو کو انہوں نے تشنہ نہیں رکھا۔ اس سلسلے میں محمود شیرانی لکھتے ہیں:

> ''عربی اور فارسی کی کتابوں کے ساتھ مونٹین کی فرانسیسی کتاب ''ایسیز'' کو
> بھی شامل کرلیا جائے تو وجہی کی انشائیہ نگاری اردو کی نمائندگی ہی نہیں کرتی۔
> بلکہ عالمی سطح پر بھی مسلم ہوجاتی ہے''۔ (۱۳)

۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اردو نثر نگاروں نے اپنی پوری توجہ کو مغرب کی تقلید میں صرف کردی اور سادہ طرز نگارش کی طرف اپنی توجہ مرکوز کردی۔ اور تقریباً پچاس نثری کارنامے ادیبوں کی مشترکہ کوشش کے نتیجہ میں منظر عام پر آئے۔ جس کا زیادہ تر حصہ افسانوی ادب پر مشتمل ہے۔ پھر جب فورٹ ولیم کالج ۱۸۲۵ء میں دلی کالج کی شکل میں نمودار ہوا، جس کا مقصد ہندوستانیوں کو انگریزی زبان وادب سے روشناس کرانا تھا تو اس کالج سے سینکڑوں طلباء نے استفادہ کیا۔ جن میں سے کچھ نے آگے چل کر اردو ادب کی پرورش میں

نمایاں حصہ لیا اور انگریزی کے صنف نثر جیسے ناول نگاری و مقالہ نگاری کے چلن کو اردو ادب میں عام کیا۔

اردو میں مقالہ نگاری کا آغاز ۱۸۴۵ء کے اس پاس ہو چکا تھا۔ مگر اس کی مقبولیت کا عہد ۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب کے بعد سے شروع ہوا۔ مقالہ نگاری کا رواج عام کرنے کے لئے دلی کالج کی طرف سے مقالہ نگاری کے مقابلے کا بھی اہتمام ہوا۔ امتحانی پرچوں ''فوائدالناظرین'' اور ''محبت وطن'' جیسے رسالوں کے اجراء اور انجمن دہلی سے سوسائٹی کے قیام نے ماسٹر رام چندر، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، ذکاءاللہ خواجہ ضیاءالدین، بھگوان داس ماسٹر پیارے لال اور موتی لال وغیرہ۔ اردو دوستوں کے ذریعہ مقالہ نگاری کو فروغ دیا۔ اس کے بعد غدر کا سیاسی انقلاب برپا ہوا اور اس کے بعد جرات مند ہندوستانیوں کو تعمیر نو کی فکر لاحق ہوئی تو انہوں نے ذہنی انقلاب برپا کرنے کے لئے دلی کالج کی ابتداء کردہ مقالہ نگاری کا سہارا لیا۔

۱۸۷۰ء میں سرسید احمد خاں انگلینڈ سے ہندوستان واپسی کے بعد اپنا رسالہ تہذیب الاخلاق، جاری کیا۔ اس رسالہ کے ذریعہ مقالہ نگاری کا زور بڑھا اور ساتھ ہی اردو انشائیہ کی داغ بیل پڑی۔ اس زمانے میں سر سید، حالی، ذکاءاللہ اور محمد حسین آزاد نے ایک دو انشائیے بھی لکھے یہ انشائیے اصطلاحی طور پر مکمل انشائیے تو نہیں کہے جاسکتے کیونکہ سنجیدگی کے ساتھ ان میں نصیحت آمیز انداز ہے جو صنف انشائیہ کے منافی ہے۔ لیکن لطائف، طنز و مزاح کے ساتھ انداز بیان کا بے ساختہ پن ان کو انشائیے سے بہت قریب کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں سرسید کا انشائیہ ''بحث وتکرار'' کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''جب کُتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں پھر تھوڑی گنجلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے پھر باچھیں ڈھیل کر کانوں سے جا لگتی ہے اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے داڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عنف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسری سے چمٹ جاتے ہیں اس کا ہاتھ اس کے گلے میں ،اس کی ٹانگ اس کی کمر میں، اس کا کان اس کے منہ میں، اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں، اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر جھنجھوڑا۔ جو کمزور ہوا وہ دم دبا کر بھاگ نکلا۔ نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔'' (۱۴)

مولانا حالی، سرسید کے بہت وفادار اور دانش مند ساتھی تھے۔ حالی ہی وہ شخصیت ہے جنھوں نے اردو

زبان میں واضح نگاری کی ابتداء کی ،فن تنقید کوترقی دی اور تنقید کی نئے نظریات اور اصولوں کو پیش کیا۔مولانا حالی کی کئی تصانیف موجود ہیں جس نے اردو ادب کے ذخائر کو مالا مال کیا ہے، مقالات بھی لکھے۔ان کی ہر تحریر میں خلوص وصداقت کی روشنی موجود ہے۔انداز بیان میں ان کی طبیعت کی سادگی کھینچ کر آ گئی ہے۔ان کے ایسیز میں ''زبان گویا'' اور ''زمانہ'' قابل ذکر ہیں۔جس میں چھوٹے چھوٹے نشتر چھپے ہوئے ہیں۔انداز بیان خطابی ہونے کی وجہ سے اس کی تاثیر میں اضافہ کردیا ہے۔ذیل میں ''زبان گویا'' کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''اے بلبل ہزار داستان سے میرے طوطی سیوا بیان، اے میری قاصد اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتاؤ تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے۔کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزہ ہے۔جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر تو وہی زبان ہے۔کہ بچپن میں کبھی اپنے ادپورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی۔اور کبھی اپنی شوخیوں سے اپنے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔وہی زبان ہے۔کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی۔اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔
> اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک ادنیٰ کھیل ہے۔جس کے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں''۔(۱۵)

مولوی ذکا اللہ اس دور کے نامور ''ایسّے نگار'' ہیں۔ذکا اللہ بیکن کی تحریروں سے بہت متاثر تھے۔ان کا ایک ایسّے بیکن کے ایک ایسّے کا ترجمہ ہے۔اس کے علاوہ ان کا ایسّے یا مضمون ''آگ'' ان کی جدت طبع کی بہترین مثال ہے۔اس ایسّے کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذکا اللہ نے انگریزی کے 'ایسیّ نگاری'' کی پیروی میں کامیاب کوشش کی ہے۔درحال یہ کہ انھوں نے اس میں اپنے معلومات کا ذخیرہ بھر دیا ہے۔لیکن ان کا انداز بیان بہت شگفتہ ہے۔''آگ'' سے اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

> ''آگ ایک عجیب نامبارک اولاد ہے۔پیدا ہوتے ہی ماں باپوں کو کھا جاتی ہے۔جن لکڑیوں کے زناشوئی سے پیدا ہوئی ہے۔انھیں کو جلا کر خاک کردیتی ہے۔اور آگ ماں باپ کو مار کر زندہ رہتی ہے۔آگ ہی ہماری شدمن جاں سوز بھی ہے۔اور دوست دل افراز بھی' وہ گھر گھر مبارک مہمان ہے۔مہربان دوست ایسی کہ ہماری راحت کے لیے ہمارے رنج وتکلیف کو دو رکرنے کے لیے آسائش وآرام کے واسطے شدیا ضرویات زندگی کے لیے رفع

کرنے کے واسطے وہ سامان مہیا کرتی ہے۔ ہمارے چولھے پر ماما گری کرتی ہے۔اپلے کنڈے جلاکر روٹی اور کھانا پکاتی ہے۔آگ ہی نے انسان کو چکانا' سکھایا ہے۔جس کے سبب سے وہ اور حیوانوں سے ممتاز ہوگیا ہے۔

جیسا کہ انسان حیوان ناطق کہلاتا ہے۔ایسا ہی ہر زندہ حیوان ان پر ہنڈیا پکانے کے لئے آگ پر نہیں چڑھاتا ہے۔پرندوں یہ تو حضرت انسان ہی عقل کے پورے ہیں کہ پھونک کر آگ روشن کرتے ہیں۔اور اپنی خوراک پکاتے ہیں۔اوراس کی دھونی سے آنکھوں کو اذیت پہنچاتے ہیں''۔ (۱۶)

محمد حسین آزاد کو انگلش ایسّے نگاری سے بہت لگاؤ تھا اور اردو ایسّے نگاری میں ایک بالکل الگ مقام رکھتے ہیں۔ایسّے نگاری کے بارے میں آزاد نے ''نیرنگ خیال'' کے دیباچے میں اپنا اظہار خیال پیش کیا ہے جس میں انھوں نے انگلش ایسّیز سے اپنی دلچسپی اور لگاؤ کا ذکر کیا ہے۔آزاد نے مشرقی مزاج کے پیش نظر ایسّے نگاری میں تمثیلی رنگ اختیار کیا ہے۔انگلش ایسّے نگاری میں تمثیلی رنگ خصوصیت واہمیت رکھتا ہے۔آزاد نے اپنے ان خیالی مضامین میں انشا پردازی کا کمال دکھلایا ہے۔ان کے انداز بیان کی وجہ سے ایسیز میں لطافت و دلکشی پائی جاتی ہے۔اور تمثیلوں کے ذریعے سے تاریخ' فلسفہ اخلاق وغیرہ کے اہم پہلوں کو پیش کیا ہے۔

محمد حسین آزاد نے ''نیرنگ خیال'' کے خیالی مضامین میں انشاء پردازی کا کمال دکھلایا ہے اور بعض مضامین انشائیہ کے ابتدائی نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔اور ''نیرنگ خیال'' کے تمثیلی اور خارجی رنگ کے وجود آزاد کا شخصی انداز اور دل کی بات کہنے کی تڑپ انہیں انشاء پردازوں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔مندرجہ ذیل اقتباس ان کے خوبصورت انشائیہ ''گلشن امید کی بہار'' سے لیا گیا ہے ملاحظہ فرمایئے:

''میں ایک رات انھیں خیالات میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ انسان کے دل میں شوق کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے جس سے اپنے تئیں آپ دھوکے دیتا ہے اور زمانہ آئندہ پر رنگ آمیزیاں چڑھا کر خود اپنے لیے امید وبیم اور نفع و نقصان کے سامان تیار کر لیتا ہے۔یکا یک آنکھ لگ گئی دیکھتا ہوں کہ میں ایک باغ نو بہار میں ہوں،جس کی وسعت کی انتہا نہیں۔امید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانہ ہے۔آس پاس سے لے کر جہاں تک نظر کام کرتی ہے تمام عالم رنگین و شاداب ہے ہر چمن رنگ وروپ کی دھوپ سے چمکتا،خوش بو سے مہکتا،ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے۔زمین فصل بہار کی طرح گوناگوں سے بوقلموں ہو رہی ہے رنگا رنگ کے جانور درختوں پر چہچہے بھر رہے ہیں''۔ (۱۷)

غالب کے بعد سرسید نے اردو نثر کو نئے راستوں سے آشنا کیا۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید نے جو ''بحث وتکرار'' اور ''امید کی خوشی'' کے ذریعہ انشائیہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ان کی تقلید میں حالی، ذکا اللہ، محمد حسین آزاد، نذیر احمد اور کچھ عرصے بعد فرحت اللہ بیگ نے بھی انشائیے لکھے۔نذیر احمد کا ''کفایت شعاری'' اور فرحت اللہ بیگ کا ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی '' قابل ذکر انشائیہ ہے۔

۱۸۷۷ء منشی سجاد حسین نے ''اودھ پنچ'' اخبار جاری کیا جس کے ذریعہ انشاء پردازی میں ظرافت ومزاح نے جگہ پائی۔

سید ظہیر الدین مدنی نے لکھا ہے:

> ''ادب لطیف کی تاریخ میں شرر کو اس امام اور سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور خلیقی دہلوی وغیرہ کو اس قصر ادب کا ستون تصور کیا جا سکتا ہے۔مگر ان چاروں حضرات کے کارنامے ادب لطیف (بحیثیت صنف) سے زیادہ ایسیّ نگاری (انشائیہ نگاری) سے قریب ہیں۔ان لوگوں نے عموماً انگریزی کے طرز پر ماہرین فن کی طرح ایسیز (انشائیے) لکھے ہیں''۔ (۱۸)

اس دور کے انشاء پردارزوں میں عبدالحلیم شرر کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔اس لئے کہ شرر کے تحریر کا طریقہ شاعری کی طرف زیادہ مائل تھا۔انہوں نے معمولی موضوعات پر کئی مضامین لکھے اور جو کچھ لکھا وہ خوب ہے۔جس کو انشاء پردازی کے اچھے نمونے کہے جا سکتے ہیں۔شرر نے اپنے تاثرات کو قلم برداشتہ ضرور لکھا ہے لیکن ان کے انشائیوں میں بھی علمیت اور نصیحت آموز انداز ملتا ہے۔نیاز کی طرح شرر نے بھی درس عبرت دینے کے لئے عموماً قدرت کا سہارا لیا ہے۔ان کے انشائیوں میں ''سیم سحر''، ''آرزو''، ''غریب کا جھونپڑا'' اور ''زلالہ خودرو''، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

> ''ہم جہاں تک غور کرتے ہیں یہی نظر آتا ہے کہ عالم کی یہ ساری خوبیاں اور دلچسپیاں صرف ہمارے لیے نہیں بلکہ ہماری ذات سے ہیں۔ہم نہ ہوں تو دنیا میں کچھ نہیں عشق کی رونق ہم سے ہے اور بازار حسین کی چہل پہل میں ہماری ہی بے تابیوں اور زندہ دلیوں کی گرمی ہے۔یہ باتیں بھی خیر خیالات اور جذبات کی حد تک محدود ہیں۔اگر واقعات اور موجودات کا مقابلہ کرو تو بھی ہم ہر ایک سے بڑھے ہی رہیں گے۔ہماری ہی صورت اس قابل ہے کہ حسین سے حسین نازنین اس کی قدر کریں۔ہماری ہی سیرت میں یہ کمالات ہیں کہ بڑا سے بڑا عالم دانا اگر ہمارا معتقد ومعترف نہ ہو تو وہ عالم نہیں جاہل ہے۔جس کا

قدرداں اگر ہماری صورت زیبا کی قدر نہ کرے تو سمجھ لو کہ خدا نے اسے ذوق صحیح نہیں دیا۔ وہ معشوق ناز آفریں جسے اپنے حسن و جمال پر انتہا سے زیادہ ناز ہے اگر ہمارے عشق اور ہماری محبت کی قدر نہ کرے تو جانو اس کا سر پھر گیا ہے''۔ (۱۹)

سجاد حیدر کے مجموعہ مضامین ''خیالستان'' میں ''حضرت دل کی سوانح عمری''، ''بھولی بسری یادیں''، ''چاند کی کیفیت''، ''چڑیا چڑے کی کہانی'' اور ''سیل زمانہ'' نہایت شگفتہ انشائیے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم کے انشائیہ ''حضرتِ دل کی سوانح عمری'' کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''میری بساط مٹھی بھر کی بھی نہیں لیکن حسین چیز دیکھی اور بے تاب ہو گیا۔ بانسوں اچھلنے لگتا ہوں، دھڑکنے لگتا ہوں میں کسی سینے میں ہوں اور وہ سینہ کسی لباس میں عبائے تقوی وزہدی میں، غرض میں کہیں چھپا ہوں وہ چیز جسے حسن کہتے ہیں میرے سامنے ہوئی اور از خود رفتہ ہو گیا۔ ایک اور بات ہے جس سے میں اپنے حالات لکھتے ہوئے ہچکچاتا ہوں، میں نے اس دنیا میں آرام نہ دیکھا۔ تکلیف اور درد میری قسمت میں تھا۔ گھلنا، ٹکڑے ہو جانا، میرے نصیب میں تھا اس وسیع دنیا میں ہر شئے عیش میں ہے اور نہیں تو وجہ اس کی کیا ہے؟ یہی کہ جتنی چیزیں ہیں وہ اس چیز سے (اسے نعمت کہوں یا مصیبت) بری ہیں۔ جس سے میرے رگ وریشہ کی ساخت ہے۔ یعنی میں متجسس ہوں وہ نہیں ہیں''۔ (۲۰)

نیاز فتح پوری کے مقالے کی زبان سادہ، سلیس اور رنگین ہے اور طبیعت عربی کی طرف زیادہ مائل نظر آتی ہے۔ ان کے مجموعہ مضامین ''نگارستان'' میں عورت، برسات، ''اپنے چاند اور ایک رقاصہ'' وغیرہ انشائیہ کے بہترین نمونے ہیں۔ مولانا نیاز فتح پوری کا انشائیہ ''عورت'' کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

''پھر جو میں نے قدرت خداوندی کے اس جاذب ترین نمونہ کمال کو اپنے مضمون کا عنوان بنایا تو اس سے یہ مقصود نہیں کہ میں کسی کی دلیل سے اس کا ویسا ہونا ثابت کروں گا۔ کیوں کہ آفتاب روز صبح کو نکلتا ہے اور اس کے طلوع کا اعلان کسی دلیل کا محتاج نہیں، چاند ٹھنڈک پہنچاتا ہے اور وہ تمام حجتوں سے بے نیاز ہے، صبح ہوتی ہے چڑیوں کو کوئی نہیں سمجھا سکتا کہ تمہیں اس سبب سے نغمہ سرائی کرنا چاہیے۔ مگر ہاں سرکار حسن کے سامنے اپنی محبت، کا اعتراف اپنی بے مانگی کا قرار میری عین خواہش ہے''۔ (۲۱)

مولانا خلیقی دہلوی کے ادبی مضامین کا مجموعہ ''ادبستان'' میں ''میرا سفر''، ''حریص رقص''، ''درۂ موت''، اور ''کیف نظر'' معیاری انشائیے شمار کئے جاسکتے ہیں۔ ان سب میں خیالات کی گہرائی کے ساتھ زبان و بیان کی خوبیاں موجود ہے۔

مولانا خلیقی کے انشائیے ''درہ موت'' کا اقتباس دیکھئے۔

''موت کا ہیبت کھلا ہوا دروازہ'' ابتدائے عالم کے دوسرے ہی لمحہ سے شاید کھول دیا گیا ہے۔ اور اب اس کے بند ہوئے متعلق وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ کب ہوگا۔ لیکن یہ امر مسلم ہے کہ لاکھوں ہی اس راہ سے گزر گئے۔ اور جو باقی ہیں۔ ان سب کو بھی اسی راستے سے گزرنا ہوگا۔ مبہم اور واضح معین ہزاروں باتیں اور لاکھوں دلچسپیاں ہیں۔ جو اسی راہ سے گذرے اس کنارے سے وابستہ بیان کی جاتی ہیں۔ اور صورت حال یہ ہے۔ کہ جو ادھر سے ادھر گیا۔ پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ کاش کہ کوئی تو پلٹ کے آتا اور ہمیں اپنے مشاہدہ و سیر کے افسانے سناتا اس سے ہم قطع مسافت کی دقتوں، مصائب کی لذتوں، اور منازل کی صعوبتوں کا اندازہ کرسکتے۔ کسے معلوم ہے۔ کہ وہاں گرمی ہے۔ یا سردی۔ کیسی مخلوق بستی ہے۔ وہ کیا شئے ہے۔ جس سے سب کو نفرت ہے۔ اگر اس کا کچھ ٹھیک پتہ چل جاتا تو زادراہ کی فراہمی، سامان کی ترتیب اور مسافرت کے لوازم دنیاوی میں بہت مدد ملتی۔

''اب وہی اکابر امم ہیں۔ جنھوں نے اپنے ملکات روحی اور حدت الہامی سے اس راہ کے متعلق کچھ اطلاعیں دی ہیں۔ وہی ہمارا جغرافیہ ہے۔ وہی ہماری تاریخ اس سے تقسیم منازل کا پتہ لگتا ہے۔ اور اسی سے صورت قیام معلوم ہوتی ہے۔ مسافرت کے لوازم، اور اس دریا کے رسم ورواج کی کچھ سن گن لگتی ہے۔ تو بھی اسی سے اور یہی ہمارا دین وایمان ہے''۔ (۲۲)

میر ناصر علی بھی انشائیہ نگار ہیں مولانا خلیقی دہلوی سے پہلے کے انشائیہ نگاروں میں ان کا نام ملتا ہے۔ اس دور کے لحاظ سے ان کے انشائیہ مکمل اور معیاری ہیں۔ ناصر علی کے انشائیے ''صلائے عام'' میں ''خیالات پریشاں'' کے عنوان سے شائع ہوئے تھے۔

ناصر علی کا انشائیہ ''چرخ شعبدہ باز'' کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''استاتذہ کے لٹریچر میں آیمان کا ذکر اس کے عدم وجود کے ثبوت میں اس

قدر نہیں ہے۔جس قدر کہ اس کی شعبدہ بازیوں کا حال ہے۔اور آسمان کے عدم وجود سے مجھے بھی بحث ہے۔لیکن اس کی شعبدہ بازیاں واقعی اس قدر مشہور ہیں۔کہ تمام دنیا کے مداری، بھان متی ،بازی گراس کے آگے کان پکڑتے ہیں۔چرخ شعبدہ باز کا یہ ادنیٰ کھیل ہے۔اس کے پٹارے میں سے جسے آسماں کہے آغاز عالم سے خدا جانے کتنے چٹے بٹے نکال چکا ہے۔اور نکالے چلا جائے گا۔بڑے بڑے شعبدہ باز و نظر باز اس کے الٹ پھیر کو نہ سمجھ سکے۔شعبدہ بازی کے کمال میں ہے۔کہ آدھ کی اور دو چار بار۔چرخ شعبدہ باز کو ایک زمانہ گزر گیا۔کہ ہر بچہ کو بوڑھا کر کے دکھا رہا ہے۔مداری دیکھنے کے سوا اور کسی کا کام کے نہیں اور دیکھنا بھی چند ساعت کا، بیان ایک رتی کے برابر دانے سے سر بہ فلک درختوں کے جنگل کے جنگل دیکھ لیجئے۔بہار کو خزاں اور خزاں کو بہار کر دکھانا اس کا معمولی کھیل ہے۔تمام عالم کے بہار نے ایک بار پھر سب کو سبز و سرخ جوڑے پہنا دیئے۔معمولی بازی گر مشکل سے آگ اور پانی کو اکھٹا کر کے دکھاتے ہیں۔عالم اسباب نے نہ صرف آگ اور پانی کو بلکہ ہوا اور خاک اربعہ عناصر کو جمع کر کے بے گنتی پتلے بنا بنا کر دکھا دیتے اور انھیں کو بگاڑ کر بناتا چلا جاتا ہے۔ایک کو مارتا ہے۔تو دو کو جلاتا ہے۔ایک دانے کو زمین میں دباتا ہے۔تو سو اگاتا ہے۔بے جان سے جان دار پیدا کرتا ہے۔اور جاندار کو بے جان کر دیتا ہے''۔(۲۳)

۱۹۱۲ء میں جب ابوالکلام کی صدارت میں ''الہلال'' کا اجراء عمل میں آیا۔اور ابوالکلامی اسلوب نے رواج پایا تو سیاسی موضوعات بھی انشائیے کا عنوان بن گئے۔اس کے بعد سجاد حیدر یلدرم کی قیادت میں پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، امتیاز علی تاج اور فرحت اللہ بیگ جیسے انشاء پردازوں نے سترہویں صدی میں اردو ادب میں ظرافت نگاری کے ساتھ کردار نگاری کو بھی فروغ دیا۔لیکن کردار نگاری انشائیے کا جز و نہیں ہے۔اس لئے ان کے مضامین انشائیہ میں شمار نہیں کئے جاسکتے اور نہ ہی وہ انشائیہ کے اعلیٰ نمونہ کہے جاسکتے ہیں لیکن اردو انشائیہ کی ارتقائی تاریخ کو آگے ضرور بڑھاتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں ظرافت کا پہلو نمایاں ہے۔ناصر علی، نذیر احمد اور نیاز فتحپوری نے فطری منظر کشی کے ذریعہ ایک نئے رجحان کو جنم دیا۔اس کے ساتھ ہی ادب لطیف یا ٹیگوریت کا رواج ہوا۔

اردو نثر کی مختلف اصناف کو ہر دور میں کبھی ترقی تو کبھی بے توجہی ملی اور انیسویں صدی ناول نگاری کے

عروج کا زمانہ تھا۔لیکن بیسویں صدی نے شرر، مہدی افادی، فرحت اللہ بیگ، سجاد انصاری، حسن نظامی، ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کنہیالال کپور وغیرہ انشاء پردازوں کو جنم دیا۔ان میں سے بعض مزاح نگار ہیں، اور بعض طنز نگار اس کے باوجود ان لوگوں کو ادبی کوششوں اور کاوشوں میں انشائیہ کا عنصر بہت زیادہ نمایاں ہے۔ رشید احمد صدیقی، پطرس اور کپور کو اردو کے انشائیہ نگاری کے بہترین اور مایہ ناز رہنما سمجھا جاتا ہے۔اس کے بعد لکھنے والوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، نظیر صدیقی اور احمد جمال پاشا کا نام لیا جا سکتا ہے۔ان تینوں میں اول الذکر دو نام انشائیہ کے لئے نسبتاً زیادہ موزوں ہیں۔

حسن نظامی کے انشائیے اردو انشائیہ کی خصوصیات پر پورے اُترتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں زبان کی سادگی، بیان کی شگفتگی کے ساتھ ہلکا فلسفیانہ رنگ بھی پایا جاتا ہے۔انشائیہ کے موضوعات کو حسن نظامی نے وسیع تر کر دیا۔ان کے مجموعہ مضامین ''سی پارہ دل'' میں الّو، مکھی، دیا سلائی، لائین، اوس اور زلف کا ماجرا وغیرہ اچھے انشائیے کہے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ نہایت شگفتہ اور قلم برداشتہ لکھے ہوئے ہیں۔

مندرجہ ذیل انشائیہ کا اقتباس ''جھینگر کا جنازہ'' سے لیا گیا ہے۔

''میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا، خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ افوہ! اس کی لمبی لمبی مونچھوں کا خیال کرتا ہوں، جو وہ مجھ کو دکھا کر ہلایا کرتا تھا تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی برابری کرتا تھا۔

اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا، اگر دل سے عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں، میں ان کو چاند لگا کر چمکاؤں گا۔

ایک دن اس مرحومہ کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی ایک جلد میں چھپا ہوا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کیوں رے شریر تو یہاں کیوں آیا؟ اچھل کر بولا ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔

سبحان! بھائی کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔ بولا، وہ قرآن نے کدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں، مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں نہ ان پر عمل کرتے ہیں، لہذا وہ بوجھ اٹھانے والے کدھے ہیں جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔

مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دینی جانتا ہے تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی بلاغت سے ایک نئی مثال پیدا کر سکتا ہے کہ انسان مثل ایک

جھینگر کے ہیں جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں۔سمجھتے بوجھتے خاک نہیں''۔(۲۴)

مہدی افادی کے مضامین کا مجموعہ''افادیت مہدی''میں بنت عم،خواب طفلی اور آرزو شباب قابل ذکر انشائیے ہیں۔زندہ دلی، بے باکی اور بے تکلفی ان کے انشائیوں کا نمایاں عنصر ہے۔وسیع النظری اور اظہار بیاں کی جدتوں نے''افادات مہدی'' کو لازوال بنا دیا ہے۔مولانا آزاد کے''غبار خاطر''اور''تذکرہ''میں ان کی انشائیہ نگاری کا فن عروج پر ہے۔ابوالکلام آزاد کے بیان میں فکر کی پختگی،مختلف النوع افکار اور لب ولہجہ کا اعتماد ہے۔ان کے انشائیوں میں ان کے علم وفکر اور زبان دانی کی گہری چھاپ ملتی ہے۔

صدی کی تیسری دہائی میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی۔صنف انشائیہ کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔یہ ترقی پسند تحریک اردو ادب میں ایک انقلابی حیثیت رکھتی تھی۔ترقی پسند تحریک سے وابستہ دانشوروں،ادیبوں،مصنفوں اور شاعروں نے موجود اقتصادی نظام،تہذیبی رویے اور سیاسی ظلم وستم کے خلاف صدائیں بلند کی اور احتجاجی آواز بلند کرتے ہوئے ایک بامقصد اور روشن زندگی کا خواب دیکھا۔مولانا آزاد نے اپنے تحریرات اور تخلیقی افکار واعمال کا رخ سماجی زندگی کو بہتر بنانے،سامراجی طاقتوں کو ختم کرنے اور جدوجہد آزادی جیسے اغراض کی طرف کرلیا۔نتیجتاً رومانیت،ٹیگوریت یا انشائیے لطیف کی شعاعیں مدھم پڑنے لگیں۔چونکہ انشائیہ ایک مزاحیہ اور فنی مقاصد کے لئے تحریر کیا جاتا ہے اس وجہ سے انشائیہ بھی متاثر ہوا۔دراصل ادبی مقاصد انشائیہ کے فنی مقاصد کے برعکس تھے۔اس کے علاوہ لوگ محبوب زندگی پر ردعمل ظاہر کرنے لگے تھے۔مختلف سیاسی،سماجی اور ادبی تحریکوں کے زیر اثر ذہنی ترنگ کے بجائے حقائق کو حقیقت ہی کی کسوٹی پر کھنے پر زور دیا جانے لگا تھا۔اس لیے اس دور میں انشائیہ کی صنف کی اہمیت اور مقبولیت کم ہوگئی۔

پطرس بخاری اردو کے مشہور ظرافت نگار تھے ان کے مضامین کا صرف ایک مجموعہ''پطرس کے مضامین'' کے نام سے شائع ہوا اور مقبول بھی ہوا بعد میں سرکاری ملازمتوں کے مصروفیات کی بنا پر ادبی دنیا کو انہوں نے چھوڑ دیا۔ان کی تصانیف میں نہایت معتدل قسم کی مزاح نگاری پائی جاتی ہے۔اس کے علاوہ متانت وظرافت میں توازن رکھنے کا ایک خاص ہنر رکھتے ہیں۔ذرا سی لغزش سے مزاح وظرافت رکالت اور ابتذال تک پہنچ جاتی ہے۔یا ظرافت کی غیر معمولی زیادتی انسانی نفسیات سے ٹکرا کر طبیعت کو اُکتا دیتی ہے۔لیکن ان کا ہر ایک جملہ جامعیت اور ہمہ گیری کا پیکر ہے۔تازگی اور شگفتگی پطرس کے انداز بیان کی خوبصورتی کو ظاہر کرتی ہے۔ان کے مضامین میں خاص طور پر''کتّے'' کو انشائیہ کا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ان کے قہقہوں میں تنقید اور طنز میں دل کشی ہے۔مندرجہ ذیل اقتباس ان کے انشائیہ''کتے'' سے اخذ کیا گیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

''کل ہی کی بات کہ رات کے کوئی گیارہ بجے جو ایک کتے کی طبعیت ذرا

گدگدائی تو انہوں نے باہر سڑک پر آ کر طرح کا ایک مصرعہ دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلہ میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا، ایک حلوائی کے چولھے میں سے باہر لپکے۔ اور بھنّا کر پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال و مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھے۔ کم بخت بعض تو دو غزلے، سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ آرڈر، آرڈر پکارا لیکن ایسے موقع پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے۔ یہ گھروں کے درمیاں آ کر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے؟''(۲۵)

رشید احمد صدیقی:

رشید احمد صدیقی ۱۸۹۴ء میں ضلع جونپور، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالقدیر محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد جونپور چلے گئے۔ ۱۹۱۴ء میں انٹر پاس کیا۔ ۱۹۱۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۱۹ء میں بی۔اے اور ۱۹۲۱ء میں ایم۔اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی نمایاں حصہ لیتے رہے۔ ڈیوٹی سوسائٹی کے رکن کی حیثیت سے کولکتہ، چٹاگانگ اور برما کا سفر کیا۔ انجمن اتحاد طلبہ کے معتمد اور ''علیگڑھ منتھلی'' کے مدیر رہے۔

رشید احمد صدیقی نے ملازمت کا آغاز علی گڑھ یونیورسٹی ہائی اسکول میں مدرسی سے کیا۔ ۱۹۲۶ء میں لکچرر ۱۹۳۴ء میں ریڈر اور ۱۹۵۴ء میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں سبکدوشی کے بعد جنرل ایجوکیشن کے اعزازی ڈائرکٹر بنا دئے گئے۔

رشید احمد صدیقی کی کتابیں یہ ہیں: ''طنز و مضحکات'' (۱۹۳۴ء)، ''خنداں'' (۱۹۴۰ء)، ''مضامین رشید'' (۱۹۴۱ء)، ''گنجہائے گرانمایہ'' حصہ اول (۱۹۴۲ء)، ''ذاکر صاحب'' (۱۹۴۱ء)، ''سہیل کی سرگزشت'' (۱۹۴۷ء)، ''جدید غزل'' (۱۹۵۵ء)، ''آشفتہ بیانی میری'' (۱۹۵۸ء)، ''شیخ نیازی'' (۱۹۵۸ء)، ''ہم نفسان رفتہ'' (۱۹۵۸ء)، ''خالب کی شخصیت اور شاعری'' (۱۹۶۹ء)، ''ہمارے ذاکر صاحب'' (۱۹۷۳ء)، ''گنجہائے

گرانمایہ'' حصہ دوم (۱۹۷۶ء)، ''دانائے راز اقبال'' (۱۹۹۱ء)، اور ''خطبات رشید صدیقی'' (۱۹۹۱ء)۔

رشید احمد صدیقی کے خطوط بھی انشا پردازی کے نمونے ہیں۔ خطوط کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''خطوط رشید احمد صدیقی'' (۱۹۷۸ء)، ''مکاتب رشید احمد صدیقی'' (۱۹۸۰ء)، ''رقعات رشید احمد صدیقی'' (۱۹۸۱ء)، ''خطوط رشید احمد صدیقی'' حصہ اول (۱۹۸۸ء)، ''خطوط رشید احمد صدیقی'' حصہ دوم (۱۹۹۳ء)۔

سودا اور انشاء نے نظم میں ہجو لکھی لیکن اس کا مقصد محض سیر و تفریح تھا۔ اکبر الہ آبادی نے ظرافت سے اصلاح کا کام لیا ہے۔ رشید صدیقی کے یہاں ظرافت کم اور طنز زیادہ ہے۔ بقول علی عباس حسینی:

> ''رشید صدیقی کا دماغ بھان متی کا پٹارا ہے۔ اس کے اندر سب کچھ موجود ہے۔ اور ایک جنبش قلم میں آسماں و زمین کی مسافت طئے کر جاتا ہے۔ اور کس کس پر اپنا ہاتھ صاف کر جاتا ہے۔ قاری کے دماغ میں ایک کھلبلی مچ جاتی ہے۔ الفاظ کی بازیگری بھی ہوتی ہے۔ اور طنز کی نشتریت بھی وہ سماج کے لئے ایک جراح بھی ہے۔ اور اس کی شخصیت مرہم زخم جگر بھی''۔ (۲۶)

مندرجہ ذیل اقتباس رشید احمد صدیقی کے انشائیے ''ارہر کا کھیت'' سے لیا گیا ہے ملاحظہ فرمائیے:

> ''وہ گلیاں یاد آتی ہے : جوانی جن میں کھوئی ہے''
>
> ''دیہات میں ارہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے۔ جو ہائڈ پارک کو لندن میں ہے۔ دیہات اور دیہاتیوں کے سارے منصبی فرائض، فطری حوائج اور معاشرتی حوادث یہیں پیش آتے ہیں۔ ہائڈ پارک کے خطیب مشہور ہیں۔ لیکن لوگوں کو نہیں معلوم کہ اس کی داغ بیل ہندوستان کے ارہر کے کھیت میں ہی پڑی تھی۔
>
> ''پارلیمنٹ اور کونسلوں کی مہر، ہیر اور چیرز جواب ''رقص پروانہ،، اور،، برخ فشائی شمع'' سے زیادہ گرہی محفل کا باعث تصور کی جاتی ہیں۔ وہ صداہائے بازگشت ہیں۔ جو شاید سب سے پہلے کسی آلہ مکبر الصوت نے ارہر کے کھیت سے بلند کی تھیں۔ ہائٹ پارک کی خوش فعلیاں اکثر آرٹ یا اس کی عریانیوں پر ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن ارہر کے کھیتوں کی عریانیاں اکثر واٹر پولو پر تمام ہوتا ہیں۔ یورپ کی عورتوں کو حقوق طلبی کا خیال بہت بعد میں پیدا ہوا۔ لیکن ارہر کے کھیت میں کتنی گاؤں والیاں مسز پنکھرسٹ گذر چکی ہیں۔ یہ دیہاتیوں کی اسمبلی ہے۔ جہاں عورتوں اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل

ہوتا ہے۔ جتنا ہندوستانی پارلیمنٹ میں اراکین پارلیمنٹ کو۔ دونوں بولتے ہیں،ضد کرتے ہیں، جھگڑتے ہیں، روتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ دیہاتی عورتیں اور بچے کچھ اور مفید کام کرتے ہیں۔ جس سے ان کو اور کھیت دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اور ہندوستانی اراکین پارلیمنٹ وہ کرتے ہیں جس سے ان کو اور ہندوستان دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ایک قضائے حاجت کرنا اور دوسرا نان کوا پریشن''۔ (۲۷)

کنہیالال کپور:

کنہیا لال کپور ۱۹۱۰ء میں ضلع لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کی۔ ایم۔اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔ ڈی۔اے۔وی کالج لاہور میں کمپوزیشن ٹیچر مقرر ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد لاہور چھوڑا۔ ڈی ایم کالج موگا، ضلع فیروزپور میں پہلے انگریزی ادب کے پروفیسر ہوئے پھر پرنسپل بنادئے گئے۔ ۱۹۷۴ء میں ریٹائر ہوئے۔ آخری میں بچوں کے ساتھ پونا منتقل ہوگئے اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے رہے۔ وہیں ۱۹۸۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔

کنہیالال کپور نے ادب اور معاشرے کے اس رویے کو اپنی پیروڈیو کے ذریعہ دلچسپ انداز میں پیش کیا۔ کپور نے اپنی ذہانت کے جوہر نظم اور نثر دونوں میں دکھلائے۔ سات کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ سنگ وحشت، شیشہ، جنگ ورباب، نوک نشتر، بال وپر، نرم وگرم اور گرد کارواں۔

کنہیالال کپور کے طنز ومزاح میں صنف انشائیہ کے خدوخال کافی نمایاں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر آدم شیخ نے لکھا ہے:

''کپور کا عمل سوئفٹ اور میڈیسن کے عمل سے مشابہت رکھتا ہے۔''

مندرجہ ذیل اقتباس ان کے خوبصورت انشائیے ''اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے'' سے لیا گیا ہے۔

''مگر کہاں تک ذکر کیا جائے کہ اپنے وطن میں کیا کیا ہے اور کیا کیا نہیں اپنے وطن میں سرکیں ہیں جن پر رات کو کبھی روشنی نہیں ہوتی اور جن پر دن میں کبھی چھڑکاؤ نہیں ہوتا۔ ایسے جوتشی اور عامل ہیں جنھیں یہ معلوم نہیں کہ آج ہفتے کا کون سا دن ہے مگر جو ہر وقت بتا سکتے ہیں کہ قیامت کب آنے والی ہے۔ ایسی دکانیں جو عین بدرو کے اوپر واقع ہیں، مگر جہاں اشیاء خریدنے میں کسی کو

عذر نہیں۔ایسے مغرب پرست انسان ہیں جو دروازے اور روشن دان بند کر کے اپنی بیویوں کے ساتھ رقص کرتے ہیں۔ایسی کم سن بیوائیں ہیں جنہوں نے اپنے خاوند کا چہرہ تک نہیں ۔۔۔ایسے سیاحت داں ہیں جن کے نزدیک سیاست دانی کا انتہا چرخہ کاتنے میں ہے۔۔۔۔۔اینگلو انڈین مصنفوں کی نظر میں ہندوستان مہاراجوں، ہاتھیوں، اور پیروں کا ملک ہے۔حالانکہ اچھی طرح دیکھا جائے تو یہ نقادوں عذاروں اور کنگالوں کا وطن ہے''۔ (۲۸)

کرشن چندر:

کرشن چندر بنیادی طور پر فکشن نگار ہیں۔اس لیے ان کی تحریریں فکشن کے اصول وضوابط یعنی پلاٹ و کردار اور ماحول کے گرد گھومتی ہیں۔''ہوائی قلعہ' کے اکثر مضامین میں انھوں نے خصوصیات کے فطری امتزاج کو فنی کمال سے استعمال کیا گیا ہے۔ان کا اظہار خیال اور انداز بیان معمولی معمولی موضوعات کو شاندار بنا دیتا ہے۔طنز ومزاح میں ڈوبی ہوئی یہ تحریریں ان کے اسلوب کو ایک نیا لہجہ آہنگ بخشی ہیں۔ہوائی قلعے' فلسفیات' باون ہاتھی' اور مانگے کی کتاب' وغیرہ مضامین میں انشائیے کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔

کرشن چندر کے انشائیے''رونا' کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''مثل مشہور ہے۔کہ رونا اور گانا کسے نہیں آتا؟ کہنے کو تو سچ ہے لیکن جہاں تک اسے کر دکھانے کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس معاملے میں بالکل پھڈی واقع ہوئے ہیں۔''ہم'' سے میری مراد ساری انسانی برادری ہے کبھی آپ نے اس حقیقت پر غور کیا ہے، کہ جوں جوں ہم عمر میں بڑے ہوتے جاتے ہیں۔گانا تو خیر کبھی کبھی سن لیتے ہیں۔اگر کوئی قریب نہ ہوگا بھی لیتے ہیں، جیسے کبھی کبھی نہانے کے کمرے میں یا کسی منان سڑک پر چلتے ہوئے۔لیکن رونا جو ہمارے بچپن کا ایک مرغوب ومحبوب مشغلہ ہے۔اب پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔بڑے ہو کر اسے قریباً قریبا بھلا دیا جاتا ہے۔ابھی کل ہی میرے ایک دوست ذکر کر رہے تھے کہ آخری بار جب وہ روئے تھے۔اس موقع کو اب قریباً دو سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔اس دن میرے ایک قریبی دوست کی موت ہوئی تھی۔پھر میری طرف دیکھ کر ایک آہ بھر کر کہنے آج کل نہ تو کوئی عزیز دوست مرتا ہے۔نہ ہی کسی رشتہ دار کی موت ہوتی ہے۔تاکہ چار آنسو بہا کر جی ٹھنڈا کر لیا جائے۔کبھی کبھی یوں ہی رونے کو جی چاہتا ہے۔لیکن پھر سوچتا ہوں

لوگ کیا کہیں گے''!(۲۹)

ادب کے مذکورہ مصنفین اور ادباء کی تحریروں میں مختلف اصناف پائے جاتے ہیں مگر سب سے زیادہ مقالہ نگاری اور مضمون نگاری نظر سے گزرتے ہیں۔ اس دور میں جبکہ زندگی معاشی نظام کے تابع ہے اور ماحول انتشار اور رواداری سے دوچار ہے اور وقت قلیل اور کار جہاں دراز ہے۔ ایسے دور میں مستقل تصانیف کے مقالہ اور مقالہ نگاری زندگی اور زمانے کے تقاضے پوری کر رہی ہے۔ چونکہ آج ادب، انسانی زندگی کی ترجمانی کر رہا ہے اس لیے ادب کی کسی بھی شاخ کا تجزیہ اور تشریح کرنے سے پہلے رفتار زمانہ کا مفصل جائزہ نہایت ضروری ہے۔ مگر ہم یہاں موجودہ دور کی چند منزلوں کی نشاندہی پر اکتفا کریں گے۔ یہ دور سیاسی سماجی تحریکوں کا دور ہے۔ اگلے دور میں بڑی حد تک ذہنی وفکری تربیت نے جذبہ آزادی کی حرارت سے دلوں کو گرما دیا تھا۔ اور دور تذبذب کا بھی خاتمہ ہو چکا تھا۔

ہندوستان کی تحریک آزادی اور عزم راسخ کا پہلا عملی ثبوت کانگریس اور خلافت کی تحریک تھا۔ حکومت نے اس وقت تو تحریک کو دبا دیا لیکن یہ جذبہ آزادی کو کسی طرح دبا نہ سکی۔ جدوجہد آزادی مہاتما گاندھی کی قیادت میں مستقل اور سنجیدہ طریقے پر جنگ آزادی کا سلسلہ اس کے بعد پچیس سال تک جاری رہا۔ آزادی کے تصور اور حب الوطنی اور قومیت کا جذبہ دلوں میں راسخ کر گیا۔ اور اسی دوران جذبہ آزادی صرف سیاست تک محدود نہیں رہی بلکہ دلوں کی چاہت بن کر ابھر کر سامنے بھی آئی۔ اس نے زندگی اور ادب کے ہر شعبہ کو متاثر کیا۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری موجودہ دور کے اہم مسائل تھے اور اس کی سب سے بڑی مہم یہ تھی کہ ہر جگہ سے غیر ملکی عنصر کو کسی نہ کسی طرح نکالا جائے یہ۔ اور یہی ہمارے مفلسی کے ذمہ دار تھے اور بڑی حد تک مفلسی ہی ہماری محرومیوں کی ذمہ دار ہے۔ ان مسائل نے کسان اور مزدور کو موضوع سخن بنا دیا۔ کسان اور مزدور ساتھ ان کے کئی مسائل بھی سامنے آئے۔ اس کے علاوہ ترقی پسند مصنفین ایک دستور العمل لے کر میدان میں آئے اور ہر شعبہ زندگی کامیابی کی طرف پیش رفت کی اور نوائے وقت اور واحد وقت کے نعرے کو بلند کیا۔ اس مکتب خیال کے لوگوں نے اہل ہند کی تمام کلفتوں کا واحد علاج اشتراکیت کو قرار دیا۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم نے مفلسی اور غلامی و بے بسی کے وہ رنگ دکھلائے کہ آزادی ملک کا جذبہ پکا پھوڑا بن گیا۔ آخر ۱۹۴۷ء کا سال مشروط آزادی تو لایا۔ مگر تقسیم کی وجہ سے ہنگامی حالات بھی رونما ہوئے۔ ہنگاموں نے سیاسی، سماجی، اخلاقی، اقتصادی مسائل پیش کر دیے جو نہایت غور طلب تھے۔

ملک کے تقسیم کے ان حالات نے چند مسائل پیدا کر دیے جس کی وجہ سے ادیبوں اور مصنفین کا ذہن

ایسے مضامین کی طرف متوجہ ہوگیا جو سنجیدہ تھے۔ وہ حالات جس میں کئی مسائل پیدا ہوئے انھیں بڑے بڑے خانوں میں اس طرح تقسیم کیا جاسکتا ہے، جاگیرداری اور کسان، سرمایہ داری اور مزدور، دیہات و دیہاتی، مذہب و سائنس تخلیص اور مساوات، انسانیت اور بربریت، ادراکیت اور جمہوریت، رجعت پسندی اور انتہا پسندی اور اقتصادیات و معاشیات وغیرہ۔ غرض جس طرح ہجر و فراق کے پہلو سے سیکڑوں مضمون اور اسلوب نکل آئے ہیں۔ اسی طرح جذبہ حریت اور انسانیت دوستی سے سینکڑوں مسائل نکل آئے۔ اور یہی تمام مسائل ہمارے ادب کے اہم موضوع بن گئے تھے جو بے حد نازک اور سنجیدہ ہیں۔ ان سینکڑوں موضوعات نے ادب میں تنوع پیدا کر دیا۔ لیکن مختلف سوچ اور مختلف مسائل نکل آئے اور ساتھ ہی مختلف الآراء اور نظریوں سے مسائل نے ایک آپسی اور ذہنی انتشار بھی پیدا کر دیا۔ جہاں ہزار منہ وہیں ہزار باتیں ہیں۔ اسی طرح مختلف قسم کے نقوش ہمارے دل و دماغ پر اس طرح راسخ ہوتے چلے گئے کہ کوئی ایک صاف ستھرا نقش اوپر نہیں آتا۔ سب اپنی سوچ اور عقلی تناسب میں ایک دوسرے کے مخالف ہوگئے اور یہی حال ادب کا ہے۔

دراصل اردو میں انشائیہ نگاری کے آغاز وارتقاء کی تین منزلیں ہیں۔ پہلی منزل وہ تھی جب سرسید نے انشائیہ نگاری کا آغاز کیا تھا۔ لیکن اس وقت اردو ادب میں مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری کے لئے انگلش لٹریچر میں ایک لفظ ہی مشترک تھا اور وہ لفظ ''ایسّے'' تھا۔ اور اس زمانے میں مضمون نگاری اور انشائیہ میں کوئی تخصیص نہیں تھی اور نہ اس میں کوئی فرق سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں محمد حسین آزاد نے بھی مضامین لکھے مثلاً گلشن امید، سیر زندگی، سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ، انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا وغیرہ، اور ان کے مجموعہ مضامین میں ''نیرنگ خیال'' بھی شامل ہیں۔ الطاف حسین حالی نے بھی انشائیے لکھے۔ مثلاً زمانہ، زبان گویا وغیرہ۔ انشائیہ کے حوالے سے جن بزرگوں کا ذکر میں نے مذکورہ جملوں میں کیا ہے۔ اس سے بہت لوگوں کو اعتراض ہوسکتا ہے۔ لیکن کسی قسم کی رائے قائم کرنے سے قبل دو باتوں کو ذہن میں رکھنا مناسب ہوگا۔ پہلی بات یہ کہ انگریزی اصطلاح (Essay) کے مترادف کے طور پر اردو میں مضمون اور انشائیہ دونوں کا چلن تھا۔ دوسری بات یہ کہ مذکورہ ادیبوں کے مضامین، جدید انشائیہ کے نقش اول ہیں۔ نقش اول ان معنوں میں کہ مضامین کا کردار بنیادی تھا۔ ان دونوں باتوں پر غور کرنے سے تصویر بالکل صاف ہوجاتی ہے۔ کہ انشائیہ نگاری اپنے ابتدائی زمانے میں کیا اور کیسی تھی۔

انشائیہ نگاری کی دوسری منزل وہ تھی جب عبدالحلیم شرر، سجاد انصاری، مہدی افادی، میر ناصر علی، خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، مولانا ابوالکلام آزاد، احمد شاہ پطرس بخاری، فلک پیما، کرشن چندر، کنہیالال کپور وغیرہ نے اپنے مضامین میں ظرافت اور طنز و مزاح کی کیفیت پیدا کر کے انشائیہ کی سرزمین کو سرسبز بنایا اور ان میں وسعت کے فطری حقیقت کے نقوش پیدا کیے۔ اگر عبدالحلیم شرر کے مضامین پھول، برسات، کھلتا ہوا پتہ، بزم

قدرت وغیرہ کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہ کتنے دلکش انشائیہ ہیں۔اسی طرح سجاد انصاری کا انشائیہ محاسن و معاصی ہے۔مہدی افادی کا ہم اور ہماری ہستی، زندگی کی شام وغیرہ ہیں۔میر ناصر علی نے انشائی رنگ بھرے ہیں۔عبدالماجد دریا بادی کا جھوٹ میں سچ، الفاظ کا جادو وغیرہ بے حد لطیف انشائیے ہیں۔مٹی کا تیل، دیا سلائی، جھینگر کا جنازہ، الّو مرغ کی اذان، وغیرہ خواجہ حسن نظامی کی مقبول انشائی تحریریں ہیں۔ایک اور ایک چار، بیوی کی آنا خفسانہ، ہونہ ہو، وغیرہ فرحت اللہ بیگ کے انشائیے ہیں۔رشید احمد صدیقی نے چار پائی، ارہر کا کھیت، دھوبی پاسبان وغیرہ کے ذریعہ انشائیہ نگاری کو وہ مقام عطا کیا جس کا جواب ڈھونڈنا مشکل ہے۔

اس دور کے ایسے مضامین جس میں انشائیہ کی خصوصیات ملتی ہیں وہ یہ ہیں جنگ کا اثر اخلاق پر (مولانا ابوالکلام آزاد)، کتّے، سویرے جو کل آنکھ میری کھلی (پطرس بخاری)، گنوار کی دعا، پجاری سے، کچھ جھوٹ کچھ سچ، نئی دکان (عبدالعزیز فلک پیما)، غسلیات، رونا (کرشن چندر)، اخبار بینی، اپنے وطن میں سب کچھ ہے (کنھیا لال کپور)، موٹر سائکل، چھینک (علی اکبر قاصد)، وہ معروف انشائیے ہیں جن سے انشائیہ نگاری کی روایت آگے بڑھی اور انشائیہ نگاری مستحکم ہوئی۔مذکورہ انشائیہ نگاروں کے یہاں جو اسلوب وفکر اور زندگی کی ہمہ ہمی ہے۔اس کے واضح نقوش جدید انشائیہ نگاروں کے تحریروں میں نظر آتے ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے بیشتر مصنفین اور ہندوستان کے چند ناقدین، پہلی اور دوسری منزل کے انشائیہ نگاروں کو انشائیہ نگار نہ تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی ان کو انشائیہ نگار مانتے ہیں۔اور اس پہیلی پر اڑے ہیں کہ وزیر آغا سے انشائیہ نگاری کی شروعات ہوئی ہے۔لیکن یہ بات ذہن نشین ہونی چاہئے کہ کوئی بھی صنف یکا یک وجود میں نہیں آتی بلکہ اس کے وجود میں آنے سے قبل یہ اپنے کئی منزلوں کا سفر طے کرتی ہے۔اس کی مثال کچھ اس طرح ہے کہ ہر چیز اپنی ابتدائی صورت میں ظاہر ہے جیسے ہر چیز کچی وار ہوتی ہے اور ارتقائی مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی پختگی تک پہنچتی ہے۔انشائیہ بھی سرسید کے زمانے میں اپنے ابتدائی مرحلے میں تھی۔پھر رشید احمد صدیقی کے زمانے میں بالغ ہوئی اور وزیر آغا کے زمانے میں جوان ہو کر ہم تک پہنچی ہے۔اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدید انشائیہ نگاری اپنی پہلی اور دوسری صورتوں کی سی ہے صاف ستھری اور سلجھی ہوئی شکل یا اس کی توسیع ہے۔

سرسید نے عام نشریات سے انحراف کر کے جس قسم کی تحریرات کو رواج دیا تھا وہ اپنے زمانے کے لحاظ سے بالکل نئی اور جدید چیز تھی۔دوسری منزل کے مصنفین نے مضامین وانشاء پردازی کے روپ کو بدل کر تحریرات کو ایک نئے احساسات سے دوچار کیا تھا۔اور تخلیقی شعور کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ پہلی صورت کے مقابلے زیادہ واضح، منظّم اور دلچسپ تھا۔تیسری منزل ماقبل صورت سے مختلف ہے۔لیکن اسی کی بنیاد میں انشائیہ کی پہلی دو صورتیں

موجود ہیں۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ جدید انشائیہ میں تحریری اسلوب کا جمال پہلے کے مقابلے زیادہ ہے۔لہذا وزیر آغا نے جدید انشائیے کی تحریک چلا کر انشائیے کے اس روپ کو نکھارا۔اور وہ ماقبل انشائیے کی ہی ترقی یافتہ شکل ہے۔اس لئے جن ناقدین کا یہ کہنا ہے کہ انشائیہ نگاری کی ابتداء وزیر آغا سے ہوتی ہے۔محض جزوی حقیقت ہے، یہ درست ہے کہ جدید انشائیے میں ذہنی خلاقیت کا عمل دخل پہلے کے انشائیوں سے کہیں زیادہ منظّم،موثر وارمعنی خیز ہے۔لیکن وقت کے ساتھ انشائیے میں ہونے والی تبدیلی کے سبب پہلے لکھے گئے انشائیوں کو سرے سے رد کر دینا درست نہیں ہے۔

موجودہ دور میں وزیر آغا،نظیر صدیقی،مشتاق احمد یوسفی اور احمد جمال پاشا کا نام خاص طور سے لیا جا سکتا ہے۔احمد جمال پاشا انشائیہ نگار کم،مزاح نگار زیادہ ہیں۔ان کی تحریریں طنز ومزاح اور شگفتہ ولطیف قدروں سے متاثر ہے۔''ناپسندیدہ لوگ''ان کا ایک اچھا انشائیہ ہے۔مشتاق احمد یوسفی کا اپنا مخصوص لب ولہجہ ہے۔ان کے انشائیوں کی فضا مزاحیہ اور طنزیہ ہے جس میں فکر کی سنجیدگی بھی ہے۔اور تاثرات کی بوقلمونی بھی''صنف لاغر۔ پڑھے گر بیمار''اور''جنون لطیفہ''ان کے کامیاب انشائیے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا بنیادی طور پر ایک نقاد ہیں۔ان کے انشائیوں کے اسلوب میں الفاظ کا رکھ رکھاؤ اور جملوں کا استعمال قابل تحسین اور حسن تحریر کہا جا سکتا ہے۔ پگڈنڈی، دیوار، اور میری چالیسویں سالگرہ، ان کے انشائیوں میں قابل ذکر انشائیے ہیں۔ابھی حال ہی میں ان کے انشائیوں کا مجموعہ''خیال پارے''کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں بعض انشائیے معیار کے اعتبار سے انگریزی انشائیوں کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ وزیر آغا کا انشائیہ''میری چالیسویں سالگرہ''کا خوبصورت اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

> ''میری چالیسویں سالگرہ کی روح فرسا خبر نے میرے احباب کو گویا جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا اور انہوں نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے دیکھ رہے ہوں۔'' اچھا! تو تم بھی متحرک تھے۔تمہارے انداز سے معلوم نہ ہوتا تھا''حضرت''ش'' جو کم از کم تین بار اپنے ہاتھوں آپ ہی خودکشی کی کوشش کر چکے ہیں۔اور پھر بھی شاخ نازک پر بنے ہوئے آشیانے کو ناپائیدار ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔اس خبر کو سنتے ہی آگ بگولہ ہو گئے۔اور ایک آندھی کی طرح چنگھاڑتے ہوئے میرے کمرے میں آدھمکے۔کہنے لگے''یعنی شرم نہیں آتی تمہیں؟ آخر اس میں فخر کی بات ہی کیا ہے؟؟ سمجھا ؤنا! چالیس سال یعنی چار سو اور اسی مہینے، ساڑھے چودہ ہزار دن، تین لاکھ پینتالیس ہزار گھنٹے! دو کروڑ سات لاکھ منٹ، اتنا عرصہ زندہ رہنے کے بعد کیا ابھی تمہیں مزید زندہ رہنے کی حسرت

ہے!'' اور میں اپنی چالیسویں سالگرہ پر ابھی خود کو تازہ اور زندہ محسوس کر رہا تھا۔ مجھے یکا یک اس بات کا احساس ہوا کہ تقدیر نے دھکا دے کر مجھے شانگری لا سے باہر نکال دیا ہے۔ جیسے میرا جسم مٹھی بھر ہڈیوں میں بدل گیا ہے اور اس پر وقت کی لاتعداد جھریاں نمودار ہوگئی ہیں''۔ (۳۰)

نصیر صدیقی کے انشائیوں کا مجموعہ ''شہرت کی خاطر'' ان کی تحریرات پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تحریر، اظہار اور اسلوب میں رشید احمد صدیقی سے متاثر ہیں اور ان کے یہاں اب تک فنی پختگی پیدا نہ ہوسکی ہے۔ ''شہرت کی خاطر'' میں کچھ ایسے انشائیے بھی ملتے ہیں۔ جن کے سرحدیں ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کے مجموعے خیال پارے سے جا ملتی ہیں۔

''اردو انشائیہ کی ارتقائی تاریخ دہرانے کے دوران جن انشائیہ نگاروں کا تذکرہ آیا ہے۔ ان انشائیوں میں مکمل طور سے انشائیہ نگاری کی خصوصیت موجود نہیں۔ پھر بھی ان کو انشائیہ نگار کی حیثیت سے اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ سخت محاسبہ کے بعد اردو انشائیہ کا دربار ہی سنسان نظر آئے گا''۔ (۳۱)

انور سدید:

انور سدید نے صنف انشائیہ کے آغاز سے اب تک اس کے خدوخال واضح کرنے کے لیے متعدد تنقیدی مضامین تحریر کیے اور عمدہ انشائیے تخلیق کئے ہیں۔ انور سدید اپنے موضوع کے ذریعے کائنات کے حقائق بیان کرنے میں ماہر ہیں۔ انکی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ ان کی تحریر قاری کے دل کو متاثر کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس ان کے انشائیے ''مچھر کی مدافعت'' سے لیا گیا ہے۔

''مچھر خون پیتا ہے اس لیے بعض لوگ اسے درندہ کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ پرندہ ہے۔ اور ہمیشہ اپنے پروں سے اڑتا ہے۔ دوسرے طرف حقیقت یہ بھی ہے کہ مچھر کی بہت سی عادتیں انسان سے ملتی جلتی ہیں۔ اس لیے اسے اشرف المخلوقات کہلانے کا حق بھی حاصل ہے۔ مثال کے طور پر انسان کی طرح مچھر بھی ہر وقت پیٹ کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے سرگرداں رہتا ہے۔ افزائش نسل کے اعتبار سے بھی مچھر انسان کے مماثل ہے۔ اور یہ بھی انسان کی طرح فکر و فرد سے آزاد ہو کر بکثرت تخلیق اولاد کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ فطرت نے اس کے ہونٹوں کو خون لگا دیا ہے۔ اس لیے بالعموم شراب کے قریب بھی

نہیں جاتا''۔(۳۲)

ادب کے اصناف کبھی عروج حاصل کرتے ہیں تو کبھی زوال پذیر ہوتے ہیں۔اسی طرح ایک زمانہ تھا کہ اردو ادب میں انشائیہ نگاروں کی بہتات تھی۔پھر ایک دور ایسا بھی آیا کہ صنف انشائیہ کے فن کاروں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد اس صنف سے محبت رکھنے والوں نے اور اس کو اپنانے والوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔خصوصاً ۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۶ء میں جب ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کے مجموعے 'خیال پارہ' اور ''چوری سے یاری'' منظر عام پر آئے تو پاکستان اردو ادب میں ایک ہنگامہ سا برپا ہوا اور پاکستان کے کئی باشعور فن کاروں نے اس صنف کی طرف خاص توجہ دیتے ہوئے اس صنف میں اپنے نت نئے احساسات، تجربات اور مشاہدات کے جوہر دکھلائے جن فن کاروں نے اس صنف کو نئی زندگی اور نئی توانائی بخشی ان میں ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر وزیر آغا، جمیل آزر، شہزاد منیار، حیدر قریشی مشکو، حسین، یاد، غلام جیلانی اصغر، حامد برگی اور سلیم آغا قزلباش، محمد یونس بٹ، رشید احمد گریبی، شہزادہ قیصر، انجم نیازی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

مندرجہ بالا انشائیہ نگاروں کی فہرست میں چند متعدد انشائیہ نگاروں نے اس صنف کو بہت اونچا ہی نہیں اٹھایا بلکہ اسے ان ارتقائی بلندیوں تک پہنچایا ہے جہاں فکر و احساس کی وسعتوں کا نور اور دل و نگاہ کے آفاقی رشتے استوار ہیں۔

۱۹۶۶ء کے بعد پاکستانی ادبی ماحول میں اس صنف کے کئی مجموعہ منظر عام پر آئے ہیں۔خاص طور پر ڈاکٹر انور سدید کا مجموعہ ''ذکر اس پری وش کا'' اور جمیل آذر کا مجموعہ ''شاخ زیتون'' واقعی اس صنف کی مقبولیت، نئی کشادگی، گیرائی و گہرائی اور نئی تجلیاتی شعور کے ضامن ہیں۔

سلیم آغا قزلباش :

سلیم آغا قزلباش ۲۲ر نومبر ۱۹۵۶ء کو مشہور اردو نقاد وزیر آغا کے گھر پیدا ہوئے۔گورنمنٹ کالج لاہور معاشیات سے ایم۔اے کیا۔اورینٹل کالج سے اردو میں ایم۔اے کیا۔اردو افسانے جدید رجحانات کے عنوان سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔وہ طویل علالت کے بعد ۴ر اکتوبر ۲۰۱۸ء میں انتقال کر گئے۔

افسانہ سلیم آغا قزلباش کے تخلیقی اظہار کی اہم ترین صنف تھی۔انگور کی بیل اور صبح ہونے تک ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ہے نا عجیب بات، سرگوشیاں، آمنا سامنا، ایک آواز، جدید اردو افسانے کے رجحانات، نئے انشائیے، نام میں کیا رکھا ہے، مغرب کے انشائیے یہ ان کی تصانیف ہیں۔سلیم آغا قزلباش معروف افسانہ نگار، انشائیہ نگار، شاعر، نقاد اور مترجم تھے۔ان کے انشائیے پر کشش ہوتے ہیں قاری کو اول تا آخر متاثر کرتے ہیں ان

کے انشائیوں میں گہرے معنی پوشیدہ رہتے ہیں۔وہ قاری کو انشائیے کے ذریعہ ہلکے پھلکے انداز میں پندونصیحت کرتے ہیں۔اور قاری ماضی کی سیر کروا کر حال میں لے آتے ہیں۔اسی سلسلے میں ان کا انشائیے ''گلی'' کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''تو میں نے مزید کاروائی کا پروگرام ملتوی کر دیا اور واپس آ گیا مگر واپسی کا سفر جینس بانڈ کی واپسی سے کم مشکل نہ تھا۔جتنا گلیوں کے اندر ''منزل خفی'' پہنچنے میں صرف ہوا تھا اس سے دوگنا وقت ''منزل جلی'' یعنی روڈ تک پہنچنے میں لگا۔وہ دن میرے لئے ''یوم جلی'' مترادف تھا اور یوم چاہے جو بھی ہو رنگ جلی میں دوبالا ہوتا ہے۔مانا کہ آج کل گلی کا کلچر تین منزل رہائشی اسکیم کی طرف تیزی سے ہجرت کر رہا ہے لیکن اصلی اور ملاوٹ سے پاک کلچر ہنوز دستیاب ہے۔پاش علاقہ کا بدیسی طرز بدوباس پوز بیر لپٹا مال ہے۔گلی کا دیسی رہن سہن بلکہ طرز کہن سودیشی گھریلو صنعت کا نمونہ ہے''۔(۳۳)

اکبر حمیدی:

نام محمد اکبر حمیدی تخلص اکبر ہے۔۱۰/اپریل ۱۹۳۵ء کو فیروز والہ ضلع گوجرالولہ میں پیدا ہوئے۔بعد ایم۔اے کے پیشہ تدریس سے وابستہ ہو گئے۔۱۴/ڈسمبر ۲۰۱۱ء کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔اکبر حمیدی شاعر،ادیب،محقق،نقاد اور معروف انشائیہ نگار تھے۔ان کی تحریروں میں قد آدم خاکے کا مجموعہ شہر بدر،جھاڑیاں اور جگنو،آشوب صدا اور ہو کی آگ شعری مجموعے ہیں۔جست بھری زندگی خودنوشت پہاڑ مجھے پہاڑ مجھے پلاتا ہے مضامین کا مجوعہ ہے۔تتلی کے تعاقب میں،جزیرے کا سفر اور اشتہاروں بھری دیواریں۔انشائیوں کے مجموعے ہیں۔ہر اک طرف سے،تلوار اس کے ہاتھ اور عالم امکان وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔

اکبر حمیدی بھی پاکستان کے اہم انشائیہ نگار ہیں۔ان کے انشائیے ''نام بنام''،''پہاڑ مجھے بلاتا تھا'' ماہ نو جواں میں اور ''وال کلاک کے پیچھے'' اور ''زیرو پوائنٹ'' گلبن کے انشائیہ ادبیات شمارہ ۵۴ میں اور ''کاغذی پیرہن'' شمارہ ۳ میں شائع ہوئے ہیں۔اکبر حمیدی وزیر آغا کے رنگ میں انشائیے تحریر کرتے ہیں۔انہیں بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر بہت خوب ہے۔انہوں نے اسلوب اور موضوعات کی سطحوں پر انشائی ادب کو بہت وسعت عطا کی ہے۔اکبر حمیدی کا انشائیہ ''وال کلاک کے پیچھے'' سے اقتباس اخذ کیا گیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

> ''اس سے نفرت تو مجھے شروع سے ہی تھی۔۔بھلا چھپکلی سے محبت کر کون کر سکتا ہے۔خصوصا اس صورت حال میں جب یہ بدشکل اور بدہیت مخلوق بیڈ کے

عین سامنے والی کلاک کے پیچھے رہتی ہواور اپنا رخ زیبا وقت بے وقت ظاہر بھی کرتے رہتی۔میرا خیال تھا کہ وال کلاک کا عقب اس کی عارضی قیام گاہ ثابت ہوگا۔اور میں جلد ہی اس مدمنظر سے نجات حاصل کرلونگا مگر ایسا نہیں ہوا۔اس بدصورت مخلوق کو یہ خوبصورت جگہ شاید کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی ہے''۔۔۔۔ (۳۴)

جمیل آزر:

اصلی نام محمد جمیل قلمی نام آذر کا تعلق راولپنڈی پاکستان سے ہے۔وہ انشائیہ نگار، افسانہ نگار، نقاد اور ادیب ہیں۔ان کی پہلی تحریر ''تخلیقی ادب'' (۱۹۸۰ء)، ''افسانے کے سات رنگ'' (۲۰۱۱ء)، ''اردو کے بہترین انشائیے'' (۱۹۷۶ء)، مرتب، انشائی تنقید، راہ نوردشوق، وقت اے وقت۔(انشائیے) شاخ زیتون (۱۹۸۱ء)، انشائیے، رت کے مہمان (۱۹۹۴ء) انشائیے انشائیہ اور انفرادی سوچ (۲۰۰۴ء)، تنقیدی وغیرہ تصانیف ہیں۔

جمیل آزر پاکستان کے انشائیہ نگار ہیں۔انہوں نے نہ صرف انشائیوں کے لئے زمین ہموار کی بلکہ خوبصورت انشائیے تحریر کر کے مستقبل کے انشائیہ نگاروں کے لئے مثال قائم کی۔ان کی تحریر میں غضب کی گہرائی پائی جاتی ہے۔الفاظ کا انتخاب بہت چن کر کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں ہندی کے الفاظ ملتے ہیں۔ان کے انشائیے قاری کو بہت متاثر کرتے ہیں۔مندرجہ ذیل اقتباس ان کے انشائیے ''شاخ زیتون'' سے لیا گیا ہے۔

''میرا تعلق تو دراصل زیتون کے پیڑوں کے اس جھنڈ سے ہے۔جن کی ناقابل تسخیر کشش مجھے بستر استراحت سے اٹھنے پر مجبور کر دیتی ہے اور میں ان کے پراسرار افسوں کے زیر اثر کشاں کشاں پڑھتا چلا جاتا ہوں۔اپنے آپ کو زیتون کے درختوں کے زیر اثر مابین پا کر ایک نامعلوم ہی روحانی خوشی کے لمس سے آشنا ہوتا ہوں۔میری سوچ کی زبان ان سے ہم کلام ہوتی ہے۔میری روح کے سرتال ان کی روح کے جل ترنگ سے ہم آہنگ ہوجاتے ہیں۔پھر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انکا اور میرا ساتھ بہت ہی قدیم ہے ازل سے ابد تک ہماری روحیں ایک دوسرے کے ساتھ ناقابل بیان میں سرگوشی کرتی ہیں ہم ایک دوسرے کو جانتے اور پہنچانتے ہیں۔ہاں یہ وہی درخت ہے۔جس کا ذکر آسمانی کتابوں میں ملتا ہے''۔ (۳۵)

مندرجہ بالا پاکستانی چند ایک انشائیہ نگاروں کے انشائیوں کا مختصر اقتباس پیش کیا گیا تا کہ یہ اندازہ

ہو سکے کہ پاکستان میں کس قسم کے میلانات اور کیا کیا اسالیب پیش نظر رہے ہیں۔جن سے انشائی ادب فروغ پا رہا ہے۔اور انشائیے کی صنف منزل بہ منزل ترقی کی ہے،اور کر رہی ہے۔دور حاضر میں انشائیہ نگاروں کی بہت زیادہ تعداد موجود ہے۔

ہندوستان میں اس صنف کو اپنانے والوں کی تعداد مختصر سہی لیکن جن فن کاروں نے اس صنف کو سنجیدگی کے ساتھ اپنایا اور سلیقہ سے برتا ہے۔ان میں (دور قدیم میں) وحیدالدین سلیم پانی پتی،خواجہ حسن نظامی،پطرس بخاری اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے نام قابل ذکر ہیں۔جن کے انشائیے زندگی اور سماج کے رشتے،حیات و کائنات کے رابطے،صالح روایاتی اقدار،ادبی کلاسیکی وقار بھرپور چاشنی لیے انشائیہ کی صنف میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔اور دور جدید میں ڈاکٹر وجاہت علی سندیلوی،یوسف ناظم،جاوید وششٹ،احمد جمال پاشا،زینت ساجدہ،رام لال نابھوی،اظہار عثمانی،اقبال مسعود،بھارت چندکھنہ،نریندر لوتھر،مجتبیٰ حسین،مسیح انجم،عاتق شاہ،محمد بدیع زماں،فاضل حسین،عاشق ہرگانوی،رحمت یوسف زائی،عابد معز،اور حلیمہ فردوس وغیرہ نے جدید انشائیے لکھے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔جدید انشائیے کے طور پر جو تحریریں وجود میں آئی ہیں۔ان میں تخلیقی تازہ کاری اور فکر و فرازنگی کے وہ تمام اوصاف موجود ہیں جن سے اردو ادب کی آبیاری ہوتی ہے۔

مندرجہ چند ایک انشائیہ نگاروں کے انشائیوں کا اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔جو جنوبی ہند کے نہیں ہیں۔ تا کہ ان کے اسلوب کا پتہ چل سکے۔

وجاہت علی سندیلوی۔(۱۹۱۴ء):

وجاہت علی یکم/مارچ/۱۹۱۶ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد سندیلہ کے ایک بڑے زمیندار تھے۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔لکھنو یونیورسٹی سے بی۔اے اور پھر دو سال بعد ایل۔ایل۔بی کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں وکالت کا آغاز کیا۔وکالت کا یہ سلسلہ ۹/اکتوبر/۱۹۹۶ء یعنی وفات تک جاری رہا۔آپ کی کل ۵۶ تصانیف شائع ہوئی ہیں۔طنز و مزاح کی ۱۰ کتابیں،افسانے ۵ مجموعے،ناول ایک،شعری مجموعے تین،سیاست پر ایک کتاب،رپورتاژ،اردو تدریس،بچوں کے ادب اور غالبیات پر کتابوں کے علاوہ مقالات پر مشتمل ایک کتاب زیر طبع ہے۔وجاہت علی سندیلوی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔وہ صرف اردو کے ادیب و شاعر ہی نہیں،ہندوستان میں اردو کے مجاہد بھی تھے۔

وجاہت علی سندیلوی کے انشائیے قاری کو بہت متاثر کرتے ہیں۔اول تا آخر ان کے انشائیے میں دلچسپی برقرار رہتی ہے۔سادگی اور شگفتگی ان کے انشائیوں میں بہت پائی جاتی ہے۔وجاہت علی سندیلوی کا انشائیہ

''شرافت'' کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہمارا بزعم خود مہذب اور روایات پرست طبقہ صرف نسبی شرافت کا قائل ہے۔ پیدائشی شرافت پر اس کا ایمان بالغیب اس قدر پختہ ہوتا ہے۔ کہ وہ کبھی خواب و خیال میں بھی اس کفر کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ کوئی نتھو، بدھو، خیر وصرف حلیے اور عادات واطوار کو تعلیق بنا کر شرافت جیسی نعمت خداداد کا حق دار بن سکتا ہے۔ خاندانی شرفا کی رائے میں اگر کوئی کمینہ زبردستی شریف بنے کے شوق میں اپنے اوپر شرافت کے آثار طاری کرتا ہے تو وہ جھک مارتا ہے۔ اور بناسپتی کھاتا ہے۔ مطلب یہ کہ خالص گھی کی قسم کا نہیں، بلکہ زیادہ بناسپتی نسل کا کم ذات شریف ہوسکتا ہے۔ وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ یہ کلجگ کا دور ہے۔ اور اس میں ہر انہونی بات کا ہونا لازمی ہے''۔ (۳۶)

احمد جمال پاشا۔ (۱۹۳۲ء۔۱۹۸۷ء):

احمد جمال پاشا کا اصل نام آغا محمد نزہت پاشا تھا۔ وہ یکم/جون/۱۹۲۹ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے بی۔اے لکھنؤ یونیورسٹی اور ایم۔اے علی گڑھ یونیورسٹی سے کیا۔ بعدازاں صحافت کے پیشہ سے وابستہ ہوئے۔ اچانک دل کا دورہ پڑنے سے ۲۹/ستمبر/۱۹۸۷ء میں اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔

ان کی تخلیقات اہمیت کے حامل ہیں مثلاً ''اندیشہ شہر''، ''ستم ایجاد''، لذت آزاد''، ''مضامین پاشا''، چشمہ حیراں''، ''آثار قیامت'' اور فن لطیفہ گوئی وغیرہ۔ احمد جمال پاشا نے ''لاہور میں تخلیقی وتنقیدی مطالعہ''، ''ادب میں مارشل لای'' اور ''رستم میدان کے میں'' لکھ کر شہرت پائی۔ ان کے اہم انشائیوں میں ''چیخنا''، ''کچھ تنقید کے بارے میں''، ''ہجرت''، ''بے ترتیبی''، ''شور''، ''اصولوں کی مخالفت میں''، ''چغلی کھانا'' اور ''تنہائی کی حمایت میں'' وغیرہ ہیں۔ بیسوی صدی کی ساتویں دہائی میں ان کی تخلیقی صلاحیت اپنے شباب پر تھی۔

احمد جمال پاشا مزاح نگاروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ بہترین انشائیہ نگار بھی ہیں۔ ان کے انشائیے میں سادگی اور تسلسل ہے۔ ان کے انشائیہ شخصی اظہار کی بہترین عکاس کرتا ہے۔ ان کے انشائیے میں شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اس سے متعلق انشائیہ ''بے ترتیبی'' کا اقتباس ملاحظہ فرمائے:

''میرے خیال میں ترتیب جنت کی ہر شے میں ہوگی، اسی لیے اس کی بہترین تعریف ہی ''فردوس نظر'' ہے۔ ترتیب تو آسمانی شے ہوئی۔ جیتے جی اس دینا میں کوئی ترتیب ممکن نہیں انسان فطرت کا تابع ہے۔ نوری نہ ناری۔ یہ بندہ

تو خاکی ہے۔اسی لیے اس کے مزاج و مذاق میں ایک طرح کی انارکی ہے۔انسان اس سلیقے کا دعویٰ کرتا ہے۔بداعمال سے بداعمال بھی نیک اعمال پر ہی زور دیتا ہے۔خدا کے نیک بندوں کی نیکیوں میں بھی اسی کی حسرت تعمیر ہے۔کہ انھیں اس فانی دنیا میں جو شے حاصل نہ ہوسکی کم ازکم اسے عقبیٰ میں حاصل کرلیں''۔ (۳۷)

جاوید وششٹ (۱۹۲۰ء):

جاوید وششٹ کی پیدائش ۲۶/ڈسمبر/۱۹۲۰ء فتح پور بلوج ہریانہ میں ہوئی۔ وہ انشائیہ پرداز، محقق، ادیب اور شاعر تھے۔ان کا انتقال ۳۰ جنوری ۱۹۹۴ء میں ہوا۔ان کی تصانیف روپ رس، غزل رعنا، گل دستہ، مولانا آزاد فکر ونظر کے آئینہ میں، محمد قلی اور محمد ﷺ کا صدقہ، ایک تبسم ایک نظر، دکھنی درپن، قصہ حسن و دل، شعلۂ تشنگی، ہریانوی کے برج میگھ ملھار، ملا وجہی کے انشائیے، ملا وجہی اور انشائیہ پچیسی وغیرہ ہیں۔

جاوید وششٹ ہریانہ کی سرزمین سے انشائیے تحریر فرماتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں الفاظ کا بہترین استعمال ہے۔اس کی اچھی مثال ان کے انشائیہ ''روزن در'' ہے۔اس کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''جب لوگوں نے خانقاہ کے روزن در سے جھانک کر دیکھا کہ صوفی ایک ''فتنہ خانقاہ'' کے ساتھ جسے دیکھ کر۔ع

اک شیخ کے تو ہاتھ سے تسبیح گر گئی خلوب میں محو اختلاط ہے۔تو صوفی رسوا ہوا اور خانقاہ بدنام۔

جب محبت پر پہرے لگ جاتے ہیں۔تو روزن در کا استعمال کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔روزن در سے رقیب نے جھانکا تو دیا بجھا کر روزن در کو اندھا کر دیا۔مگر دیوار کے کان تو بہرے نہیں تھے۔آخیر رقیب نے پازیب کے گھنگھرو کی جھنکار سن ہی لی۔اب تو اس کا کلیجہ منھ کو آنے لگا اور لگا انگاروں پر لوٹنے اور آخر وہ جل بھن کر کباب ہوگیا۔

ع: جل گیا رشک کے مارے پس دیوار رقیب
وصل میں جب ترے پازیب کا گھنگھرو چھنکا''۔ (۳۸)

فکر تونسوی:

فکر تنسوی کا اصل نام رام لال سوہیٹہ تھا۔ان کی پیدائش ۷/۱/اکتوبر/۱۹۱۸ء کونسہ میں ہوئی۔ان کے

والد دھنپت رائے ایک زمیندار چودھری کے منشی تھے۔ ابتدائی تعلیم تونسہ سے حاصل کی۔ میٹرک کے بعد کالج، ملتان میں داخلہ لیا والد کی وفات سے تعلیم ترک کرنی پڑی، تلاش معاش کی فکر میں لگ گئے۔ مختلف رسائل میں کام کرنے کے بعد ''من کی موج'' رسالہ کی ادارت سنبھالی۔ آخری عمر میں فالج کے حملے سے متاثر ہوئی۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۸۷ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ انہوں میں اردو میں ۲۰ اور ہندی زبان میں ۸ کتابیں لکھیں۔ اسی کے ساتھ ہی وہ اخبار اردو ملاپ میں لگا تار ۲۷ سال روزانہ کالم ''پیاز کے چھلکے'' لکھتے رہے۔

ان کے تصانیف یہ ہیں: ہیولے، چھٹا دریا، پیاز کے چھلکے، چوپٹ راجا، فکر نامہ، آدھا آدمی، چھلکے ہی چھلکے، بات میں گھات، گھر میں چور، میں، میری بیوی وارنٹ گرفتاری، ماڈرن الہ دین، ماؤزے تنگ، تیرے نیم کش، ہم ہندوستانی، راجا راج کرے، ڈارلنگ، گمشیدہ کی تلاش۔

فکر تونسوی کو انعامات واعزازات سے بھی نوازا گیا جن کی تفصیل یہ ہے: ۱۹۶۹ء میں شودیت لینڈ نہرو ایوارڈ، ۱۹۷۳ء میں چوپٹ راجا پر یو۔ پی اردو اکاڈمی ایوارڈ، ۱۹۷۷ء میں فکر نامہ پر یو۔ پی اردو اکاڈمی ایوارڈ، ۱۹۸۰ء میں آخری کتاب پر یو۔ پی اردو اکاڈمی ایوارڈ، ۱۹۸۳ء میں میرا کیڈمی ایوارڈ، ۱۹۸۵ء میں آخری کتاب پر پر بنگال اردو اکیڈمی ایوارڈ اور ۱۹۸۷ء میں غالب ایوارڈ دہلی۔

فکر تونسوی پنجاب کی سرزمین سے انشائیے تحریر کرتے ہیں ان کے انشائیوں میں شگفتگی پائی جاتی ہے بات سے بات پیدا کرنے کا انداز بہت خوب ہے۔ ان کے انشائیوں میں شخصی انکشاف بہت ہے۔ جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور بے حد متاثر کرتا ہے۔ ان کے انشائیہ میں طنز کے نشتر مزاح کی چاشنی میں ڈوبو کر چلاتے ہیں۔ ۔فکر تونسوی اچھے صحافی بھی ہیں۔ وہ ایک ادیب شاعر، سوانح نگار، مزاح نگار، بہترین خاکہ نگار اور انشائیہ نگار ہیں۔ انہوں نے کئی ناول اور کئی سفر نامے بھی لکھے ہیں۔ آیئے فکر تونسوی کا انشائیہ ''ایک جیب کترے کی شکایت'' سے اقتباس لیا گیا ہے۔

> ''۔۔۔۔میری تھیوری غلط نکلی تم تو عاشق نہیں صرف رائٹر نکلے۔ نجانے کیا بات ہے کہ آج کل ساری تھیوریاں غلط ہو رہی ہیں۔ خوش لباس انسانوں نے اندر سے پھوکٹ پرزے نکل رہے ہیں۔ عاشقوں کے اندر سے غزل کا ایک آدھ بے وزن شعر نکل آتا ہے۔ تمہاری ڈائری بھی تو اسی طرح ایک وزن شعر ہی تھی۔ میں کہتا ہوں۔ اندر سے بھکاری ہو تو باہر لباس سے بھی بھکاری کیوں نہیں بن جائے۔ تاہم جیب کترے دھوکا نہ کھائیں۔ اگر ہم شرفا کی جیبیں نہ کاٹیں تو پھر کہاں سے کھائیں۔ آج کل کا رواج تو یہی ہے کہ شرفا کماتے

ہیں۔جیب کرتے کھاتے ہیں۔اس لیے اگر تم اپنے آپ کو شرفاء میں شمار کرنا چاہیے ہوتو جیب میں ضرور کچھ نہ کچھ رکھا کرو۔ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم بھی شرفا کے بھیس میں جیب کترے ہو۔

میں نے جب تمہارا بٹوا ٹٹولا ہائے۔۔کن کن تمناوں سے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ تمہارا بٹوا کھولا تھا۔لیکن جب اس میں سے کرنسی نوٹوں کے بجائے کھوٹے سکے یعنی ٹیلیفون نمبر نکلے تو مجھے جتنی فحش گالیاں یاد تھیں تمہاری خدمت میں عرض کر دیں۔گالیاں ختم ہوگئیں۔مگر غصہ ختم نہیں ہوا تو میں نے تمہاری ہی ڈئری میں سے لے کر ایک ممبر پارلیمنٹ کو فون کیا اور کہا۔

''یو شٹ اپ۔مسٹر ایم پی!وہ بولا''اس ذرہ نوازی کی وجہ؟

میں نے کہا''کیوں کہ تم فکر تونسوی کے دوست ہو۔کیا تم اسے اتنی بھی شرم نہیں دلا سکتے۔جیب میں کرسی نوٹ ضرور رکھا کرے دیکھتے نہیں مہنگائی کتنی ہے۔۔۔؟''(۳۹)

فضل حسین:

فضل حسین الہ آباد کی سرزمین سے انشائیے تحریر کر رہے ہیں۔ان کے انشائیہ میں انسباط ہے۔بہت ہی شگفتگی سے طنز کے نشتر مزاح کی چاشنی میں لپیٹ کر چھوڑتے ہیں۔جس سے قاری بہت متاثر ہوتا ہے۔ان کے انشائیہ لکھنے کے فن میں روزمرہ کی باتیں دل کو چھو جاتی ہیں۔ان کا انشائیہ''مانگنے کا فن'' کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

''مانگنے کی ایک نئی اسٹائل کے شکار ہم ابھی حال میں ہوئے۔جب ایک شناسے نے ہم سے کہا''تمہارے پاس دس دس کے دو پانچ پانچ کے چار نوٹ ہوں گے؟ہم نے اپنی جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر ان کی جانب بڑھا دیئے۔۔موصوف نے آنکھوں میں فاتحانہ چمک پیدا کرتے ہوئے ہمارا شکریہ ادا کیا۔اور نوٹ ہمارے ہاتھ سے یوں اُچک لئے جیسے اگر انھوں نے اس عمل میں ذرا بھی تاخیر کی تو نوٹیں۔اپنی اصل جگہ ہماری جیب میں واپس چلی جائیں گی۔اس کے بعد موصوف اس حادثے کو یکسر فراموش کرتے ہوئے۔دیگر لغویات میں مشغول ہوگئے۔کچھ دیر کے بعد ہم نے انھیں پھر اصل بات یاد دلائی کہا''تم نے مجھے بیس کا نوٹ دے دیا۔بیس کا نوٹ؟انھوں نے پوری طرح چونکتے ہوئے کہا۔ہم نے ان سے کہیں زیادہ چونکتے ہوئے

کہا 'ابھی تم نے مجھ سے بیس کا پھٹکر لیا تھا نا؟ اس پر موصوف نے ایک مصنوعی
قہقہہ لگاتے ہوئے فرمایا۔ واہ یار تم بھی بیس روپے کی سخت ضرورت تھی۔ اس
لیے تم سے اس طرح مانگنا پڑا کہ انکار کی ذرا بھی گنجائش نہ رہ سکے''۔ (۴۰)

******

حواشی

(۱) انشائیہ کا فنی سروکار، احمد حسین آزاد، صفحہ۔۲۷۲

(۲) انشائیہ کا فنی سروکار، احمد حسین آزاد، صفحہ۔۲۷۲

(۳) اردو انشائیہ کا ارتقائی سفر، احمد حسین آزاد، صفحہ۔۲۷۲۔۲۷۳

(۴) فنی سروکار، احمد حسین کا اقتباس کو ادب کا مطالعہ، میں اطہر پرویز نے نقل کیا ہے۔ صفحہ۲۷۳۔۲۷۴

(۵) اردو انشائیہ، ڈاکٹر آدم شیخ

(۶) اردو انشائیہ، سوزن کوپر (Suson cooper) پیش لفظ۔انشائیہ نگاری کے پانچ دور۔آدم شیخ۔صفحہ۔۲۶

(۷) فنی سروکار، احمد حسین آزاد مشمولہ اطہر پرویز، ادب کا مطالعہ، صفحہ۔۲۷۴، ۲۷۵

(۸) اردو انشائیہ، سید صفی مرتضٰی، صفحہ۔۱۴

(۹) اردو انشائیہ، سید صفی مرتضٰی، صفحہ۔۱۵

(۱۰) انشائیہ اور انشائیے، محمد حسین، صفحہ۔۸۷

(۱۱) کچھ اردو انشائیہ کے بارے میں، وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، صفحہ۔۲۰

(۱۲) انشائیہ کے خدوخال، وزیر آغا، صفحہ۔۸۴

(۱۳) سب رس، محمود شیرانی، صفحہ۔۳

(۱۴) اردو ایسیز، سید ظہیر الدین مدنی، صفحہ۔۴۱

(۱۵) اردو ایسیز، مولوی الطاف حسین حالی، صفحہ۔۵۳

(۱۶) اردو ایسیز، مولوی ذکا اللہ، صفحہ۔۵۷

(۱۷) انشائیہ اور انشائیے، محمد حسین آزاد، گلشن امید کی بہار، صفحہ۔۹۷

(۱۸) اردو ایسیز، صفحہ۔۱۳۹

(۱۹) انشائیہ اور انشائیے، عبدالحلیم شرر، صفحہ۔۱۰۱

(۲۰) اردو ایسیز، سجاد حیدر یلدرم، صفحہ۔۹۴

(۲۱) اردو ایسیز، عورت، مولانا نیاز فتح پوری، صفحہ۔۸۷

(۲۲) اردو ایسیز، مولانا خلیقی، صفحہ۔۱۱۴

(۲۳) اردو ایسیز، صفحہ، ۸۲۔۸۳

(۲۴) انشائیہ اور انشائیے، خواجہ حسن نظامی، صفحہ۔۱۱۰

(۲۵) انشائیہ اور انشائیے، احمد شاہ بخاری پطرس، صفحہ۔۱۶۶۔۱۶۷

(۲۶) اردو انشائیہ، سید صفی مرتضیٰ، صفحہ۔۱۲۹

(۲۷) انشائیہ اور انشائیے، ارہر کا کھیت، رشید احمد صدیقی، صفحہ۔۱۵۶۔۱۵۷

(۲۸) انشائیہ اور انشائیے، کنہیا لال کپور، صفحہ۔۱۸۹

(۲۹) انشائیہ اور انشائیے، کرشن چندر، صفحہ۔۱۹۲

(۳۰) دو ماہی گلبن، میری چالیسویں سالگرہ، وزیر آغا، انشائیہ نمبر ۲۰۰۱ء

(۳۱) انشائیہ کے فنی سروکار، اردو انشائیہ کا ارتقائی سفر، احمد حسین آزاد، صفحہ۔۲۸۳

(۳۲) دو ماہی گلبن، جنوری تا اپریل ۲۰۰۱ء

(۳۳) دو ماہی گلبن، جنوری تا اپریل، ۲۰۰۱ء

(۳۴) دو ماہی گلبن، اکبر حمیدی، انشائیہ نمبر، ۲۰۰۱ء

(۳۵) دو ماہی گلبن، جنوری تا اپریل، ۲۰۰۱ء

(۳۶) وجاہت علی سندیلوی، شرافت، مشمولہ، انشائیے اور انشائیے، پروفیسر محمد حسین، صفحہ۔۱۹۹۔۲۰۰

(۳۷) احمد جمال پاشا، بے ترتیبی، مشمولہ، انشائیہ اور انشائیے، پروفیسر محمد حسنین، صفحہ نمبر۔۲۴۲

(۳۸) ڈاکٹر جاوید وششٹ، روزن در، مشمولہ، انشائیہ اور انشائیے، پروفسر سید محمد حسنین، صفحہ۔۲۳۱

(۳۹) ماہ نامہ شگوفہ، جیب کترے کی شکایت، فکر تونسوی

(۴۰) ماہنامہ شگوفہ، ستمبر ۱۹۹۴ء صفحہ۔۳۴

*****

باب سوم

ماقبل آزادی اردو انشائیہ

ماقبل آزادی اردو انشائیہ

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کو انگریزی حکومت سے آزادی حاصل ہوئی مگر ساتھ ہی ساتھ ملک کا بٹوارہ بھی ہوا۔ مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان کی مملکت بن گئے اور باقی حصہ موجودہ ہندستان ہے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا حصول آزادی کے وقت ملک میں چھ سو کے قریب راجاؤں اور نوابوں کی چھوٹی بڑی ریاستیں تھیں۔

جنوبی ہند میں ۱۹۵۶ء تک آٹھ ریاستیں تھیں جو ذیل میں درج ہیں۔

۱۔مدراس ۲۔آندھرا ۳۔حیدرآباد ۴۔میسور ۵۔ممبئی ۶۔کوچین

۷۔کوگو ۸۔پانڈوچیری

یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو ملک کی ازسرنو ریاستی تنظیم کی گئی اور سارے ملک کو ریاستوں میں تقسیم کیا گیا۔ موجودہ ہندوستان میں ۲۹ ریاستیں اور چھ مرکزی علاقہ جات واقع ہیں۔ ۱/جون ۲۰۱۴ء تک ہندوستان میں ۲۸ ریاستیں موجود تھیں۔ ۲/جون ۲۰۱۴ء کو آندھرا پردیش کی تقسیم کی وجہ سے اب ہندوستان میں ۲۹ ریاستیں ہیں۔ ۳۰ جولائی ۲۰۱۳ء تک آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ کرن کمار ریڈی نے آندھرا پردیش کی تقسیم کا اعلان کیا ۲/جون ۲۰۱۴ء کو' کے سی آر' کی حکومت تلنگانہ میں قائم ہوئی۔ آندھرا پردیش سے تلنگانہ کو علیحدہ کر دیا گیا۔

موجودہ جنوبی ہند میں پانچ ریاستیں موجود ہیں ٹامل ناڈو، کیرالا، کرناٹک، تلنگانہ اور آندھرا پردیش۔ ۱۹۷۳ء میں میسور ریاست کا نام بدل کر کرناٹک رکھا گیا۔

تامل ناڈو:

اس صوبے کو ۲۳ اضلاع میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کا صدر مقام چینائی۔ چینائی کا قدیم نام مدراس تھا۔ یہاں کی زبان تمل ہے۔ آزادی سے قبل یہاں اردو انشائیہ کی کوئی جھلک نہیں ملتی۔ موجودہ دور میں انشائیہ کا وجود یہاں پر نہیں ہے۔ اس مقام سے کسی بھی انشائیہ نگار یا انشائیہ کی تحریریں نہیں ملتیں۔ جہاں تک ممکن ہے میں نے کوشش کی اور میری کوشش جاری ہے کہ ٹامل ناڈو میں کسی بھی انشائیہ نگار یا انشائیہ کا پتہ ملے۔ میں نے اس سلسلے میں علیم صبا نویدی صاحب سے فون پر بات کی ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ:

''یہاں بہت خاکے لکھے گئے کسی نے انشائیہ نہیں لکھا''۔ (۱)

ہم یہی امید کر سکتے ہیں کہ وہاں کے مقامی ادیب ضرور انشائیہ تحریر کریں گے اور اس صنف سخن کو اپنائیں گے اور بام عروج تک پہنچائیں گے۔

کیرالا:

ہندوستان کے جنوب میں جزیرہ نمائے دکن کے مغربی ساحل کا جنوبی حصہ ہے۔اس کے مشرق میں تامل ناڈو شمال میں کرناٹک اور مغرب کی جانب بحیرہ عرب ہے۔اس صوبے کا صدر مقام تریویندرم (ترونت پورم) ہے۔ یہاں کی زبان ملیالم ہے۔اس صوبے کو ۱۴ اضلاع میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہاں انشائیہ کے خدوخال یا انشائیے نہیں ملتے۔ نہ آزادی سے قبل نہ آزادی کے بعد۔اس علاقے میں اردو ادب برائے نام ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر کے سی عطا اللہ خاں فرماتے ہیں:

''اردو ابھی یہاں پنپ رہی ہے۔ برائے نام لوگ ہی اردو لکھتے ہیں''۔
(۲)

ہم اس علاقے کے حق میں یہ دعا گو ہیں کہ یہاں اردو ادب پھولے پھلے اور ترقی کی منزل طے کریں۔

کرناٹک:

میسور ریاست کا نام تبدیل کر کے کرناٹک رکھا گیا۔کرناٹک ریاست کا صدر مقام بنگلور ہے۔اس ریاست کو ۲۰ اضلاع میں تقسیم کیا گیا۔ یہاں کی زبان کنڑی ہے۔آزادی سے قبل یہاں کوئی انشائیہ کی تحریر نہیں ملتی۔ اس ریاست میں بیدر، رائچور اور میسور اردو کے مرکز مانے جاتے ہیں۔آزادی کے بعد بہت سارے ادیب اور شعرا ء پاکستان منتقل ہو گئے جن میں چند ایک انشائیہ نگار بھی تھے۔سقوط پاکستان کے بعد کے انشائیہ نگاروں کو شامل نہیں کیا گیا۔موجودہ دور میں لکھنے والے یعنی آزادی کے بعد کے انشائیہ نگاروں کے بارے میں اگلے باب میں تفصیل پیش کی گئی ہے۔

سلاطین بہمنیہ نے گلبرگہ میں ۱۳۴۷ء تا ۱۴۲۹ء اور بیدر میں ۱۶۲۹ء تا ۱۵۲۵ء حکومت کی۔اس دور میں گلبرگہ اور بیدر دکنی ادب کے اہم مرکز رہے۔حیدرآباد کرناٹک کے موجودہ اضلاع گلبرگہ، بیدر، رائچور بشمول سقوط حیدرآباد ستمبر ۱۹۴۸ء تک حکومت آصفیہ کے زیر نگیں رہے۔نومبر ۱۹۵۶ء کی لسانی تقسیم کی باعث وہ ریاست میسور (کرناٹک) کا حصہ بن گیا۔

بہمنی سلاطین میں فیروز شاہ بہمنی علم و دانش بلند درجہ پر فائز تھا۔وہ کئی زبانیں جانتا تھا، فارسی کے علاوہ اس نے دکنی میں بھی شعر کہے ہیں۔فارسی میں عروجی اور دکنی میں فیروز تخلص کرتا تھا۔بہمنی دور کے جو ادبی نمونے

دستیاب ہیں ان کا سرمایہ بہت محدود ہے۔حضرت خواجہ بندہ نوازؒ ، فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں ۱۴۰۰ء میں گلبرگہ تشریف لائے۔حضرت کا شمار دکن کے اولین شعراء میں ہوتا ہے۔دکن میں پہلی نعت انہیں کی تحریر کردہ ہے۔انہوں نے ''سہیلا''یعنی خوشی کے گیت بھی لکھے آج بھی روضہ حضرت بندہ نوازؒ میں یہ گیت بند سماع میں گائے جاتے ہیں۔

۱۴۲۹ء میں بہمنی پایہ تخت گلبرگہ سے بیدر منتقل ہوا تو زبان وادب کے شیدائی بیدر میں اکھٹا ہوئے۔ ایرانی شاعر شیخ آزاری نے بہمنی خاندان کی منظوم تاریخ ''بہمنی نامہ'' دکنی میں لکھی۔نظامی بیدریؔ بھی سلطان احمد شاہ بہمنی کا درباری شاعر تھا جس نے ۱۴۲۱ء تا ۱۴۳۵ء کے درمیان رومانی موضوع پر ایک مثنوی ''کدم راؤ پدم را ؤ''لکھی سلطان محمد شاہ اور سلطان محمود شاہ بہمنی کے عہد میں مشتاق اور لطیفی جیسے سخن گو،قصیدہ گوئی اور غزل گوئی میں امتیاز رکھتے تھے۔

ان دونوں کا ہم عصر فیروز تھا۔فیروز ابراہیم قطب شاہ کی دعوت پر گولکنڈہ منتقل ہوا۔گولکنڈہ کے ممتاز شعراء وجہیؔ اور ابن نشاطیؔ نے فیروز کو اپنا اُستاد تسلیم کرلیا۔فیروز کی مثنوی ''پرت نامہ'' اہمیت کی حامل ہے۔شاہ اشرف الدین اشرف بیابانی (پیدائش ۱۴۵۸ء) نے منظوم لغت ''واحد باری'' مرتب کی اور ۱۵۰۳ء میں مثنوی ''نو سر ہار'' تصنیف کی اس کا موضوع شہادت امام حسین اور واقعات کربلا ہے بیدر ہی کے ایک اور شاعر قریشیؔ نے مثنوی ''بھوگ بھل''جو جنسیات کے موضوع پر اردو کی اولین دین ہے۔

سیوا گلبرگہ کا باشندہ تھا اس نے سترویں صدی میں فارسی مثنوی ''روضۃ الشہداء'' کا اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا۔اس نے مرثیے بھی لکھے۔اسی صدی کے ایک اور ممتاز صوفی شاعر حضرت محمود بحری (متوفی ۱۷۱۷ء) گوگی تعلقہ شاہ پور ضلع گلبرگہ کے متوطن تھے۔دکنی شاعری میں مثنوی من لگن، بنگاب نامہ اور غزلیات کا ایک دیوان ان کی یاد گار ہے۔حضرت دریا (رائچور) اور عشقی بیدر کا کلام بھی دستیاب ہے۔

جدوجہد آزادی کے دوران گلبرگہ کے بعض ادباء وشعراء نے ریاست حیدرآباد کی آزادی واستقرائی کی تو بعض نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا۔یہ ادباوشعراء کی کم وبیش گلبرگہ کلب سے وابستہ تھے۔جو ۱۹۴۴ء میں قائم ہوا تھا۔اس ادارے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔اس ادارے سے ابراہیم جلیس، فضل گلبرگوی، سلیمان خطیب، شور عابدی، عثمان صحرائی، حسن خان نجمی، سحر قادری وغیرہ وابستہ تھے اور اس کی ادبی محفلوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔محبوب حسین جگر، لطیف ساجد اور نظر حیدرآبادی کبھی کبھی کلب کی ادبی محفلوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ محبوب حسین جگر نے ابتداء میں شاعری کی اور افسانے بھی لکھے جب انہوں نے صحافت کو اپنایا تو وقف برائے روزنامہ ''سیاست حیدرآباد'' ہوگئے اور بحیثیت نائب مدیر ہوئے اور اس سے اپنی آخری سانس تک وابستہ رہے۔

ابراہیم جلیس انشائیے، خاکے، ڈرامے، صحافتی کالم اور رپورتاژ کے علاوہ ایک ناول (چور بازار) بھی

تحریر کیا۔ وہ ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور لگ بھگ دو درجن کتابیں یادگار چھوڑیں۔ فضل گلبرگوی، نیاز گلبرگوی اور عثمان صحرائی بھی پاکستان منتقل ہو گئے۔ دکن کے ممتاز شاعر سلیمان خطیب کا شعری مجموعہ ''کیوڑے کا بن'' ان کے جلسے اعتراف کی خدمت کے موقع پر ۱۹۷۵ء شائع ہوا۔ شور عابدی کا مجموعی کلام ''خم کاکل'' ان کی وفات کے بعد ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ عثمان صحرائی نے ابتداء میں شاعری کی پھر صحافت کو اپنایا۔ ان کے ہفت روزہ ''ہمدرد'' کو گلبرگہ کے صحافت کا نقش اول قرار دے سکتے ہیں۔ ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی گلبرگہ کلب کا شیرازہ بکھر گیا۔

عصری تحریکوں اور رجحانات نے بھی حیدرآباد کرناٹک کے ادب کو متاثر کیا آزادی سے چند سال قبل دکن میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو اس علاقے کے ادباء و شعراء بھی متاثر ہوئے۔ ابراہیم جلیس، سلیمان خطیب، شور عابدی، رشید جاوید، سید مجیب الرحمٰن، نجم الثاقب شہانہ، مجتبیٰ حسین، وہاب عندلیب، اسمعیل بدر، تنہا تماپوری، حمید الماس، صلاح الدین نیر، محسن کمال، قیصر رزاق، رئیس اختر، قیصر رحمٰن، سلام نورس، جلیل تنویر کی تحریروں میں ترقی پسند خیالات ملتے ہیں۔

جہاں تک فکاہیہ نثر نگاری کا تعلق رہا ابراہیم جلیس، سلیمان خطیب، عاقل علی خاں، زینت ساجدہ، ڈاکٹر لئیق صلاح، مجتبیٰ حسین، حلیمہ فردوس، رؤف خوشتر، ڈاکٹر شمیم ثریا، خالدہ بیگم، منظور وقار اور فاروق نشتر وغیرہ نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔

گلبرگہ، بیدر، اور رائچور کی اپنی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ پہلے یہاں ہندو راجاؤں اور راجواڑے حکومت کیا کرتے تھے۔ پھر یہ علاقے شمالی ہند کے مسلم بادشاہوں کے باجگذار بن گئے جسکی نگرانی کے لئے تاریخ میں ہمیں ملک کافور کا نام ملتا ہے۔ پھر ۱۳۴۷ء میں حسن گنگو بہمنی نے گلبرگہ کو اپنا پایہ تخت بنایا اسطرح ان علاقوں کی عظمت کو چار چاند لگ گئے تقریباً ۸۰ برس بعد فیروز شاہ بہمنی نے احمد شاہ بہمنی کو حکومت حوالے کر دی۔ احمد شاہ نے گلبرگہ کے بجائے بیدر کو پایہ تخت منتقل کر دیا۔ جب بہمنیوں پر زوال آیا تو بریدشاہوں نے بیدر کو پایہ تخت برقرار رکھا کچھ عرصہ مغلوں کے زیر نگیں رہا پھر آصف جاہی حکومت کا پایہ تخت حیدرآباد کے بعد علاقے اس کے زیر نگیں آ گئے ۔ پولیس ایکشن ۱۷/ ستمبر ۱۹۴۸ء کے بعد ریاست حیدرآباد کو انڈین یونین میں شامل کر لیا گیا۔ اور پھر ۱۹۵۶ء میں فضل علی کمیشن کے تحت لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تشکیل دی گئی تو یہ علاقے ریاست کرناٹک کے حصے بن گئے۔ یہ علاقے ریاست کے شمال میں واقع ہیں۔

جنوبی ہند کی پانچ ریاستیں دراوڑی زبانیں بولنے والوں پر مشتمل ہیں۔ بہمنیوں، قطب شاہوں، برید شاہوں اور آصف جاہوں کے عہد میں زبان، تہذیب و تمدن تعلیم معاشرت کے تعلق سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں

فخر محسوس ہوتا ہے۔گلبرگہ اور بیدر کو اولین مرکز کہا جاتا ہے۔گولکنڈہ اور بیجاپور کو علمی ،لسانی ،سماجی وتہذیبی میراث ان ہی دوشہروں سے منتقل ہوئی ۔ جب آصف جاہوں نے حیدرآباد پر اپنی حکومت قائم کر لی یہی وراثت انہیں حاصل ہوگئی۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد تمام چھوٹی ریاستیں ان کی زیرنگیں آ گئیں ۔آصف جاہی حکومتوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر ریاست میسور کو شکست دی۔اس طرح آصف جاہی حکومت اپنی زندگی کے دن ایک سو برس سے زیادہ لمبے کر لئے انگریزوں نے اپنی تہذیب وزبان کے فروغ کے لئے انگریزی کے چلن کو عام کرنا شروع کر دیا۔جس سے ہماری سوچ وفکر کے ڈھانچے منہدم ہو گئے ۔نئی سوچ نئی فکر،تہذیب،تعلیم ،سائنس اورٹیکنالوجی کے اثرات نے پورے ہندوستان کے ساتھ جنوبی ہند کے علاقوں میں پھیل گئی۔آصف جاہوں کی علمی ولسانی سرپرستی نے زبان اورادب کے ساتھ فکروخیال کے سانچوں میں تبدیلی پیدا کی جو زبان نظام الدین بیدری سے ملا وجہی ،نصرتی کی علمی وفکری ضیا پاشیوں سے منور ہورہی تھی ۔سراج ، ولی اور مخدوم محی الدین تک ترقی کی بلندیوں پر پہنچ گئی۔پروفیسر افتخار احمد شاہ اپنے مضمون ''اسالیب نثر'' لکھتے ہیں:

> ''سب رس کو عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر وجہی نے لکھا ہے اس کتاب کو اردو نثر کی اولین کتاب کا شرف حاصل ہے۔ یہ وجہی کی اپنی طبع زاد نہیں ہے۔ اس کتاب میں فتاحی نیشاپوری کی مثنوی ''دستورالعشاق'' (نظم) اور ''قصہ حسن ودل'' کو نثر کے پیرائے میں تمثیل کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔تمثیل انشاء پر دازی کی اس طرز کو کہتے ہیں جس میں کسی نشیب یا استعارہ کو یا انسان کے کسی جذبے مثل غصہ،نفرت،محبت، وغیرہ کو مجسم کر کے یا دیوی دیوتاؤں کے پردے میں کوئی قصہ گھڑ لیا جاتا ہے۔ یہ قصہ صوفیانہ مسلک کا آئینہ دار ہے۔مگر اپنے اسلوب اور بیان میں سب رس ایک کامیاب تمثیل ہے۔اس میں حسن ودل اور عقل ودل کی جنگ کو بڑی کامیاب اور خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔'' (۳)

ہندوستان میں ڈاکٹر جاوید وسشٹ نے ''ملا وجہی'' کو اردو انشائیہ کا باوا آدم قرار دیا ہے اور اسے مونٹین کا اہم پلہ ثابت کیا ہے۔انہوں نے سب رس میں ایسے ۶۱ حصوں کی نشاندہی کی ہے۔جس کی بنا پر انہوں نے یہ لکھا۔

> ''میں ملا وجہی کو اردو انشائیہ کا موجد اور باوا آدم قرار دیتا ہوں اور اس کے ان (۶۱) اکسٹھ انشائیوں کو اردو کے پہلے انشائیے۔۔۔۔اردو کے یہ پہلے ایسے

انشائیے ہیں جو علمی انشائیہ کے معیار پر پورے اترتے ہیں''۔(۴)

ڈاکٹر جاوید وسشٹ نے اپنی دو مطبوعات ملا وجہی کے انشائیے اور انشائیے پچیسی میں صنف انشائیہ کی تعریف اور تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے بیشتر وہی باتیں دہرائی ہے جو پہلے بھی منظر عام پر آ چکی ہیں۔ وہ اردو کا پہلا انشائیہ نگار ''ملا وجہی'' کو تصور کرتے ہیں۔

سب رس میں وجہی نے ۶۱ انشائیے پیش کئے ہیں جن کے بیشتر عنوانات اکہرے مگر انشائیے بڑے تہہ دار ہیں۔ عالمی معیار کے انشائیہ پر بھی یہ پورے اترتے ہیں۔ یہ محض انشائیہ نما تحریریں یا انشائیہ کے اولین نقوش نہیں۔ وجہی کے نابغہ (Genious) ہونے کے ثبوت ہیں انشائیے موضوعاتی اعتبار سے وجہی کے انشائیوں کی کیفیت درج ذیل ہے۔

۱۔ فطرت انسانی سے متعلق ۱۸ انشائیے۔
۲۔ عشق سے متعلق ۱۱ انشائیے۔
۳۔ تصوف سے متعلق ۱۱ انشائیے۔
۴۔ شباہت سے متعلق ۷ انشائیے۔
۵۔ مذہب سے متعلق ۷ انشائیے۔
۶۔ خمریات سے متعلق ۱ انشائیہ۔
۷۔ سماج سے متعلق ۵ انشائیے۔
۸۔ فنون لطیفہ سے متعلق ۱ انشائیہ۔

کل تعداد ۶۱

''وجہی نے ان انشائیوں میں بات سے بات خوب پیدا کی ہے اس کا خیال کہیں مربوط کہیں مختصر کہیں طویل کہیں نا تمام ہوتا ہے اور روزمرہ، زبان و محاورہ کا چٹخارہ الگ جو انشائیے کے رنگا رنگ پھولوں کو ایک رشتہ میں پرو کر، گلا پٹیاں سے نازک ہار تیار کرتا ہے۔ متنوع اور رنگا رنگی چھوٹ ان انشائیوں کو دھنک رنگ بنا دیتی ہے۔ اور ان کا صوتی آہنگ نغمگی کا روپ لیتا ہے۔

سب رس میں موجود انشائیے کے چند عناصر ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں۔ غور فرمائیں۔

''عشق کے شہر میں، پرت کے نگر میں معشوقی وہیچ جو عاشق کون پیارے کر
کے عاشق پر اپکار کرے عاشق کے دل کو گلزار کرے نہ کہ بیزار کرے۔ خوار کر
ے عشق ناپاکاں کنے شراب جاتا تو پاک ہوتا، پاکاں گنے آتا تو پاک ہوتا۔۔۔

شراب حسن کا دینا ہے۔ مئے خانہ عشق کا مدینہ ہے۔ عاشق کی عبادت حسن کا دیکھنا۔ راگ سننا' شراب پینا ہے۔ جوں شراب کا اثر ہوں بادشاہوں کا پیار، ایسے پیاروں کو کیا اعتبار۔ تل میں اُترے تل میں چڑھے''۔ (۵)

یہاں دیکھئے ملا وجہی نے کتنی بے تکلفی و بے باکی سے اپنی بات کو واضح کیا ہے کہ جو انشائیہ کی ایک خوبی ہے۔

کہاوتوں، مقالوں اور حدیثوں آیتوں کے استعمال سے وجہی نے قافیے اور ردیف کو ملحوظ رکھا۔

''بے حد اس کی صفت کوں کا ہے۔ قل اللہ صمد لم یلد ولم یولد''

فارسی میں یوں بولتے ہیں کوڑ پر داٹے ہیں۔ فراموشی جواب اہلیاں خاموشی''۔ (۶)

وجہی کی نثر نگاری میں بھی نظم کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ جس میں انشائیہ کی جھلک موجود ہے۔

۱۔ پیرت پتلی کیوں کھڑتی نانوں کی مستی کیوں چڑھتی

۲۔ باس تے پھول نے شرف پایا باس گئے پھول پھول کہوایا۔ (۷)

''ان حقائق کی روشنی میں ملا اسد اللہ وجہی کو اردو انشائیہ کا موجد اور باوا آدم قرار دیتا ہوں۔۔۔۔ یہ اردو کے پہلے انشائیے ہیں۔ جو عالمی انشائیہ کے معیار پر پورے اُترتے ہیں''۔ (۸)

پروفیسر سید محمد حسنین بھی وجہی کو انشائیہ کا موجد مانتے ہیں۔ لیکن سب رس تمثیلی ہے یہ صوفیانہ علامتی ہے انشائیہ نہیں ڈاکٹر انور سدید کا خیال صحیح ہے کہ ملا وجہی کی تصنیف:

''اردو زبان کے دورِ طفولیت کی کتاب ہے۔ اس کا بوجھل اور مصنوعی اسلوب انشائیہ کے فطری مزاج کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ سب رس ایک صوفیانہ علامتی تمثیل ہے۔ اس کتاب میں انکشاف ذات کا عمل آزمانے کی کوشش نہیں''۔ (۹)

وجہی نے اپنی تحریر کو خوش رنگ اور تازہ پھولوں سے تشبیہ دی ہے اور اس کا موجد بھی بتایا ہے۔ یہ ان کے

جدید خیال اور شگفتہ تحریر کی عکاسی ہے۔ ماہنامہ ادیب میں ڈاکٹر سیدہ جعفر اس طرح تحریر فرماہیں:۔

''وجہی کی تحریریں انشائیہ نہیں انشائیہ نما ہے''۔ (۱۰)

اردو ادب میں تمثیل کا موجد ملا وجہی کو سمجھا گیا ہے۔ تمام نے اس بات کو قبول کیا کہ ملا وجہی نے شگفتگی اور سلاست کا دامن نہیں چھوڑا۔ اس طرح یہ تحریر کسی اور صنف میں نہیں مل سکتی یہ صرف انشائیہ کا میدان ہے جہاں قاری ہموار اور ناہموار راستے پر سفر کے لئے خود کو پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جو انشائیہ کی ایک خاصیت ہے۔

وجہی نے سب رس میں اختصار سے کام لیا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وجہی نے اختصار کی صورت میں ایک نئی صنف کو تحریر کیا ہے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک نئی تحریر کو ایجاد کیا ہے۔ جو انشائیہ کہلائے گی۔ اس سلسلے میں منظر اعظمی کہتے ہیں:

''انگریزی کے واقعہ میں وجہی اس عجلت سے قصے کو آگے بڑھاتا ہے کہ
یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ اس نے دستور عشاق دیکھی ہوگی''۔ (۱۱)

خود ملا وجہی اختصار نویسی کے لیے فرماواں ہے۔

جو بے ربط بولے تو بتیاں پچیس
بھلا ہے اک بیت بولے سلیس

اختصار انشائیہ کی شرط ہے جو ملا وجہی کی تحریروں میں شامل ہے۔ اس خوبی کے لئے ملا وجہی کی تحریروں میں انشائیہ کی جھلک موجود ہے۔

انشاء کے معنی یہ ہیں کہ بات سے بات پیدا کرنا' ایک اچھے انشائیہ نگار کی پہچان یہی ہے۔ وجہی ''سب رس'' کے متعلق یوں کہتے ہیں:۔

''اگر کسی میں سخن شناسی ہو را سراردانی ہے تو یہ کتاب گنج العرش بحر المعانی
ہے۔ جیتا کوئی طبیعت کے کواڑ کھولے گا۔ اس کتاب میں نین سو بات کو کیا
بولے گا۔ جو کچھ آسمان ہور زمین میں ہے سو اس کتاب میں ہے۔ جو کچھ دنیا ہور
زمین میں ہے سو اس کتاب میں ہے''۔ (۱۲)

وجہی کی اس تحریر میں سب رنگ شامل ہیں جو انشائیہ کے لیے ضروری ہے۔ بات سے بات پیدا کرنا۔ لفظوں کا حسن، بے باک اور آزاد خیالی، انداز فکر اور تخیل کی پرواز، نئے نظریے سے دیکھنے کی کوشش سب رس میں موجود ہے۔ یہ تمام خوبیاں سب رس کو شاہکار کا درجہ عطا کرتے ہیں اور وجہی کو انشائیہ کا موجد قرار دیتے ہیں۔

تلنگانہ اور آندھرا پردیش:

آندھرا پردیش کو ۲۳ اضلاع میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کا صدر مقام حیدرآباد ہے۔ ہمیشہ سے ہی حیدرآباد دکن کا علاقہ رہا ہے جو اردو ادب کا مرکز کہلاتا تھا۔ آج بھی اردو ادب کا مرکز ہے۔ ۲/جون ۲۰۱۴ء کو آندھرا پردیش سے تلنگانہ کو علیحدہ کر دیا گیا۔ اب تلنگانہ ایک علیحدہ ریاست ہے یعنی ہندوستان کی ۲۹ ویں ریاست مانی جاتی ہے۔ اس میں تقریباً ۱۳ اضلاع ہیں۔ تلنگانہ کا صدر مقام حیدرآباد ہے۔ آزادی سے قبل یہ دکن کہلایا۔ اس کی پانچ ریاستیں تھی۔ یہاں انشائیہ کی تحریک شروع کرنے والے ادیبوں میں ملا وجہی کا نام ملتا ہے۔ ملا اسد اللہ وجہی،، عبداللہ، قطب شاہ کی فرمائش پر 'سب رس' داستان تحریر کی۔ ملا وجہی کی سب رس ایک تمثیلی داستان ہے۔ اس میں انشائیہ کی جھلک ملتی ہے نا کہ یہ مکمل انشائیہ ہے بلکہ انشائیہ کے ابتدائی نقوش اس صنف میں دکھائی دیتے ہیں۔ ملا وجہی کا نیا طرز تحریر ہے جسے وہ پہلی بار دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے اسی نئی طرز تحریر کو وہ نام تو پیش نہ کر سکے جسے بعد میں ''انشائیہ'' کا نام دیا گیا۔ جس طرح مغرب میں مونٹین کی ایک الگ تحریر تھی اسی طرح وجہی شعوری طور پر سامنے آئے۔

آندھرا پردیش ملک کی پہلی ریاست تھی جسے یکم نومبر ۱۹۵۶ء میں لسانی بنیادوں پر تشکیل دیا گیا۔ اور اس میں سابق آندھرا پردیش ریاست اور حیدرآباد اسٹیٹ کے علاقوں کو شامل کرتے ہوئے نئی ریاست تشکیل دی گئی۔ ۱۹۵۳ء میں آندھرا ریاست کو اس وقت کی مدراس پریسڈنسی سے علحدہ کرتے ہوئے کرنول اس کا دارالحکومت مقرر کیا گیا بعد میں آندھرا اور حیدرآباد کرتے ہوئے اسٹیٹ کے تلگو بولنے والے عوام کے لئے ایک ریاست کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ۱۹۵۶ء کے آندھرا پردیش کا جنم ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں ہی حیدرآباد اسٹیٹ کے علاقوں کو آندھرا اسٹیٹ کے ساتھ ضم کرنے کی تجویز پیش کی گئی اور حیدرآباد اسٹیٹ کے چیف منسٹر بی رام کرشنا راؤ نے کانگریس ہائی کمان کی اس تجویز کی تائید کی جبکہ تلنگانہ علاقہ سے اس کی مخالفت کی جارہی تھی انضمام کی تجویز قبول کرتے ہوئے آندھرا اسٹیٹ اسمبلی میں ۲۵/نومبر ۱۹۵۵ء کو قرارداد منظور کرتے ہوئے تلنگانہ کے مفادات کی تکمیل کا وعدہ کیا گیا۔ ۲۰/فروری ۱۹۵۶ء کو تلنگانہ اور آندھرا قائدین کے درمیان انضمام کا معاہدہ کیا گیا اور تلنگانہ کے مفادات کے تحفظ کے وعدے کئے گئے۔ اس سلسلے میں دونوں علاقوں کے چیف منسٹر پی گوپال ریڈی اور بی رام کرشنا راؤ کے درمیان بھی معاہدہ پر دستخط کے گئے۔ تلنگانہ ریاست کے دارالحکومت شہر حیدرآباد کو ریاست آندھرا پردیش کا دارالحکومت مقرر کیا گیا۔ آندھرا پردیش کی تشکیل کے ۱۳ برسوں تک سارے معاملات خوش اسلوبی کے ساتھ چلتے رہے۔

تاہم ۱۹۶۹ء میں تلنگانہ عوام نے شریفانہ معاہدے اور دیگر وعدوں کی تکمیل میں ناکامی کا اثر عائد کرتے ہوئے علحدہ ریاست کی مانگ کی اس وقت کے صف اول کے رہنما ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے تلنگانہ پرجا سمیتی قائم کرتے ہوئے تحریک کی قیادت کی۔ اسی دوران علحدہ تلنگانہ کی تحریک شدت اختیار کر لی اور تشدد میں ۳۵۰ سے زائد افراد ہلاک ہوئے۔

۱۹۷۲ء میں آندھرا اور رائلسیما علاقوں میں جئے آندھرا تحریک کا آغاز ہوا جو تلنگانہ تحریک کے جواب میں شروع کی گئی تھی۔ سرکردہ قائدین جیسے کہ وینکٹ رتنم، ٹی وشوانا دھم اور گوتو لچنا نے جئے آندھرا تحریک کی قیادت کی۔ بی جے پی کے موجودہ سینئر قائد ایم وینکیا نائیڈو نے بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ۲۱/ ستمبر ۱۹۷۳ء کو مرکزی حکومت کے ساتھ معاہدہ کے ذریعہ 6 نکاتی فارمولا کو تقویت دی گئی۔ جس میں دونوں علاقوں میں مساوی انصاف کی بات کی گئی۔ دونوں علاقوں کے قائدین نے مستقبل میں اس طرح کے کسی بھی ایجی ٹیشن کو روکنے سے بھی اتفاق کیا۔ قانونی مسائل سے بچنے کے لئے دستور میں ۳۲ ویں ترمیم کے ذریعہ 6 نکاتی فارمولہ کو قانون موقف دیا گیا۔ اس کے بعد ہی آندھرا پردیش میں امن بحال ہوا اور وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوگیا۔

۱۹۹۹ء تک بھی کسی بھی علاقہ سے تقسیم کی مانگ نہیں کی گئی۔ تاہم ۱۹۹۹ء میں اس وقت کے قائد اپوزیشن وائی ایس راج شیکھر ریڈی نے علحدہ تلنگانہ کی تحریک کو ہوا دی اور تلنگانہ سے تعلق رکھنے والے کانگریس ارکان اسمبلی کو علحدہ تلنگانہ تشکیل کے حق میں کانگریس ہائی کمان کو مکتوب روانہ کرنے کی تائید کی۔ تلنگانہ تحریک میں اس وقت ایک نئے باب کا اضافہ ہوا جب کے چندر شیکھر اراؤ نے تلگودیشم پارٹی سے علحدگی اختیار کرتے ہوئے ۲۷/اپریل/۲۰۰۱ء کو تلنگانہ راشٹرا سمیتی قائم کی۔ ٹی آر ایس کے قیام کے بعد سے علحدہ تلنگانہ تحریک نے کئی نشیب و فراز دیکھے۔ تاہم ۲۰۰۹ء میں اس وقت دوبارہ شدت پیدا ہوگئی جب چندر شیکھر راؤ نے تلنگانہ کے حصول کے لئے مرن برت کا آغاز کر دیا۔ اکتوبر ۲۰۰۶ء میں تحریک کو اس وقت تقویت حاصل ہوئی جب تلگودیشم پارٹی نے اپنا وقف تبدیل کرتے ہوئے ریاست کی تقسیم میں پارٹی مفادات کی تکمیل کے لئے ایک سیاسی فیصلہ لیا۔ ٹی آر ایس نے ۲۰۰۹ء میں تلگودیشم کے ساتھ انتخابی مفاہمت کی جس سے علحدہ ریاست کی تحریک کو کسی قدر دھکا لگا۔ ستمبر ۲۰۰۹ء میں اس وقت کے چیف منسٹر وائی۔ ایس راج شیکھر ریڈی کی ہیلی کاپٹر کے حادثہ میں اچانک موت کے بعد ۲۹/ نومبر ۲۰۰۹ء کو کے سی آر نے مرن برت کے آغاز سے سارے تلنگانہ میں پر تشدد احتجاج شروع ہوگئے۔ جس کے دباؤ میں مرکز نے ۹/ ڈسمبر ۲۰۰۹ء کو تلنگانہ ریاست کی تشکیل کا عمل شروع کر

نے کا اعلان کیا۔

اس اعلان کے ساتھ ہی سیما آندھرا علاقوں میں جوابی ایجی ٹیشن کا آغاز ہوا اور عوامی نمائندوں نے اجتماعی طور پر اپنے استعفیٰ پیش کر دیا۔ اس صورتحال سے پریشان مرکزی حکومت نے ۲۳/ڈسمبر ۲۰۰۹ء کو تشکیل تلنگانہ کا عمل روکنے کا اعلان کیا مرکز کی جانب سے اعلان سے انحراف کے بعد تلنگانہ تحریک نے زبردست شدت اختیار کر لی اور آخر کار کانگریس ورکنگ کمیٹی اور یو پی اے رابطہ کمیٹی نے ۳۰/جولائی ۲۰۱۳ء کو علحدہ تلنگانہ ریاست کی تشکیل کا فیصلہ کیا۔

اس کے بعد مرکزی کابینہ نے بھی ریاست کی تقسیم کی تجویز کو منظوری دیدی ۔تلنگانہ مسودہ بل صدر جمہو ریہ کی جانب سے اسمبلی کی رائے حاصل کرنے کیلئے روانہ کیا گیا ہے۔اور ۱۳/جنوری کے اسمبلی اجلاس میں اس پر مباحث کیے گئے ۔صدر جمہوریہ مسودہ بل کو ضروری ترمیمات کی تجویز کے ساتھ دوبارہ مرکزی حکومت کو روانہ کیے۔ جہاں بل کو قطعیت دی گئی اور پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔اور ۲۰۱۴ء میں ملک کی ۲۹ ویں ریاست تلنگانہ قائم ہوگئی۔

ہندوستان کی ۲۹ ویں ریاست تلنگانہ کا قیام ۲ جون ۲۰۱۴ء میں عمل میں آیا اور کے سی آر کی حکومت قائم ہوئی۔

مولوی عزیز مرزا:

مولوی عزیز مرزا کی پیدائش ۱۸۶۴ء میں ہوئی۔ جامعہ اردو علیگڑھ یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ وہ اس زمانہ کے قابل اور مشہور طالب علم تھے۔انہوں نے انگریزی ادب اور تاریخ جیسے مضامین میں اعزاز حاصل کیا۔ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد میں منتقل ہوئے اور یہی کے ہو کر رہ گئے۔حیدرآباد کے معروف امیر سر آسمان جاہ کر وزیر اعظم مقرر ہوئے۔اس کے بعد پرسنل سکریٹری کی حیثیت سے خدمت سرانجام دیں۔ بعد از وہ سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔اس کے بعد ۱۹۰۹ء میں حسن وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ بعد ازاں آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔مولوی عزیز مرزا عربی، فارسی اور انگریزی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ان کے ادبی ذوق نے ان کو مقبول و معروف کیا۔انہوں نے اپنے ادبی صلاحیتوں سے اپنا لوہا منوایا۔وہ اردو کے بہت اچھے خطیب مانے جاتے ہیں۔ان کی تصانیف و تالیف حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔گلگشت فرنگ: نواب فتح نواز جنگ مولوی مہدی کے حسن کے انگریزی صفحہ نامہ انگلستان کا ترجمہ ہے۔

۲۔ بہ سیرۃ المحمود: شاہانِ بہمنی کے مشہور وزیر خواجہ عماد الدین محمود گاواں کے حالات زندگی سے موسوم

ہے۔

۳۔ وکرم اروسی: کالی داس کے مشہور ڈرامہ کا ترجمہ جس کے شروع میں فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں سنسکرت ڈرانہ کے اصل نوعیت کے متعلق بہت سی کارآمد باتیں تحریر ہیں۔اس کے علاوہ ان کے مضامین، ''خیالات عزیز'' کے نام سے جرائد اور اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔انہیں ادبی ذوق کے علاوہ پرانے سکّے جمع کرنے کا بہت شوق تھا ان کا یہ شوق اعلی درجہ کا مانا جاتا ۱۹۲۱ء میں اس دنیا سے رحلت پائی۔

عزیز مرزا کا تحریری اسلوب نہایت ہی سلیس اور دلکش ہے۔ بے جا لفاظی اور طوالت سے محفوظ رہتے تھے۔ان کا شمار اس دور کے نثر نگاروں میں کیا جاتا تھا۔انہیں تاریخی ادارات اور قدرتی مناظر کی خصوصیات کو بیان کرنے میں کمال حاصل تھا۔علیگڑھ کی تعلیم وتربیت کی وجہ سے انہوں نے اپنی نثر کو شگفتہ بیانی، فطرت پرستی سے مالا مال کیا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد اسداللہ اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''مولوی عزیز مرزا کی شگفتہ تحریریں اپنے معروض پر تبصرہ کا انداز لئے ہوئے ہیں۔اس تاثر میں قلم کار کی شخصیت بھی نمایاں ہوئی ہے ان کے مضمون وغیرہ کا عنوان ہی اچھوتا ہے۔اس میں جہان نو کی دریافت کی سعی موجود ہے''۔ (۱۳)

عزیز مرزا کے انشائیہ ''وغیرہ'' کا مختصر اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''خدا عربی زبان کا بھلا کرے کہ ہم کو ایک عجیب جامع لفظ مل گیا جہاں تفصیل کی پیچیدگیوں میں الجھن ہوئی یا حافظے نے بے وفائی کی اور ایک ہی لفظ میں مشکلیں حل ہوگئی''۔
>
> یہ ایک لفظ زبان پر آیا دنیا بھر کے جھگڑوں سے نجات ملی۔
>
> لفظ کا ہے کو ہے کوہ ہمالہ ہے کہ اپنے فراخ دامن میں ایک پوری دنیا کو لئے ہوئے ہے''۔ (۱۴)

عزیز مرزا کا اسلوب بیانیہ سادہ اور سلیس ہے۔بیجا لفاظی سے پرہیز کرتے ہیں۔انشائیہ کی فضاء ہلکی پھلکی اور شگفتہ پائی جاتی ہے۔ان کی تحریروں میں علمی سنجیدگی ہے۔تلمیحات کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔عزیز مرزا کے انشائیوں میں فطرت سے گہری وابستگی کا ثبوت ملتا ہے۔ڈاکٹر حفیظ قتیل نے حیدرآباد سے مختلف اصناف ادب کا انتخاب پیش کرتے ہوئے جب اپنی کتاب ''روح ادب'' تحریر کی تو ان کے ''بیانیہ انشائیہ''، ''سوتاڑہ'' کو شامل کیا۔مندرجہ ذیل اقتباس ''سوتاڑہ'' سے اخذ کیا گیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

''بہارستان فطرت میں پہاڑوں کا ایک عجیب مرتبہ ہے' کیسا ہے معمولی منظر ہو' لیکن اگر وہ کسی اونچے پہاڑ پر منتہی ہوتا ہے تو اس میں عجیب دل فریبی پیدا ہوجاتی ہے' دور سے سرسبز سر بفلک کشیدہ پہاڑ نظر آ کر مردہ دلوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو شفاف سیمیں چشمے ان سے جا بجا اچھلتے کودتے نکلتے ہیں' وہ مجموعی قوت سے دریا بہاتے عالم کی سرسبزی وشادابی کا موجب ہوتے ہیں۔یہی پہاڑ ہیں جن کے نظارہ انسان کو اپنی بے حقیقی و بے بضاعتی کا دل ہی دل میں قائل کر کے' کسی اور عالم میں پہنچا کر معرفت الٰہی کا سبق پڑھاتا ہے اور انہیں پہاڑوں کی تاریک کھوؤں کی خوفنا کا ستایا ہوا' انسان گوشہ گزیں ہوکر عبادت و ریاضت کی بدولت قید جسمانی سے آزاد ہوکر کسی اور ہستی کی سیر کرتا ہے' یہی پہاڑ ہیں جو ہزار ہا سال سے بیش بہا جواہرات کو جگر گوشوں کی طرح سینے میں چھپائے ہوئے چلے آتے ہیں اور سخت مقابلہ سے انسان کی بہترین کوششوں کی بھی بہ مشکل ان تک رسائی ہونے دیتے ہیں۔انہیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر بکھرے ہوئے سنگ ریزے ایسے ایسے سمندروں اور دور دراز طوفان کو یاد دلاتے ہیں' جن کا مقابلہ میں گویا طوفان نوح کل ہوا ہے۔غرض کے پہاڑ زمانہ قدیم کی جہاں تک کہ مورخ کا ذہن بھی رسائی نہیں کرسکتا' زندہ تاریخ اور انسان کے لئے عجیب مایہء دولت وعبرت ہیں''۔ (۱۵)

آغا حیدر حسن مرزا:

آغا حیدر حسن مرزا دلی کی سرزمین میں ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے ان کا سلسلہ نسب بہادر شاہ ظفر سے ملتا ہے۔ابتدائی تعلیم اس زمانے کے دستور کے مطابق گھر ہی پر ہوئی۔بعد ازاں علیگڑھ میں داخلہ لے لیا۔ملازمت کے سلسلے میں ۱۹۲۱ء میں حیدر آباد آئے اور یہی کے ہوکر رہ گئے۔اپنی زندگی کا آغاز پولیس کی ملازمت سے کیا۔لیکن چند دنوں کے بعد ترک ملازمت کر کے درس و تدریس کے پیشہ سے وابستہ ہوئے اور نظام کالج میں پڑھانے لگے۔اور یہی سے وظیفے پر سبکدوش ہوئے۔بعد وظیفے کے زیادہ تر وہ فرانس اور جرمنی میں رہے۔آخر کار حیدر آباد میں ۱۹۷۶ء میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

آغا حیدر حسن مرزا کو ادب سے لگاؤ تھا۔ان کی کتاب ''بلبل ہند سروجنی نائیڈو'' بہت مشہور ومعروف ہے۔اس کتاب میں ان کی شخصیت کا اور دلی کی بیگماتی زبان کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ان کی ایک اور تصنیف ''پس

پردہ'' میں عورتوں کے معاملات پر بڑی گہری نظر ڈالی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے میر یار علی جان کا دیوان بھی مرتب کیا اور اس کا مقدمہ بھی لکھا۔

ادب کے علاوہ انہیں فن تعمیر، سنگ تراشی اور موسقی پر عبور حاصل تھا۔قلمی تصویریں بنانے میں کمال حاصل تھا۔اسکے علاوہ ان کے شوق مزاج اعلی تھے۔انہیں پرانی کتابوں، نایاب اور نادر چیزوں اور قلمی نسخوں کے جمع کرنے کا شوق تھا۔اس شوق نے ان کے گھر کو عجائب خانہ بنا دیا تھا۔

آغا حیدر حسن مرزا کی نثری تصانیف میں اس زمانے کی زبان' دہلی کے محاورے میں اس وقت کا حسن جھلکتا ہے۔ان کی تصانیف اس دور کی عکاسی کرتی ہے۔ان کا ذکر اس وقت کے قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ان کی تصانیف میں انشائیہ نگاری کے چند ایک خصوصیات پائے جاتے ہیں اس سلسلے میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''آغا حیدر کی شہرت ان کی بیگماتی زبان کے سبب سے ہے۔اس میدان میں آغا حیدر کی روش سب سے منفرد اور جدا تھی۔انھوں نے جو نثر لکھی ہے' وہ کسی طرح ریختی سے کم نہیں۔انہیں دہلی کی ٹکسالی زبان اور خاص اہل قلعہ کی بیگماتی زبان پر کامل قدرت حاصل تھی۔بیگماتی زبان کے محاوروں، کہاوتوں، ضرب الامثال اور روز مرہ لفظیات کے استعمال سے انہوں نے اردو نثر کو مالا مال کیا''۔ (۱۶)

آغا حیدر حسن کی تحریروں میں انشائیہ کی جھلک صاف ظاہر ہوتی ہے ان کے اسلوب کا انداز دیگر سے منفرد ہے۔مکتوب نگاری کا یہ دلکش اور خوبصورت انداز بیان ملاحظہ فرمائیں:

> ''میری ایک ملاپ دارنی ہیں۔انہوں نے جو ہمارے یہاں یہ چہل پہل دیکھی اور اشیانی کا حال محلے والیوں سے سنا، ہزاروں منتوں سماجتوں سے استانی کو بلا بھیجا۔اب تو بی استانی دلو کا دسیرا (دس سیر کا وزن) ہو گئیں۔جگہ جگہ ان کی پوچھ ہونے لگی۔اچھی بھلی بیویاں ان کے پیچھے دیوانی ہو گئیں۔اب شاید تم کہو کہ معمہ کیا ہے اور استانی کا نام کیا ہے۔سو میری جان استانی کا نام ''استانی'' ہی ہے اور وہ خواجہ بانو صاحبہ کی زیر ادارت دلی سے مہینے کے مہینے نکلتی ہے۔افسوس کے میرے پاس میرا نجی اور مدار کے ہی دو پرچے آئے۔انہیں تمہارے دیکھنے کو بھیجتی ہوں۔نگوڑے سال پیچھے کوئی ایسی بڑی رقم نہیں۔اس پر سے قربان کی تھی۔تم ضرور ضرور اس کو منگا کر پڑھنا اور اپنے نام جاری کروالو۔میری یہاں جتنی سہلیاں ہیں، سب منگانے کو کہتی ہے۔سردی غضب

کی پڑ رہی ہے۔ نگوڑے جاڑے کیا جانے پیٹ پھٹ گیا ہے۔ لکھنے کو تو تم کو ہی لکھ رہی ہوں لیکن انگلیاں مارے ٹھنڈ کے پالا ہوگئی ہیں۔ بالا پوش میں دبکی بیٹھی ہوں۔ کھانا تیار ہے۔ اس کی دہائی مچ رہی ہے۔ محمود تو بڑا پیارا پیارا ہوگیا ہوگا۔ میری طرف سے خوب بھینچ بھینچ کر پیار کرنا۔ سنجھلی بھابھی جان سارا دن کیا کیا کرتی ہیں۔ میری تسلیم قبول فرمائیں۔ اچھا لو بیوی! کھانا مٹی ہو رہا ہے، میں جاتی ہوں۔ اللہ بیلی اللہ نگہبان!''(۱۷)

یوسف ناظم (۱۹۲۱ء):

آپ کا پورا نام سید محمد یوسف ہے اور ناظم تخلص کرتے تھے۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں ریاست حیدرآباد کے جالنہ نام کے ایک تعلقہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد سید محمد ایوب جالنہ جالنہ کے ذی اثر وکلاء میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ فرخ آباد سے حیدرآباد دکن ہوتے ہوئے جالنہ آئے۔ اور یہیں سکونت اختیار کی یوسف ناظم جالنہ ہائی اسکول سے میٹرک اور اورنگ آباد کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد ۱۹۴۴ء ہی میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے ایم۔ اے کی ڈگری لی۔ عملی زندگی کا آغاز ریاستی محکمہ لیبر میں مترجم کی حیثیت سے ہوا۔ ریاستی تقسیم جدید کے بعد ریاست مہاراشٹرا میں لیبر آفیسر کی حیثیت سے منتخب ہوئے اور ۱۹۷۶ء میں بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر آف لیبر حسن وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ اسی دوران ڈپٹی کمشنر کے فرائض انجام دیں۔ ریاستوں کی تقسیم کے دوران ''جالنہ'' جو کہ ریاست حیدرآباد کا تعلقہ تھا، اب ریاست مہاراشٹرا کے ایک ضلع ''مرہٹواڑہ'' میں ہے۔

سید محمد یوسف اپنا قلمی نام یوسف ناظم لکھتے تھے۔ بچپن سے ادب کا ذوق تھا۔ انھوں نے شاعری سے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ اور یہ آغاز آپ کے طالب علمی کا دور تھا۔ انھوں نے مزاح نگاری کا آغاز ۱۹۴۴ء میں کیا۔ اور ساتھ ہی کالم نگاری اور ترجمہ نگاری میں بھی قلم آزمائی کی ہے۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

کیف وکم، فٹ نوٹ، دیوار پے، زیرغور، فقط، البتہ، بالکلیات، فی الحال، فی الفور، فی الحقیقت، فی الزمانہ، فی البدیہ، امریکہ میری عینک سے، منجملہ، ورنہ، سائے ہمسائے (خاکے)، ذکر خیر (خاکے)، علیک سلیک (خاکے) کتاب نما وجد نمبر۔ شگوفہ ہندوستانی مزاح نمبر، مکان عزیز قیسی نمبر ہیں، پلک نہ مارو، مرغی کی چار ٹانگیں، گاندھی جی جنوبی افریقہ میں، بکرے کی تعریف، الف سے یے تک بچوں کی تصانیف ہیں، ارمغان سنسکرت، (بھرتری ہری کی نظمیں)، اور نوائے کبیر (کبیر کے دوہے اور گیت)، منظوم ترجمے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین اور انشائیے شگوفہ اور دیگر جریدوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

یوسف ناظم نے کئی ایوارڈ حاصل کئے جن میں سے غالب ایوارڈ برائے طنز ومزاح ۱۹۸۴ء (غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی)، کنور مہندر سنگ بیدی ایوارڈ اردو اکادمی ۱۹۸۹ء قابل ذکر ہیں۔

یوسف ناظم نے مضامین بھی لکھے اور خاکے بھی، شاعری بھی کی اور بچوں کے لئے ادب بھی لکھا۔ان کی تمام تحریریں میں ایک بہت پر وقار مزاح سے متعارف کراتی ہیں۔بالآخر ۲۳ جولائی ۲۰۰۹ء کو اس دنیائے فانی کو الوداع کہا۔

''پہلے زمانے میں والدین اور اولاد کا معاملہ بڑا ،نازک تھا۔او راس معاملے کو بڑی احتیاط سے سلجھانا پڑتا تھا۔کہ والدین تو اپنی کوششوں میں ناکام ہوجاتے تھے۔اور محلے کے دوسرے والدین کو ان کی مدد کرنی پڑتی تھی۔اب زمانہ ترقی کر گیا ہے۔اولاد کے تعلیم پانے کی وجہ سے والدین سمجھ دار ہوگئے ہیں۔اوراب وہ اولاد کے ساتھ ضد نہیں کرتے۔جن ملکوں میں تعلیمی فیصد زیادہ ہے۔وہاں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اولاد کون ہے اور والدین کون؟ ہر کسی بات میں امتیازی نشان اچھے بھی نہیں معلوم ہوتے ۔یہ شان دار روایات اب دوسرے ملکوں میں بھیسا مانخور دونوش کے ساتھ برآمد کی جارہی ہیں۔بہت سے ملک ایسے ہیں۔جہاں باشندے کم اور سیاح زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔وہاں گھر یلو مسائل پیدا ہی نہیں ہوتے۔گھریلو مسائل صرف اُن صورتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔جب گھر کے سارے لوگ گھر میں رہیں۔بہت سے گھر تو ایسے ہوتے ہیں ۔جن میں لڑکیاں اپنے والدین کے سات صرف اُس وقت رہتی ہیں۔جب اُن کی شادی ہوجاتی ہے۔شادی سے پہلے،لڑکیوں کا والدین کے ساتھ رہنا،بعض ملکوں میں تقریباً منع ہے۔وہاں لڑکے سوائے اپنے گھر کے ہر گھر میں خوش رہتے ہیں۔ان خوشگوار حالات کا والدین زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے ہیں اور عدالتیں ،طلاقوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے میں دن رات مصروف رہتی ہیں۔دنیا میں اختیار جتانے اور حق منوانے کا سلسلہ اُس زمانے سے شروع ہوا جب شادی کے طریقے کی رسم اجرائی عمل میں آئی کہا جاتا ہے۔اس فن کے رواج پانے سے پہلے صرف وہی شخص بااختیار سمجھا جاتا تھا۔جو طاقتور ہو۔شادی کے رواج کے بعد پہلا مسئلہ جو کھڑا ہوا یہ تھا کہ دونوں میں بااختیار کون ہے؟ جب یہ مسئلہ حل ہوگیا تو والدین اور اولاد کے حقوق اور اختیارات کا مسئلہ سامنے آیا۔اب اس کا بھی تصفیہ ہوگیا ہے۔اور تمام

والدین متفقہ طور پر اولاد کے کہنے میں ہیں۔ جو والدین اس قاعدے کو قبول نہیں کرتے وہ فیملی پلاننگ کا سہارا لیتے ہیں۔ اسے فنی زبان میں (Scapism) کہا جاتا ہے۔ بچوں کے حقوق کو کالعدم قرار دینے کی ترکیب غیر شریفانہ ہے۔ والدین اور اولاد کے تعلقات کی جو نوعیت آج نظر آ رہی ہے۔ وہ کچھ اس طرح کی ہے''۔ (۱۸)

موجودہ دور میں لکھنے والے یعنی آزادی کے بعد کے انشائیہ نگاروں کے بارے میں اگلے باب میں تفصیل پیش کی گئی ہے۔ جنوبی ہند کی ریاستوں کرناٹک' آندھرا پردیش اور تلنگانہ میں ہمیں بکثرت انشائیے ملتے ہیں۔ لیکن جنوبی ہند کی دوسری ریاستوں یعنی تامل ناڈو' اور کیرالا میں انشائیوں کی آبیاری ضروری ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں نے انشائیے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ کافی جستجو اور تلاش و بسیار کے بعد ہمیں یہ پتہ چلا کہ تامل ناڈو میں اردو برائے نام ہے۔ اور کیرالا میں اردو پنپ رہی ہے۔

****

حواشی

(۱) فون پر گفتگو ۳ر مئی ر۲۰۱۶ء

(۲) فون پر گفتگو

(۳) (Ghubarre Khater - bogspot.com)

(۴) (Ur.m wikipedia.org)

(۵) سب رس شراب، ملا وجہی

(۶) سب رس، ملا وجہی

(۷) سب رس، ملا وجہی

(۸) انشائیہ اور انشائیے، پروفیسر محمد حسنین

(۹) انشائیہ اور انشائیے، پروفسر محمد حسنین، صفحہ۔۱۴۹۔۱۵۰

(۱۰) ماہنامہ ادیب، ڈاکٹر سیدہ جعفر، انشائیہ نمبر، مئی ۱۹۵۹ء، صفحہ۔۱۱

(۱۱) سب رس کا تنقیدی جائزہ، منظر اعظمی، صفحہ۔۱۷

(۱۲) سب رس، ملا وجہی

(۱۳) انشائیہ کی روایت، از اسد اللہ، صفحہ۔۱۷۷

(۱۴) وغیرہ، مولوی عزیز مرزا، مشمولہ، اردو کا بہترین انشائی ادب مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، صفحہ۔۱۸۷

(۱۵) روح ادب از ڈاکٹر حفیظ خطیب مطبوعہ ۱۹۵۷ء، صفحہ ۸۱۔۸۲

(۱۶) جامع اردو انسائکلو پیڈیا، مرتبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، صفحہ۔۱۰

(۱۷) انتخاب نثر و نظم، از ڈاکٹر قمر الہدا فریدی، صفحہ۔۵۰

(۱۸) ماہ نامہ شگوفہ، اکتوبر ۱۹۷۴ء

****

باب چہارم

آندھرا اور تلنگانہ میں اردو انشائیہ

آزادی کے بعد

آندھرا اور تلنگانہ میں اردو انشائیہ
آزادی کے بعد

جنوبی ہند ابتداء ہی سے اردو زبان وادب کا گہوارا رہا ہے۔ یہاں اردو زبان وادب کی ہمیشہ ہی سرپرستی ہوتی رہی ہے۔اور یہاں کی سرزمین اردو ادب کے لئے بہت زرخیز ثابت ہوئی ہے۔اس سرزمین سے بے شمار شعراء اور ادباء نے ہر دور میں ادب کی آبیاری کی اور اپنی علم دوستی اور دانشورانہ صلاحیتوں کی وجہ سے ادب کی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے چاہے وہ نثری صنف ہو یا غیر نثری صنف۔

یوں تو انشائیہ کی عمر تقریباً سوا سو سال ہوگئی ہے۔انشائیہ کے ابتدائی نقوش آزادی کے بعد بیسوی صدی کی تیسری دہائی میں ہمارے سامنے ابھر کے آتے ہیں۔ابتداء میں انشائیہ کبھی مضمون، کبھی لائٹ ایسّے یا پرسنل ایسّے کی حیثیت سے تو کبھی انشائیہ لطیف کے نام سے تحریر ہوتے رہے ہیں۔جنوبی ہند میں ملا وجہی کو اردو انشائیہ کا نقش اول قرار دیا گیا ہے۔

جنوبی ہند میں آزادی کے بعد کئی ادباء وعلماء نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اپنی علمی وادبی خدمات انجام دیں۔انہیں شخصیات میں سے چند ایک ایسے ہیں جنہوں نے انشائیہ کی زمین کو زرخیز کیا اور انشائیہ کی ترقی اور ترویج میں اضافہ کیا۔اردو میں شعوری اور غیر شعوری طور پر انشائیے لکھے گئے ہیں۔اس دور کے تمام ادباء اور شعراء نے صنف انشائیہ میں طبع آزمائی کی ہے جس کی کھیپ کی کھیپ موجود ہے۔جن میں کچھ ادیب ایسے ہیں جو دو چار انشائیہ لکھ کر نام کما چکے ہیں۔ چند ایسے انشائیہ نگار ہیں جو انشائیے کے مجموعے شائع کر کے اس صنف میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ چند ایسے انشائیہ نگار ہیں جو اس صنف کو فروغ دے رہے ہیں۔اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے انشائیہ کو ایک منفرد صنف ادب کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہت کم ایسے انشائیہ نگار ہیں جنھوں نے طنزیہ ومزاحیہ مضمون اور انشائیہ کے فرق کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چند ایسے بھی انشائیہ نگار ہیں جن کے انشائیہ مضمون کے زمرے میں شامل ہیں لیکن وہ انشائیہ سے قریب ہیں جس میں انشائیہ کی خصوصیات شامل ہیں اس وجہ سے ان کے مضامین کو انشائیہ میں شامل کیا گیا ہے۔

۱.۴۔ایم اے حنّان

ایم ۔اے حنان ۱/جون/۱۹۵۱ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ان کا علمی و ادبی گھرانے سے تعلق ہے۔ان کے والد مولوی عبدالوحید ادبی ذوق اور تنقیدی شعور رکھتے تھے۔ان کے والد کی تحریریں اس دور کے لاہور اور امرتسر سے نکلنے والے مشہور مذہبی رسائل میں شائع ہوکر مقبول ہوئیں ۔ان کے بڑے بھائی حمید آرموری ہند پاک کے معیاری رسائل میں مضامین تحریر کرتے تھے۔منجھلے بھائی ایم۔اے قدیر کا اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔

ایم ۔اے حنّان کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی۔وہ گھر کے علمی و ادبی ماحول سے متاثر ہوئے،بچپن سے ہی ادبی مشغلے سے وابستہ رہے۔اور اسکول میں اول آکر انعام پاتے تھے۔ایو ینگ کالج سے گریجویشن کیا۔ان کا پہلا مزاحیہ مضمون ماہ نامہ شگوفہ میں شائع ہوا۔ان کی تحریریں ماہ نامہ شگوفہ کے علاوہ نیا دور (لکھنؤ)، رہنمائے دکن،اور ملک کے دیگر ماہ ناموں، پندرہ روز، ہفتہ وار رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو (حیدرآباد) سے بھی نشر ہوتی تھیں۔''گستاخی معاف''ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضمون کا مجموعہ ہے۔

ایم ۔اے حنان کا انشائیہ نگاری کی طرف خاص رجحان دکھائی دیتا ہے۔ان کی تحریروں کے موضوعات آمنے سامنے دکھائی دینے والی چیزیں ہی ہوتی ہیں۔ یہ اپنے آس پاس اور روزمرہ زندگی سے وابستہ چیزوں کو انشائیہ کا موضوع بناتے ہیں۔مثلاً''برقی بریک ڈاؤن''میں برقی کے بار بار جانے سے کیا کیا مسائل پیدا ہوتے ہیں۔آج کے دور میں برقی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ایک وقت تھا جب لوگ چراغ اور قندیلیں استعمال کرتے ہوئے اپنی زندگی آرام سے گزارتے تھے۔ایک یہ آج کا دور ہے جہاں بجلی ایک گھنٹہ بھی نہ رہے تو زندگی اتھل پتھل ہوجاتی ہے۔ان کا انشائیہ ان کے اسلوب کا نمائندہ ہے۔ان کے تحریر کی دلکشی ہے کہ وہ بے ربطگی کو ربط کے ساتھ ساتھ ترتیب دیتے ہیں۔اس انشائیہ میں دیکھئے:

> ''بریک ڈاؤن'' کے بارے میں عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ دراصل محکمہ الکٹریسٹی کے افسروں اور موم بتی بنانے والوں کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔ اور اُن افسروں کے عزیز و اقارب موم بتی کا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں۔چنانچہ ان کے کاروبار کو چار چاند لگانے کے لئے عوام کو گھنٹہ دو گھنٹے کے لئے چاندنی کے سپرد کردیا جاتا ہے۔تاکہ ہر دو کا بھلا ہوجائے۔
>
> ''واللہ اعلم بالصواب''۔غیب کی خبر خدا جانے ہم تو اس پر ایمان لانے سے رہے۔لیکن احتیاطاً ان کے رشتہ داروں کی چھان بین کرلی جائے تو آخر اس

میں برائی کیا ہے؟ ! کیوں کہ آئے دن وہ اس کے اسباب وعوامل کی عجیب و غریب تاویلات پیش کرتے رہتے ہیں۔کبھی بارش کی زیادتی کو اس کا سبب بتلاتے ہیں تو کبھی بارش کی کمی کو۔کبھی موسم کے معتدل ہونے کو اس کی وجہ قرار دیتے ہیں اور کبھی آپ کی ہماری تقدیروں کو وہ بجلی کی سربراہی میں خلل واقع ہونا بتلاتے ہیں!''(۱)

انشائیہ کا اسلوب شخصیت سے نکلتا ہے۔چونکہ اس صنف میں مصنف باقی اصناف سے مختلف انداز میں اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے اس لئے نامعلوم گوشے بھی ازخود بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔اس سلسلے میں یہ اقتباس دیکھئے:

''برا ہو اس آشوبِ چشم کا جس نے نہ صرف ہماری عزت نفس کو سخت دھّکا پہنچایا بلکہ ہمیں سرِ بازار رسوا کر کے چھوڑا۔ دوران بیماری نہ کسی نے ہماری مزاج پرسی کی اور نہ ہی ہمدردی کے دو ایک بول کہے بلکہ الٹے ہمیں ہی لوگ تیر کی طرح ہی نگل جاتے۔شناسا' احباب اور رشتہ داروں کا ذکر ہی کیا ایسے اشخاص جن سے ہماری خون کی رشتہ داری ہے وہ بھی ہم سے کتراتے اور دامن بچانے لگے۔''(۲)

ایم۔اے حنان کی تحریروں میں ضرب الامثال اور محاوروں کا استعمال بخوبی ہوتا ہے اور وہ ساتھ ہی ساتھ انشائیہ کی شعریات کو شعوری طور پر ملحوظ رکھتے ہوئے تحریر قلم بند کرتے ہیں۔انشائیہ کی ایک خوبی بات سے بات پیدا کرنا ہے۔وہ بات سے بات اور نکتہ سے نکتہ آفرینی،نکتہ آفرینی سے انشائیہ کو وسعت دیتے ہیں جس سے قاری کو اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔مطالعہ فرمائیں:

''پھر بھی گدھے کے سینگ کی طرح غائب اور مال مسروقہ کی طرح برآمد ہوتے رہتی تو ٹھیک رہتا،لیکن یہ تو ایسے جلد سے جلد آزادی اور تھرتھراتی ہے بقول انشاء۔۔۔

''تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں''

اور کبھی یہ کسی بگڑے ہوئے ''آریم پی'' کے سائن بورڈ اور دائیں بائیں ہاتھ کی ''سڈول'' ہڈیوں کے درمیان لگے بلب کی طرح ہوتی ہے۔جس میں سوائے خطرہ کے کچھ اور دیکھائی نہیں دیتا۔بلکہ الٹے طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے خیالات پریشان کو اور پشیمان کئے دیتے ہیں۔''(۳)

شگفتگی انشائیہ کی ایک اہم صفت ہے جو ایم اے حنان کی تحریروں میں بہت عمدہ پائی جاتی ہے۔اس خوبی کی وجہ سے قاری اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا اور تحریر میں محو ہو جاتا ہے۔شگفتگی کے اس انداز کا یہ خوبصورت اقتباس ملاحظہ ہو:

''یوں تو ہمارا اور گھر کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ایک گھر ہی میں ہم نے اپنی دونوں آنکھیں کھولیں۔ابتدائی پرورش اور پرداخت بھی گھر پر ہوئی۔بالغ ہوئے اور یہیں سے ہماری عملی زندگی کا آغاز ہوا۔فرق صرف اتنا تھا کہ اب تک اس گھر میں لینے دینے کی ذمہ داری ہمارے بزرگوں کی تھی۔جو ہمارے شادی خانہ آبادی کے بعد ہمارے سر پر سوار ہوگئی۔

ایک دن ہمارے نصف بہتر نے یہ مژدہ جانکاہ سنایا کہ ہمارا اکلوتا کمرہ جو عرصہء دراز سے کئی عدد نفوس کی رہائش کا بوجھ سہار رہا ہے۔اس میں مزید کسی خوشخبری کے سمانے کی قطعی گنجائش نہیں اور کسی بھی لمحہ ننھے مہمان کی متوقع آمد کسی شدید رہائشی بحران کا سبب بن سکتی ہے جو جلد از جلد ایک عدد مکان ڈھونڈھ لینے کا مشورہ دیا۔''(۴)

ایم۔اے حنان سماج پر گہری نظر رکھتے ہیں۔سماج کی برائیوں کو اس خوبصورتی اور شگفتگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ وہ آپ کے اور ہمارے مسائل لگتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں داخلیت کا عنصر خوب نمایاں ہے۔بے ربطگی اور بے ہنگم ان کے انشائیوں کی خصوصیت ہے۔ان کے انشائیے بے ربط اور بے ہنگم ہوتے ہوئے بھی کس طرح ربط و تسلسل کے ساتھ جاری و ساری رہتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں وقت ضرورت محاوروں ، کہاوتوں اور ضرب الامثال کا استعمال عمدہ ہے۔اشعار سے بھی استفادہ حاصل کرتے ہیں۔اور وہ اپنے اطراف و اکناف کی چیزوں کو انشائیہ کا موضوع بناتے ہیں۔ان کی نگاہ سماج پر ہوتی ہے۔ان کی تحریروں میں وقت ضرورت تشبیہ اور روزمرہ کے الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے۔طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہے۔وہ خارجی و داخلی دنیا کو بھی نظر میں رکھتے ہیں۔اور انشائیہ کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری کی نگاہ ٹھہر جاتی ہے۔ایم اے حنان کو ایک اچھا انشائیہ نگار کہا جا سکتا ہے۔

۲.۴۔ برق آشیانوی

اصلی نام سید موسیٰ، تخلص کلیم، خاندان یداللہی ہے اور قلمی نام برق آشیانوی ہے۔ ۱۸/اپریل/۱۹۱۸ء میں سکندرآباد میں پیدا ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر میں سکندرآباد سے مشیرآباد میں منتقل ہوئے۔ انگلش میڈیم سے ابتدائی تعلیم حاصل کی برق آشیانوی کے گھر کا ماحول بالکل مختلف تھا ان کے والد صاحب فارسی زبان کے مسلمہ استاد تھے اسی وجہ سے برق آشیانوی کی فارسی بہت اچھی تھی، انھوں نے فارسی اپنے والد سے سیکھی۔ وہ سکندرآباد کے محکمہ تعلیم سے پیشہ تدریس سے وابستہ ہوئے۔ بعدازاں وہ جیل ڈپارٹمنٹ میں اکزیکیوٹر آفیسر ہوگئے اور اسی عہدہ سے وظیفہ حسن پر سبکدوش ہوئے۔ وہ دوبار حج کی سعادت سے مشرف ہوچکے تھے۔ ایک مسجد میں بلا معاوضہ پیش امام کی خدمت انجام دیتے تھے۔

ان کی تصانیف: ''مکرر ارشاد'' (۱۹۷۲ء) یہ مزاحیہ کلام کا مجموعہ ہے، ''جو نہ کرنا تھا'' (۱۹۷۷ء) ناول ہے، ''پتے کی بات'' (۱۹۷۸ء) مزاحیہ، ''ہنستے ہنستے'' (۱۹۸۱ء) اور ''ورق ورق'' (۱۹۸۶ء) میں شائع ہوچکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین کثیر تعداد میں رسائل مثلاً آج کل، ساقی، خریم، ادب لطیف اور شگوفہ وغیرہ اور دیگر رسائل میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان کی پہلی تخلیق ''حسن کار'' جولائی ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ بچوں کے لئے انگریزی نظموں کا مجموعہ بھی شائع ہوچکا ہے۔ برق آشیانوی ۱۴/اگست/۱۹۸۶ء میں اس دنیاءِ فانی سے رخصت ہوئے۔

برق آشیانوی کا ایک انشائیہ ''مانگنا'' ہے اس انشائیہ میں انہوں نے مانگنے والوں کے اقسام کے مختلف طریقوں کو دلکش انداز میں پیش کیا۔ وہ کہتے تھے کہ مانگ کر کھانے والے ہمیشہ بڑے مزے سے رہتے ہیں، نہ وہ کسی کے نوکر ہوتے ہیں اور نہ غلام اور نہ تابعدار بلکہ ہر ایک کے سر پر سوار ہوتے ہیں۔ انہیں کسی چیز کی کوئی فکر ہوتی ہیں نہ کوئی پریشانی ورنہ کام کی فکر تو عام آدمیوں کا جینا حرام کردیتی ہے۔ اس انشائیہ میں شگفتگی اور غیر رسمی طریقہ کار کو دلکش انداز میں تحریر کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> ''ترقی یافتہ ممالک میں فن گداگری کو آرٹ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ البتہ ہمارے ملک میں ابھی اس کو آرٹ کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔ اس لئے ہمارے یہاں اس آرٹ کے نہ سند یافتہ بیچلر ملتے ہیں نہ ماسٹر۔ لیکن عملی طور پر اس فن کے ایسے ایسے ماہرین ہمارے دیس میں موجود ہیں کہ بیچلر یا ماسٹر تو کجا پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی دی جائے تو کم ہے۔''(۵)

برق آشیانوی کا ایک اور انشائیہ ''اعضائے رئیسہ اور سر'' ہے اس انشائیہ میں بدن کے اعضاء کا ذکر دلچسپ انداز میں سیاست دانوں اور کابینہ کے ذریعہ دلکش تحریر قلم بند کرتے ہیں۔ برق آشیانوی کی سماج اور سیاست پر گہری نظر ہے وہ اپنے تجربات زندگی اور حقیقتوں سے اپنی تحریروں کو مزین کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''انسان کے جسم میں کئی اعضاء ہوتے ہیں جن میں سے صرف چند ایسے ہیں جن کو اعضائے رئیسہ کا اعزاز عطا فرمایا گیا ہے۔ ان اعضائے رئیسہ کی تعداد کسی حکومت کی کابینہ کے وزراء کی تعداد کی طرح نہایت ہی کم ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اگر کوئی وزیر اپنی وزارت سے استعفیٰ دے دے تو اس کا قلم دانِ وزارت کسی اور وزیر کے سپرد کر دیا جا سکتا ہے لیکن اعضائے رئیسہ میں سے اگر کوئی ''عضو رئیس'' استعفیٰ دیدے (یعنی کام کرنے سے انکار کر دے) تو اس کے قلمدانِ ریاست (رئیس کی مناسبت سے ریاست کا لفظ استعمال کیا گیا ہے) کسی دوسرے عضوئے رئیس کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔'' (٦)

برق آشیانوی کا ایک اور انشائیہ ''قاضی صاحب'' ہے۔ اس انشائیہ میں شگفتگی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ وہ زود ہضم کا استعمال خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔ ان کے یہاں نئے نکات بھی ملتے ہیں۔ اور بے تکلفی بھی ملتی ہے، اپنی تحریروں کو دلکش بنانے کے لئے کہاوتوں اور محاوروں کا استعمال بھی بہتر انداز میں کرتے ہیں۔ وہ اس انشائیہ میں شادی کے نام پر بننے والے رشتوں سے لے کر انسان کے قبر تک جانے کا سفر شادی کے بعد کس طرح گزرتا ہے بتاتے ہیں۔ اس انداز کو ملاحظہ فرمائیں:

> ''فنا سے فانی بنا ہے اور بقا سے باقی بنا ہے۔ فنا کے معنی ہیں فنا ہونے والا اور باقی کے معنی ہے باقی رہنے والا، لیکن قاضی کے معنی وہ ہستی نہیں جس کو قضاء کا لقمہ بلکہ لقمہء تر ہو جانا چاہئے، چنانچہ یہیں سے بات بگڑ گئی، اور قاضی صاحب خود لقمہء اجل بننے کے بجائے سیکڑوں معصوم نوجوانوں کے گلوں میں ایسے ایسے پھندے ڈالتے پھرتے ہیں جو برسوں نہیں ٹوٹتے ____ اگر اتفاق سے کسی کے گلے کا پھندا ٹوٹ جائے تو فوراً دوسرا نیا یا پرانا پھندا (جو سکینڈ ہینڈ بھی ہو سکتا ہے یا پھر تھرڈ ہینڈ بھی) لے آتے ہیں۔ اور گلے میں ڈال دیتے ہیں تا کہ آخر دم تک گھٹ گھٹ کے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جائے۔ صاحب! بے رحمی میں قصائی تو خواہ مخواہ بدنام ہے جو بکروں کے گلوں پر صرف ایک بار نہایت تیز

اور آبدار چھری پھیر دیتا ہے اور منٹوں میں بکرا دم توڑ دیتا ہے مگر قاضی صاحب کی
بے رحمی کسی کو نظر نہیں آتی جو معصوم نوجوانوں کے گلوں پر ایسی منڈ بیویاں پھیر
دیتے ہیں کہ بیچارے عمر بھر تڑپتے اور پھڑ پھڑاتے رہتے ہیں لیکن ان کا دم نہیں
نکلتا بلکہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی بسر کرتے چلے جاتے ہیں۔''(۷)

مجموعی طور پر ان کے انشائیوں کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کا اسلوب رواں دواں ہے، ان کے انشائیوں میں شوخی، ظرافت اور شگفتگی کا عنصر پایا جاتا ہے، ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کرتے ہیں، قاری کو کبھی بوریت کا احساس نہیں رہتا۔ ان کے انشائیوں میں غیر رسمی طریقہ کار بھی ہے، بے ربطگی اور بے تکلفی بھی ہے۔ وہ تجربات و مشاہدات کو دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں زبان و بیان کا استعمال بھی بہت خوب ملتا ہے۔ ان کے یہاں مزاح کی چاشنی کم پائی جاتی ہے اور طنز کے ہلکے تیر سے نشانہ لگاتے ہیں۔ ان کے یہاں بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر بھی ہے وقت ضرورت محاوروں اور ضرب الامثال کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ روز مرہ کے الفاظ کا استعمال عمدہ ہے۔ وہ پہلے اشارے کی لفظیات کی حدیں بیان کرتے ہیں پھر معاشرتی پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔ برق آشیانوں کی یہ خصوصیات ان کو منفرد انشائیہ نگار بناتی ہیں۔

۳.۴۔حبیب ضیاء(ڈاکٹر)

ضیاءالدین بیگ اورفخر النساءبیگم کے گلستان میں یکم نومبر۱۹۳۵ء میں ایک پھول کھلا اس کا نام انہوں نے حبیب النساء رکھا آگے چل کر حبیب ضیاء کے نام سے شہرت حاصل کی۔حبیب ضیاء ایک تعلیم یافتہ اور مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔بچپن سے ہی ادبی ماحول میں پرورش پائی۔بچپن میں انہیں مذہبی اور دینی تعلیم سے آراستہ کیا گیا۔اس کے علاوہ وہ پکوان،سلائی،اُون کا کام، پینٹنگ، باغبانی اور کھیلوں میں دلچسپی لیتی تھیں۔گرلز ہائی اسکول نامپلی سے میٹرک کامیاب کیا۔اورویمن کالج میں انٹراور بی اے تکمیل کیا۔ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری جامعہ عثمانیہ سے کی۔ ان کی تصانیف دکنی زبان کی قواعد(تحقیق)۱۹۶۹ء ، مہاراجہ سرکشن پرشاد(تنقید)۱۹۷۸ء،گویم مشکل (طنزومزاح) ۱۹۸۱ء،انیس بیس (طنزومزاح) ۱۹۸۸ء، شادونیاز (تنقید) ۱۹۹۳ء، جومژگان اٹھایئے (طنزومزاح)۲۰۰۱ء،حیدرآباد کی طنزومزاح نگارخواتین (تذکرہ) ۲۰۰۵ء، بڑے گھر کی بیٹی (خودنوشت سوانح) ۲۰۰۶ء،گلدستہ شاد(ترتیب بہ تعاون ڈاکٹر نارائن راج، ڈاکٹر بھاسکر راج سکسینہ) ۲۰۰۹ء،نذرشاد(ترتیب بہ تعاون ڈاکٹر نارائن راج)۲۰۰۹ء،مضامین نو(تنقید)۲۰۰۹ء۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء''ہم نے فلیٹ خریدا''میں فلیٹ کے آس پاس کے پڑوسیوں کے بارے میں اوران کی حرکات وسکنات کو دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔وہ پڑوسیوں کے ہر پہلو کو شگفتگی سے پیش کرتی ہیں۔وہ اس مضمون میں خارجی مناظر کو پیش کرتی ہیں پھر بھی وہ داخلی کیفیات کو اپنی گہری نظروں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور بعض جملوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''دروازے پر بڑے چھوٹے ہر قسم کے گولے آکر لگتے۔چند دن ہم انجان رہے۔ یہ سوچ کر کہ کالجوں میں جس طرح نئے سال پر ریگنگ RAGGING کی جاتی ہے اسی طرح نئے پڑوسی کو ستایا جاتا ہوگا۔جب ہماری غلط فہمی دور ہوگئی تو ہم نے انتہائی انکساری سے کہا۔بال کی آواز بہت تکلیف دہ ہے۔ہوسکتا ہے کہ بعض گھروں میں ضعیف، بیمار، دل کے مریض بھی ہوں۔''پڑوسن نے بے اعتنائی سے کہا''دوسروں سے آپ کو کیا لینا دینا۔یہ دنیا آنی جانی ہے۔بال کی آواز سے مرنا ہے تو وہ اسی طرح سے مریگا۔اللہ تعالی نے ہر ایک کی موت کا کوئی نہ کوئی سبب رکھا ہے۔آپ اپنی خیر منایئے۔''(۸)

حبیب ضیاء کی تحریر سیدھی سادھی ہے۔ وہ عصر حاضر کی آگہی رکھتی ہیں۔ان میں جزبہ دانش کا ایک امتزاج ابھر کر آتا ہے۔اس لئے ان کی تحریریں بھرپور اثر رکھتی ہیں بلکہ سوچ کو بھی متاثر کرتی ہیں۔انہوں نے اپنا

اسلوب روایتی انشاپردازی سے لیا ہے۔اس لئے اس میں طنز ومزاح ،مضمون کی حدیں ملی جلی انشائی نثر پارے کی شکل لے لیتی ہیں۔وہ انشائیہ کو دیکھنے کے لئے جوزاویہ نظر رکھتی ہیں اس میں ان کی نظر مکمل مضمون کا احاطہ کرتی ہیں۔ان کا طنزیہ ومزاحیہ انداز دیکھئے:

''ایک جگہ ہمیں کھانے پر مدعو کیا گیا تھا۔ جاتے ہی حسب عادت ہم باورچی خانے میں گھس گئے۔سل بٹے کے پاس خلاف توقع گھر کی بچی کے بجائے''میڈان جاپان'' کی نقلی مہر لگی ہوئی ساڑی پہنے ایک کافرادا ماما مسالہ پیس رہی تھی۔قریب جا کر دیکھا تو مسالہ ایک دم سفید تھا۔ہم نے مالکن کو رائے دی کی پھلی ٹھیک سے بھونی نہیں گئی۔بگھارے بیگن کا سالن لذیز نہ ہوگا۔اس پر وہ پہلے تو صرف مسکرائیں پھر ہماری پیٹھ پر پوری طاقت سے مارتے ہوئے بڑی سائز کا قہقہہ لگایا، پان کی پیک ہمارے کپڑوں پر اچھالی۔جب اطمینان ہوگیا کہ کافی چھینٹے پڑ چکے ہیں۔تب قہقہہ کو بریک لگا کر انہوں نے حقارت سے ہماری طرف دیکھا اور بولیں نادان! یہ پھلی نہیں بادام ہیں بادام! میرے منجھلے لڑکے نے جدہ سے بھیجے ہیں بگھارے بیگن میں بادام سن کر ہم ان کی قسمت پر رشک اور اپنی آنکھوں میں اشک لا کر سوچنے لگے۔

اللہ اللہ! کیا''انٹر ہے''۔ہمارے اور ان کے معیار زندگی میں یہاں بیگن کو بادام کا پرہیز ہونے کے باوجود اس کے پیٹ میں پسے ہوئے بادام ٹھونس ٹھونس کر بھرے جا رہے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ڈاکٹر کی سختی سے تاکید پر بھی بادام کھانے کی بجائے بادام کا''ایسنس''سونگھا کرتے ہیں۔'' (۹)

انشائیہ کی ایک اہم تکنیک غیر رسمی طریقہ کار بھی ہے۔جس میں انشائیہ نگار آزادی سے تقاضا کرتا ہے۔ آزادی کو جس فن سے استعمال کیا جاتا ہے وہ نظر نہیں آتی انشائیہ نگار اپنی جگہ آزاد ہوتا ہے۔اس کا فائدہ بھی اٹھاتا ہے، وہ کوئی بات کہہ دیتا ہے اس بات کو کہنے کے لئے خود ہی جواز پیدا کرتا ہے۔اس انشائیہ میں حبیب ضیاء کا فنی انداز دیکھئے۔وہ''ڈینگ بازی''میں غیر رسمی طریقہ کار کو شگفتگی کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ صاحب ڈینگ مارنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ایک دن کہنے لگے۔ میرا ایک بچہ جو تین مرتبہ ساتویں جماعت میں فیل ہو چکا ہے ضد کر رہا ہے کہ اس دفعہ تیسرے درجہ میں بھی کامیاب ہو جائے تو اسے ویسپا دلائی جائے۔پھر کہنے لگے۔اب آپ ہی اسے سمجھائیے۔کل تک وہ لونا مانگ رہا تھا آج ویسپا کا

مطالبہ کررہا ہے۔ہم نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔آپ نتیجے کا انتظار کئے بغیر لونا دلا دیجئے۔فیل ہونے کی پرواہ مت کیجئے ورنہ وہ کل ہیلی کاپٹر مانگے گا۔''(۱۰)

انشائیہ میں انشائیہ نگار اپنے خیالات کے بیان میں ترتیب و تنظیم کا خیال نہیں رکھتا بار بار اپنے موضوع سے بھٹکتا رہتا ہے۔یہی بے ربطگی ہوتی ہے، یہ بے ربطگی ڈاکٹر حبیب ضیاء کے انشائیہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ڈاکٹر حبیب ضیاء نوکری کی ترقی کی بات کرتے ہوئے اچانک راشن کارڈ پر ملنے والے شکر کی بات کرتی ہیں اور اس بات سے شکر کی بیماری کا ذکر کرتی ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہمیں اب تک کسی نے پروفیسر نہیں کہا تھا۔۔۔پروفیسری کے آگے ڈاکٹریٹ ماند پڑتی دکھائی دینے لگی۔۔موقعہ کو غنیمت جان کر ہم نے چھوٹی شان کے ساتھ تنخواہ میں دوسو روپیہ کا اضافہ کرتے ہوئے کہا: جی۔۔۔مجھے ترقی ہوگئی ہے اور آپ کی دعا سے آپ جو کہہ رہی ہیں میں وہ بن گئی ہوں۔''

ترقی کا لفظ سن کر لیڈی ڈاکٹر فاتحانہ انداز میں مسکراتی ہوئی یوں گویا ہوئی:

''تمہیں شکر آتی ہے؟''

ہم نے کہا۔۔۔''جی آتی تو ہے لیکن صرف چھ کیلو کیا بتائیں ڈاکٹر! یہ شکر ہر ماہ ناکافی ہوتی ہے۔آپ کے پاس زائد ہو تو دے دیا کیجئے''

لیڈی ڈاکٹر نرمی سے بولی: میں شکر کی بیماری کی بات کررہی ہوں۔تم کو شکر کی بیماری ہے کیا؟

ہم نے کہا: آپ کے منہ میں پتھر خدانخواستہ ہمیں کیوں ہونے لگی یہ بیماری۔''

''تمہارے ماں باپ میں سے کسی کو ہے یہ بیماری؟''۔۔۔''جی نہیں۔''

''نانا، نانی؟''۔۔۔''جی نہیں۔''

''دادا، دادی۔۔۔؟''۔۔۔ہم نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔''جی ہاں۔ میرے دادا کی شکر کی فیکٹری تھی۔''(۱۱)

ڈاکٹر حبیب ضیاء کے بارے میں مختلف آراء یہ ہیں:

ڈاکٹر حبیب ضیاء کی تحریروں کے بارے میں ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اس طرح رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر حبیب ضیاء چور دروازے سے مزاح کے میدان میں آئیں، حبیب توفیق کے نام کا برقع اوڑھے، جیسے انہیں خوف ہو کہ کسی محقق کا مزاح لکھنا

اس کے مرتبہ کے منافی ہو'۔لیکن جب پردہ ترک کیااور زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ تقاریب میں برسرِ عام مضمون پڑھا تو دادوتحسین کی بارش نے ان کے اس خیال کودھودیااورآج وہ طنزومزاح کے میدان میں اپنے نام کی طرح مردانہ وارآگے بڑھتی جارہی ہیں۔ رواں، شستہ،تیکھی زبان، گدگداتے مزاح کے ساتھ طنز کی زیریں لہر،موضوعات میں تنوع ڈاکٹر حبیب ضیاء کی تحریر کے خاص وصف ہیں۔''(۱۲)

شاغل ادیب ڈاکٹر حبیب ضیاء کے بارے میں اپنی رائے اس طرح قلم بند کرتے ہیں۔

''اردو دنیا میں ڈاکٹر حبیب ضیاء کا نام کسی تعارف کامحتاج نہیں ہے۔آپ حیدرآباد کی ایک صاحب طرز مزاح نگار ہیں۔آپ کی شہرت ومقبولیت صرف برصغیر ہندو پاک تک ہی محدود نہیں بلکہ آپ سمندر کے اس پار بھی اپنی ایک خاص شناخت ایک خاص پہچان رکھتی ہیں۔''(۱۳)

ڈاکٹر حبیب ضیاء کے تحریری فن کے بارے میں نسیمہ تراب الحسن کی رائے یہ ہے۔

''حبیب ضیاء کسی کی ذاتی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر انگلی اٹھانے کے خلاف ہیں اس لئے معاشرے کی بے ضابطہ گی پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اور طنزومزاح کے ذریعہ اصلاحی پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں سونے پر سہاگہ ان کا انداز ایسا سلجھا ہوا ہے کہ کسی کی دل شکنی بھی نہیں ہوتی۔انہیں کڑوی باتوں کو شکر کے کیپسول میں بند کرنے کا گر خوب آتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ''مشاہدات'' تجربات زندگی میں ہمیں بہت کچھ سکھاتے ہیں۔''(۱۴)

انشائیہ ایک تحریر کی صورت میں سامنے آیا تو بہت سے لوگ اس میں شامل ہوگئے۔ان میں ایک نام ڈاکٹر حبیب ضیاء کا ہے۔ان کے انشائیے اسلوب کے اعتبار سے مزاح پارے کے زیادہ قریب ہے۔اگر ہم انشائیے کے مجموعی مزاج کو مدنظر رکھیں تو ڈاکٹر حبیب ضیاء کے فن میں دو ایک خصوصیت پائی جاتی ہیں۔ان کے انشائیوں میں غیر رسمی طریقہ کار باکثرت سے پایا جاتا ہے۔بات سے بات نکالنے کا ہنر بھی ہے۔ان کی تحریر میں شگفتگی اور بے تکلفی کا انداز ٹھیک ہے۔ وہ ایک بیانیہ افسانہ کی طرح ایک بات شروع کرلیتی ہیں۔اور واقعاتی تسلسل کوملحوظ رکھتے ہوئے انجام تک لے جاکر نتیجہ اخذ کرتی ہیں۔ان کی تحریروں سے سبق آموز ہدایت ملتی ہے۔ان کے انشائیہ نما چند مضامین یہ ہیں ہم نے فلیٹ خریدا، بچہ باہر گیا، جلسے، ساس نے کیروسین، بڑا ڈاکٹر اور پانی وغیرہ۔

۴.۴۔خواجہ عبدالغفور

خواجہ عبدالغفور ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے ان کا آبائی وطن حیدرآباد ہے۔ان کے والد خواجہ نصرالدین نے ان کی تربیت کی۔خواجہ عبدالغفور نے سائنس سے بی۔ایس۔سی ،سی۔ایس اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔وہ بحیثیت چیف ایڈیشنل سکریٹری مہاراشٹرا اردو اکیڈمی سے وابستہ رہے۔ان کو ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ان کے تصانیف ذیل میں درج ہیں۔(۱)قہقہ زار(۲)شگوفہ زار(۳)لالہ گل وگلزار اور(۴)سمن زار اس کے علاوہ طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ بھی شائع ہو چکا ہے۔سمن زار ان کے انشائیوں اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔خواجہ عبد الغفور بنیادی طور پر لطیفہ گو ہیں۔ان کے بارے میں ڈاکٹر قمر رئیس اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس دور کے طنز و مزاح میں خواجہ عبدالغفور کا یہ کارنامہ یاد رہے گا کہ انھوں نے لطیفہ گوئی کو فن کا درجہ دیا۔خالص مزاح میں انہیں شفیق الرحمٰن کا جانشین کہا جاسکتا ہے۔انہوں نے ظرافت کی جملہ صورتوں کا مطالعہ دقت نظر سے کیا ہے۔ لیکن طبعی مناسبت کی بنا پر ان کا خاص میدان لطیفہ نگاری ہی ٹھرا۔۔۔غفور صاحب کا حافظہ ساری دنیا کے رنگا رنگ لطائف کا نگار خانہ ہے۔جنھیں وہ اپنے مزاح میں ہنرمندی سے جڑ دیتے ہیں''۔(۱۵)

ان کے انشائیے ماہنامہ شگوفہ میں شائع ہوتے تھے اور ان کا انتقال ۲۶/اپریل/۱۹۸۴ء میں ہوا۔

خوبی خواجہ عبدالغفور اپنے تخلیقی فن کے ماہر ہیں۔بے تکلفی کا عنصر ان کی تحریروں میں بہت خوبصورت انداز میں ملتا ہیں۔ان کے انشائیہ ''ممبئی کی بارش'' میں دیکھئے۔وہ کس خوبی کے ساتھ ممبئی کے شہر کا نقشہ بارش کے دوران کھینچتے ہیں۔بارش میں لوگ چھتری لے کر گھر سے نکلتے تو ہیں لیکن چھتری کے بغیر ہی چند ایک لوگ گھر واپس ہوجاتے ہیں بھول جانے کی عادت کی وجہ سے چھتری اپنی کہیں نہ کہیں چھوڑ دیتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''بمبئی کی بارش اور چھتری کا چولی دامن کا ساتھ ہے ایک واقعہ اور بھی آپ کے گوش گذار کردوں۔ہمارے گھر دعوت میں دو ایک دوست چھتری لے کر آئے اور جاتے ہوئے ایک صاحب اپنی چھتری بھول گئے دو چار روز بعد یہ تشریف لائے اور اپنی چھتری واپس مانگنے لگے۔ہم نے پوچھا'' بھئی کیسی چھتری کس رنگ کی چھتری'' وہ بولے۔''ارے صاحب آپ بھی غضب کرتے ہیں۔کون سی بھی کیسی بھی دے دیجئے۔اب ہمیں آپ سہ جھگڑا کرنا ہے۔؟'' (۱۶)

انشائیہ کی ایک خوبی بات سے بات پیدا کرنا ہے۔خواجہ عبدالغفور کے تحریروں میں بڑی خوبی کے ساتھ ان کے انشائیوں میں شگفتگی اور انبساط پایا جاتا ہے۔وہ بات سے بات اور نکتہ سے نکتہ آفرینی سے انشائیے کو وسعت دیتے ہیں۔جس سے قاری کو اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''کسی کو رات احمق کہہ دینا یقیناً خلاف تہذیب ہے لیکن کسی کی حماقت کی بات برداشت نہ ہو رہی ہو تو فوراً احمق کا ذکر چھیڑ دیجئے اور بتایئے کہ اس نے ایسے ہی حالات میں یہ حرکت کی تھی۔اشارہ صاف انہی حضرت کی طرف ہو اور بات کسی کی۔اس کے بعد دیکھئے وہ صاحب کس طرح تلملا کر رہ جاتے ہیں۔ آپ اس قسم کا واقعہ سنا سکتے ہیں احمق الذی کے پڑوس کی عمارت میں آگ لگی اور وہ اس قدر پھیل گئی کہ دوسری منزل تک ایک آدمی آگ کی لپیٹوں میں پھنس گیا اور مدد کے لئے چلانے لگا۔احمق نے فوراً ایک لمبی رسی اوپر پھینکی اور اس آدمی سے کہا کہ اپنی کمر میں باندھ لی۔موقعہ کچھ ایسا نازک تھا کہ اس نے بنا سوچے سمجھے رسی باندھ لی اور جیسے ہی اس نے اشارہ کیا انہوں نے طاقت سے رسی کھینچی اور وہ شخص دوسری منزل سے نیچے گر پڑا۔اس کی ہڈیاں پھسلی ہاتھ پیر سب چکنا چور ہو گئے۔احمق الذی نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا'' کچھ دن پہلے ایک شخص کنویں میں گر گیا۔تو میں نے اسی طرح رسی نیچے پھینکی اور اس کو اوپر کھینچ لیا---''اس حماقت اور کج فہمی کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔''(۱۷)

خواجہ عبدالغفور کا محاورں کے استعمال کا انداز ہی کچھ نرالا ہے۔پہلے محاوروں کا ذکر وہ خود کرتے ہیں پھر اس کے بعد محاوروں کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں۔اور اس خوبی سے قارئین کو مطمئن کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''ویسے محاورہ تو ہے عہدہ کی کرسی مگر ہماری نظر میں عہدہ کی کرسی نہیں بلکہ عہدہ کا میز زیادہ اہم ہے اس لئے کہ اڈمنسٹریشن یا مینجمنٹ کا سارا لب لباب اور سارا پلندہ مسئلوں اور فائلوں کا روپ دھارے ہوئے میز پر پڑا ہوتا ہے جس پر''ضروری''۔اہم''فورا'' جیسے سلپ لگے ہوتے ہیں جن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے ماتحتین نے ان کاروائیوں میں اپنی نا اہلی اور تساہل کی وجہ سے کافی دیر لگا دی ہے اور اب یہ چاہتے ہیں کہ ان مسئلوں پر یہ حاکم مجاز اپنی دستخط جلد سے جلد لگائے تا کہ ان کے ماتحتین کی سستی اور کاہلی کی وجہ سے کاروائی اور زیادہ

خراب نہ ہو۔غرض سب کچھ تو میز پر ہوتا ہے۔''(۱۸)

انشاء کے معنی عبارت آرائی، کوئی بات دل سے پیدا کرنے کے ہیں۔ چند انشائیہ نگار الفاظ کا انتخاب معنی کے لحاظ سے کرتے ہیں۔خواجہ عبدالغفور کا اسلوب بالکل الگ ہے۔وہ بات کے معنی کو پوشیدہ نہیں رکھتے وہ بات کے معنی کی وضاحت خود ہی کر دیتے ہیں۔ وہ گھر کے دیوان خانہ کو بہت بڑا تھیٹر کا اسٹیج کہتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''اب آپ ہی اندازہ فرمایئے یہ دیوان خانہ ایک بہت بڑی تھیٹر کا اسٹیج نہیں تو اور کیا ہے، کہ جہاں شب و روز تماشہ ہوتا ہے اور ہوتا ہی رہے گا۔''(۱۹)

خواجہ عبدالغفور کا ۱۹۸۴ء سے پہلے کے انشائیہ نگاروں میں ذکر ملتا ہے۔ان کے انشائیوں کے موضوع بہت دلکش ہیں۔موضوع کی مناسبت سے انشائیہ مکمل نظر آتا ہے۔اس کے علاوہ طنز و مزاح سے بھی کام لیتے ہیں۔ جس سے قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ان کے انشائی کاوشوں کے پیچھے ان کا تجربہ ان کا مشاہدہ اور طویل مطالعہ ہے۔ان کے انشایئے اختصار اور اور جامعیت سے آری ہے۔ان کے انشائیوں میں خارجی اور داخلی ہم آہنگی روپزیر ہوتی ہے۔ بے ربطگی اور زود ہضم کی خصوصیات بھی پائی جاتی ہے۔خواجہ عبدالغفور عام اشیاء کی زبان میں قصے اور لطیفے سناتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں شگفتگی اور لطیفہ گوئی کا اثر زیادہ دیکھائی دیتا ہے۔لطیفوں کی کثرت کی وجہ سے تحریر میں انشائیہ اپنا اثر کھو دیتا ہے۔ضرب الامثال اور محاوروں کا استعمال خوب ہے۔ وقت ضرورت مصرعے اور اشعار سے بھی استفادہ حاصل کرتے ہیں۔مصنف کے ذریعہ قاری تک وہ بات پہنچا دیتے ہیں جو وہ کہنا چاہتے ہیں۔

۵.۴۔ رشید قریشی

رشید قریشی ۱۹۲۰ء کو حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے کیا۔ پہلی ملازمت دکن ریڈیو میں کی بعد ازاں معتمد تعلیمات کے پیشہ سے وابستہ ہوگئے۔ اور معتمد کی حیثیت سے ہی وظیفہ حسن پر سبکدوش ہوئے۔ ان کے ریٹائرمنٹ کے بعد اردو اکیڈمی ایڈمنسٹریٹیو افسر کی جائیداد پر تقرر عمل میں آیا۔ رشید قریشی کی تصنیف ''مزاج شریف'' شائع ہوچکی ہے۔ ایک ڈرامہ تحریر کیا ''محبوب'' جو اسٹیج پر پیش کیا گیا اور کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔

رشید قریشی مختلف موضوعات پر انشائیے تحریر کئے۔ جن میں سے کچھ یہ ہیں۔ ہم چلے وظیفہ لینے، آنا دلہن کا دیر سے، آئینہ اور گھوڑا جوڑا وغیرہ۔ رشید قریشی ''گھوڑا جوڑا'' میں وہ دنیا کی شادی بیاہ کی رسموں اور رواجوں اور اس میں لین دین کے جو طریقے ہیں اس کو بہت دلکش انداز میں سماج کی اس لعنت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس انشائیہ میں شگفتگی بھی ہے اور مزاح کے ساتھ ہلکا سا طنز بھی پایا گیا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''شادی کے بازار میں ڈاکٹر کی بڑی مانگ اور اونچا نرخ ہے۔ ڈاکٹر اگر حیوانات کا بھی ہو تو سر کے بالوں اور پلکوں پر چلتا ہے بلکہ حیوان ہو لیکن ڈاکٹر ہے تو بھی بزور نشتر گھوڑے جوڑے کی رقم ہتیاتا اور ایک پری زاد کو اپنی کنیزی میں قبول کرتا ہے۔ خادم کے معاملہ میں خادم سے زیادہ اس کے والد دلھا تھے کیونکہ خادم ایک سعادت مند اور احسان مند بیٹا تھا۔ سعادت مند اس لئے کہ والد کی طرف سے کسی بات کی روک ٹوک نہ تھی۔ احسان مند اس لئے کہ اس کی والدہ کے انتقال کے بعد انھوں نے دوسری شادی کا قصد نہیں کیا تھا۔ جہاں بھی سلسلہ جذباتی ہوتا وہ اپنے ساتھ محلّہ کے دو دوستوں ہم محکمہ، دو وظیفہ یابوں، دو رشتہ داروں اور محلّہ کی مسجدوں کے موذن صاحب کو لازمی طور پر منسلک رکھتے۔ کہیں شام کی چائے کہیں عشائیہ اور ہر مقام سے اس نعرہ کے ساتھ اٹھتے' ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے اپنا۔ ایک پیام تو ایسا للچانے والا آیا کہ والد صاحب نے خادم کو پس پشت ڈال کر خود آگے بڑھ جانے کی ٹھان لی۔ لیکن ان کے حق میں لڑکی والوں نے جہیز کی رقم نصف گھٹادی تو وہ پیچھے ہٹ آئے اور خادم پر ایک اور احسان کر گئے۔''(۲۰)

اس پیراگراف سے ان کے اسلوب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مزاح کی آمیزش کے ساتھ ساتھ ان

کے انشائیوں میں نکتہ آفرینی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔اس انشائیہ میں اگر چہ انشائیہ نگار کی توجہ خارجی مناظر کی طرف ہے پھر بھی انھوں نے داخلی کیفیات کو اپنی گہری نظروں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

رشید قریشی کی تحریروں میں بے تکلفی کا عنصر بھی پایا جاتا۔اور یہ خوبی ان کے انشائیہ ''آنا دلہن کا دیر سے'' میں نمایاں ہے۔اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''افتی ہنس پڑا''اے یار وظیفہ یاب کو بڑی پابندی سے وظیفہ اٹھانا چاہئے۔ ایک مہینہ بھی غیر حاضر رہے تو دشمن تو بقید حیات رہتے ہیں۔ وظیفہ یاب ہی مرحومین کے گڑھے میں ڈھکیل دیئے جاتے ہیں۔'' میں نے کہا: یہ تمہارا خلوص ہے جو تم مجھے جیتے جی مرحوم دیکھ رہے ہو،اب یہ بتاؤ کہ تم کیسے ہو؟ کہنے لگا ''خیریت سے ہوں،لیکن اب صرف وظیفہ سے کام نہیں چلتا،تمہیں تو معلوم ہے صرف تنخواہ سے بھی کام نہیں چلتا تھا۔سوچ رہا ہوں بے موٹر کا جو اپنا موٹر خانہ ہے اسے ضروری مرمت کے بعد کیوں نہ کرایہ پر اٹھادوں!''(۲۱)

ان کے اس انشائیہ میں بے ربطگی بھی ہے۔جو انشائیہ کی ایک خاص خوبی ہے۔شگفتگی و بے ربطگی کے نمایاں اثرات ملتے ہیں۔اس انشائیہ میں مصنف نے بڑھاپے سے ظاہر ہونے والے تمام پہلوؤں کو کھل کر بیان کیا ہے۔شگفتگی کا یہ انداز دیکھئے:

''آئینے کو آئینہ دیکھنے والے میں نئی بات جو نظر آرہی ہے وہ یہ ہے کہ چہرے کی جلد جگہ جگہ سے کٹ پھٹ کر جھریوں میں بدل گئی ہے اور سر کے بالوں کی چمکتی سیاہیاں بدرنگ بھوری پڑ گئی ہے۔جیسے بھنورے اڑ گئے اور ان کی جگہ بگلے بیٹھ گئے۔

اصولاً بوڑھوں کو آئینہ دیکھنا ہی نہیں چاہئے۔اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ حتی الامکان اس سے منہ چھپاتے ہی رہتے ہے۔لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ خود آئینہ انھیں چوری چھپے دیکھتا اور ان پر ٹھٹے لگاتا پھرتا ہے۔'' (۲۲)

رشید قریشی کے انشائیہ میں اسلوب کی تازگی،نکتہ آفرینی،زبان و بیان کی دلکشی انہیں ایک عمدہ انشائیہ پرداز بناتی ہے۔ان کی تحریروں میں مزاح کی سادگی ہے۔سماج پر ان کی گہری نظر ہے۔ان کے مضامین میں سماجی عنصر نمایاں ہوتا ہے۔وہ متخیلہ اور حقائق بینی کے اشتراک سے احساسات کو لفظوں کا پیکر عطا کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں مکالماتی انداز بھی پایا جاتا ہے۔حقیقت حال سے آگاہی ہوتی ہے۔ان کے انشائیوں میں افسانوں کا

غلبہ چھایا ہوا دیکھائی دیتا ہے۔رشید قریشی، پہلی انشائی کاوش ہی سے متوجہ کن انشائیہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

۶.۴۔زینت ساجدہ (ڈاکٹر)

اصلی نام ام خواجہ زینت ساجدہ بانو تھا۔جنھیں اردو دنیا میں ''زینت آپا'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ۱۹۲۷ء میں رائچور میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد مولوی سید مصطفیٰ قادری سبز پوش انعام اور خاندان نوردیا سے دھدیالی اور قاضی محمد بحریؒ سے ننھیالی رشہ رکھتے تھے۔جوگلبرگہ کے شرفاء اور سادات گھرانے کے بزرگ تھے۔

ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ تعلیم المعلمین کاچیگوڑہ میں ہوئی۔ویمنس کالج عثمانیہ یونیورسٹی سے انٹر اور بی۔اے کیا۔بعداس کے ایم۔اے سے امتیازی کامیابی حاصل کی۔۱۹۷۳ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔ زینت آپا افسانہ نگار، نقاد، محقق، ادیب، مترجم، اور انشائیہ نگار تھیں۔ان کی تحریروں سے ان کی شخصیت کے کئی پہلو دکھائی دیتے ہیں۔۴/ڈسمبر ۲۰۰۸ء کو جان جاں آفریں کو سپرد کردی۔ذیل میں ان کی تصانیف ملاحظہ ہو:

تلگوادب کی تاریخ، کلیات شاہی، علی عادل شاہ ثانی، حیدرآباد کے ادیب جلداول اور دوم، تاش کے محل (تلگو ناول کا ترجمہ)، حکمران خواتین، محبّ وطن خواتین، دیوان حفیظ، دکنی گیت، رقص، شرر (طنزیہ مضامین کا مجموعہ) بچوں کے لیے نگرنگر کی بات، ہندی رسم الخط میں کلیات بحری مرتب کی اور ہندی کے نوشاعروں کا تذکرہ، ہندی کے نورتن لکھا۔من لگن، کلیات شاہی اور نوسرہار کی تنقیدوں وتدوین کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے چارسو سے زیادہ مضامین نشر کیں۔

''میری مرغیاں'' زینت ساجدہ کا ایک اور انشائیہ ہے اس پیراگراف سے ان کے انفرادی رنگ کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔اس میں وہ مرغی کے چوزوں کو بہت پیار سے اوران کی پرورش کو دلکش وخوبصورت انداز میں پیش کرتی ہیں جیسے کسی انسان کے بچوں کو کرتی ہیں۔وہ انکشاف ذات کا اظہار نرالے اور دلکش انداز میں کرتی ہیں ملاحظہ ہو:

> ''بڑے پیار سے میں نے انہیں دانا کھلایا۔نوگرفتار گھبرائے گھبرائے ادھر ادھر دوڑے دوڑے پھرتے۔ماں کی پنکھ سے کتنی جلد جدا ہوگئے تھے۔قسمت انہیں کہاں سے کہاں کھینچ لائی تھی۔یہاں زمین آسمان سب ان کے لئے نئے تھے۔اس لئے سہمے سہمے پھرتے تھے۔جیسے کوئی نئی نویلی دلہن سسرال آئی ہو۔ اور ذراسی آہٹ سے چمک جائے۔مگر پیار میں وہ قوت ہے کہ جانور بھی رچ جاتا ہے۔انہیں گود میں اٹھالیتی، سینے سے لگاتی، پیار کرتی اوران کے دانہ پانی

کا خیال رکھتی۔''(۲۳)

زینت ساجدہ انشائیہ ''چار مینار کے غلاف'' میں نامور اور مشہور شخصیت بننے کے گر بتاتی ہیں جس کے پاس دولت نا ہو تو بھی وہ شہرت حاصل کر سکتے ہیں۔ انکشاف ذات کو شگفتگی کے ساتھ بہترین انداز میں کرتی ہیں۔ ہلکا سا طنز کرتے ہوئے خوبصورت محاوروں اور کہاوتوں کا بھی استعمال کرتی ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اب تو سوچ لیا کہ بڑا آدمی بنیں گے۔ تو کیا کریں؟ لوگ جلسوں جلوسوں کا افتتاح کرانے کو ہمارے ساتھ ابھی آئینگے نہیں، اسکے لئے کچھ ٹام ٹام چاہئے۔ سب سے اچھا طریقہ اس ٹام ٹام کا یہی ہے کہ کوئی تحریک شروع کر دیں۔ انسداد گداگری، انسداد بے رحمی بر جانوراں و شوہراں، ادارہ تحفظ خرافات، انجمن دوستی مابین بھارت و قطبین وغیرہ وغیرہ۔ مگر نہیں بھئی ان سب کے لئے پہلے روپیہ چاہئے اور روپئے کے لئے عالمی ساہوکار کی ہمدردی چاہئے۔ اس ہمدردی کے حاصل کرنے کا جوہر ہم میں نہیں، ورنہ ابھی تک سمندر پار گھوم نہ آتے۔ پھر کیا کریں؟ ہم کو اہالیان شہر مادر شہر بھی تو نہیں بناتے کہ ہم دو چار کمانوں کو توڑ کر دو چار نالے بہائیں۔ اچھی بھلی یادگار عمارتوں کو اس لئے ڈھا دیں کہ راستے کا روڑا بنی ہوتی ہیں۔ اور اگر کوئی کہے سنے تو صاف کہہ دیں کہ اچھا ہی ہوا۔ یہ تاریخی عمارتیں ٹوٹ گئیں ورنہ غلامی کے دور کی یاد دلاتیں۔ ایک ایک کر کے ان کو مٹا دینا ہی چاہئے تا کہ اب جو قوم کی تاریخ لکھی جائے تو ہم مادرزاد آزاد تسلیم کئے جائیں۔۔۔'' (۲۴)

انشائیہ نگار خوشگوار موڈ کے تحت بات سے بات پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے خیالات کے بیان میں ترتیب و ترسیل کا خیال نہیں رکھتا اور بار بار اپنے موضوع سے بھٹکتا رہتا ہے اس طرح سے انشائیہ میں بے ربطگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب ہم زینت ساجدہ کے انشائیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے یہاں یہ خصوصیت بڑی عمدگی سے ملتی ہے۔ وہ اپنے انشائیہ ''میری مرغیاں'' میں یہ خوبی بہت عمدگی سے پیش کرتی ہیں۔ مرغیوں کے جھگڑے کی بات کرتے کرتے وہ نند بھاوج کی لڑائی کی بات کرتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ضرب الامثال کا دلکش انداز دیکھئے:

''ادھر مرغیوں میں بھی جھگڑے ہونے لگے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اب دونوں کی جو چشمک شروع ہوئی تو جینا دوبھر ہو گیا۔ اچھی خاصی نند بھاوج کی لڑائی تھی۔ اس کی بات پر وہ ناک بھوں چڑائے۔ اس کی بات پر وہ منہ بنائے۔ میں یہ پیترا کہوں کہ بھئی تو پرانی ہے۔ گھر کی بیٹی ہے غم

کھالے جی بڑا کرلے چار روز میں بہو کو آپ ہی سمجھ آجائے گی۔اس سے لاکھ
کہوں کہ بہو تو آخر بہو ٹھری گھر بار تیرا مگر گھر کی بیٹی سے لاگ ڈانٹ کیسی۔اس
سے اچھا سلوک کرنا، آنچل پھیلا کر دعا دے گی تو جنم جنم تیری نسل پھیلتی پھولتی
رہے گی۔مگر قسم لے لو جوان کے کان پر جوں بھی رینگے۔''(۲۵)

''چار مینار پر غلاف'' اس انشائیہ میں زینت ساجدہ سماج کے ان ٹھیکیداروں اور سیاست دانوں پر طنز کرتی ہیں۔زینت ساجدہ کی سماج پر گہری نظر ہے وہ ایسے لوگوں کو نشانہ بناتی ہیں جو نام اور شہرت کی خاطر دوسروں کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور اپنی حرکتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس طرح وہ انشائیہ میں سماج کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں۔انسانی احساسات اور جذبات سے لے کر اپنی بات کو درجہ بہ درجہ پھیلاتی چلی جاتی ہیں تو موضوع میں وسعت آتی ہے۔وہ اس انشائیہ میں غیر رسمی طریقہ کار کو شگفتگی کے ساتھ ساتھ پیش کرتی ہیں۔وہ قاری سے بے تکلف گفتگو میں محو ہو جاتی ہیں۔یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''دور دور سے لوگ باگ آئیں گے کہ تاریخی عمارت پر غلاف چڑھ رہا
ہے۔صندل، چراغاں اور عرس کا جیسا اہتمام ہوگا۔قوال، مسخرے، بھانڈ سب
آئیں گے اور سر کے بل آئیں گے۔اہل نظر آنکھیں سینکیں گے اور اہل دل
''مگر نازم بہ این ذوقے کہ پیش یار می رقصم'' کی کیفیت طاری کر کے محفل کو
گرمائیں گے۔شہر کے ہوٹل کھچا کھچ بھر جائیں گے۔پان، بیڑی، سگریٹ سے
لے کر کفن دفن والوں تک کا فائدہ ہوگا۔تجارت چمک جائے گی۔لوگ کھائیں
گے، بیمار پڑیں گے حادثوں اور بدہضمی سے مریں گے۔زندگی سے موت تک کا
بازار گرم بلکہ گرما گرم ہو جائے گا۔واہ بھئی داد دیجئے ہمارے دماغ کی۔ایک
پیسہ ٹیکس اور فائدہ ہی فائدہ۔پھر اس ایک دفعہ کی تقریب کا ہم سالانہ اہتمام بھی
تو کر سکتے ہیں۔''(۲۶)

زینت ساجدہ کے بارے میں مختلف آراء یہ ہیں:

ڈاکٹر عقیل ہاشمی (سابق صدر شعبہء اردو عثمانیہ یونیورسٹی) زینت ساجدہ کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔

''ان کا ادبی ذوق مطالعہ اور شعور مثالی تھا، ان کا اسلوب خواہ انشائیہ میں ہو
یا تنقید میں ہمیشہ راہِ علم اور ادب میں نئے راستوں، نئی سمتوں، نئی جہتوں کا
ادراک دلاتا، امکانات اور جدوجہد پر مائل کرتا تھا، وہ اپنے قلم اور زبان دونوں

سے متاثر کرتی تھیں لیکن کبھی کبھی ان کے لہجے میں تلخی بھی گھل جاتی تھی، عورت کی طرف داری میں وہ کھل کر سامنے آتی تھیں، عورت کی مظلومیت، بے چارگی لیکن ہمت، عزم واستقلال کے بارے میں اپنے ایک انشائیہ میں لکھتی ہیں:

''ایک عورت اور اس کے ساتھ ہزار جنجال۔ بال سے باریک اور تلوار سے تیز راستے پر سنبھل سنبھل کر چلنا ہی اس کا سب سے بڑا کمال ہے اور یہ عورت اور صرف عورت ہی کر سکتی ہے، اسی لئے اگر کوئی کہے کے عورت کسی فن میں کامل نہیں ہوسکتی تو اس کا منہ نوچ لیجئے اور کہئے کہ ایک کمرہ اور فرصت کا ایک دن تو فراہم کردے۔ (ہم ہے تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور)''(۲۷)

بقول مخدوم محی الدین دکن کی سانولی اور ڈاکٹر بہادر گوڑ کے الفاظ میں زینت ساجدہ:

'' بھرے گھر کی بہو، مرزا ظفر الحسن کے خیال میں جادو بیان و جادو نگار، استاد جامعہ صاحب طرز ادیب بے مثال مقرر بے لاگ مبصر اور حقیقت پسند تنقید نگار، شگفتہ نویس انشائیہ نگار، سادگی کا پیکر، عقل و دانش کا نورانی مینار اپنی ذات میں انجمن صد ہزار شخصیت۔''(۲۸)

زینت ساجدہ ایک کامیاب انشائیہ پرداز ہیں۔ ان کے انشائیوں میں عنوان سے لیکر انجام تک جملے کسے ہوئے اور اسلوب مضبوط گرفت کا حامل نظر آتا ہے۔ انشائیہ بتدریج آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور فنی طور پر اس میں ملکر گہرائی اور گیرائی آتی چلی جاتی ہے۔ جملے جہاں مصنفہ کی وسعت مطالعہ اور فکری ہمہ گری کے مظہر ہیں وہاں ان کا کمال بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

مجموعی طور پر ہمیں ان کے انشائیوں کا جائزہ لینے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ زینت ساجدہ کا اسلوب دلکش اور جاندار ہے۔ جملوں میں ربط اور تسلسل کے ساتھ ساتھ معنوی گہرائی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ داخلیت سے زیادہ خارجیت کے پہلو بیان کرتی ہیں۔ ایک نرم وملائم احساس کی رو شروع سے آخر تک ان کے لفظوں میں محسوس ہوتی ہے۔ وہ سماجی حالت سے بخوبی واقف ہے۔ اپنے آس پاس کے حالات کو بہتر طور سے سمجھتی ہیں۔ وہ ہماری ان معاشرتی مجبوریوں کا نقشہ کھینچ دیا ہے جو ہمیں آزادی کے اظہار سے روکتی ہے۔ ان کے ہاں بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر بھی ہے اور بے تکلفی کا بھی۔ ان کے انشائیے سخت ہونے کے بجائے شگفتہ ہوتے ہیں۔ بین السطور کہیں نہ کہیں ایسا ذکر ضرور لے آتی ہیں جس سے کھل کر ہنسی نہیں آتی دبی دبی ہنسی ہمارے ہونٹوں پر جگہ بنالیتی ہے۔ ضرورت کے لحاظ سے ضرب الامثال اور محاوروں کا استعمال عمدہ ہے۔ روزمرہ کے الفاظ کا استعمال زیادہ ملتا

ہے۔ان کی تحریریں مختصر ہونے کے باوجود دیرپا اثر رکھتی ہیں۔

۷.۴۔سلیم مقصود

مرزا فرحت اللہ بیگ حیدرآباد کے متوطن ہے۔قلمی نام سلیم مقصود کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم۔اے کرنے کے بعد روزگار کے سلسلے میں کئی عرصے سعودی عرب میں رہے۔واپسی کے بعد صحافت سے وابستہ ہوگئے۔سلیم مقصود کا شوق بہت ہی نرالہ تھا وہ ہر چیز سے بیزار ہوجاتے اور بہت جلد اکتاہٹ محسوس کرنے لگتے باوجود اس کے قدیم اور پرانی کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق رکھتے ہیں۔

''احتجاج''سلیم مقصود کا انشائیہ ہے اس انشائیہ میں وہ محکومہ ریلوے پر بھرپور طنز کرتے ہیں۔ٹرینیں بھی کبھی وقت پر نہیں چلتی۔اس بات کا احتجاج کرنے کے لئے مرزا صاحب خودکشی کرنا چاہتے تھے۔اس مرزا کے ذریعہ مصنف کو مشتاق احمد یوسفی کے مرزا کی یاد آگئی جو کرکٹ کا میچ دیکھنے کے لئے ایسے ہی سج دھج کر جایا کرتے تھے۔اس تحریر میں سلیم مقصود احساسات وجذبات پر مضبوط گرفت رکھتے ہیں۔مشتاق احمد یوسفی کی مثالیں ان کے ہاں پائی جاتی ہیں ملاحظہ ہو:

> ''خواجہ صاحب خودکشی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟''ان کی اہلیہ نے الٹا سوال داغ دیا۔''آپ جینا کیوں چاہتے ہیں؟''ہم کوئی جواب نہ دے سکے۔کیوں کہ ہم جس دوزخ میں جی رہے ہیں اس میں زندہ رہنے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے۔بچوں سے بھی ہم نے وہی سوال پوچھ لیا جو خواجہ صاحب کی بیگم سے پوچھ چکے تھے۔جواب ملا''ابا یہ کوشش کوئی دس سال سے کررہے ہیں۔آج تک انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔سیدھا ریلوے لائن پر جاتے ہیں۔اور پٹریوں کے درمیان شطرنجی بچھا کر لیٹ جاتے ہیں۔مگر بھلا ہو ان ٹرینوں کا آج تک کوئی ٹرین وقت پر نہیں آئی۔چنانچہ دس سال سے والد صاحب کی خودکشی کی آرزو معرض التواء میں پڑی ہے۔جیسے یہ بھی کوئی عوامی منصوبہ ہو۔''(۲۹)

انشائیہ میں شخصی ردعمل کو لازمی جز تسلیم کیا جاتا ہے۔انشائیہ ایک ایسا فن ہے جس میں فنکار کی شخصیت کی عکاسی ہوتی ہے۔انشائیہ نگار جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے ذاتی خیالات، جذبات ومشاہدات کو بڑے خوبصورت پیرائے میں پیش کرتا ہے۔سلیم مقصود دلکش شخصیت کی خوشبو اس طرح تحریر میں بھر دیتے ہیں گویا چمنستان کھل اٹھا ہو۔

> ''بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو زبان اور داؤ پیچ دونوں سے لیس ہوتی

ہیں۔مثلاً ہماری ایک پڑوسن ____ جو،ان دونوں چیزوں میں ماہر ہے جس نے ایک بار مار مار کر اپنے شوہر کو بے ہوش کر دیا تھا۔ ہم نے فوراً وہ مکان خالی کر دیا۔ کیوں کہ اس پڑوسن کا ہمارے ہاں بھی آنا جانا تھا۔ کیا پتہ وہ ہمارے ہاں ہماری بیوی کو داؤ پیچ سکھانے آتی ہو۔ ہماری بیوی صاحبہ یہ مکان خالی نہ کرنے پر مصر تھیں۔ کیوں کہ یہاں اُن کی انا کی تسکین کا سارا سامان موجود تھا۔ اب ہم جس مکان میں ہیں اس کا پڑوسی ہر روز اپنی بیوی کو اس طرح سے پیٹتا ہے جس طرح ہم ہر روز تین وقت پابندی سے کھانا کھاتے ہیں۔ اس کی بیوی اپنے شوہر کی اتنی اطاعت گزار و مطیع ہے کہ جب اس کا شوہر گھر آتا ہے تو وہ فوراً اس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھما کر سر جھکائے ''سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں ہے''۔ والی پوزیشن میں آجاتی ہے۔ ہم اس منظر سے روز محظوظ ہوتے ہیں۔ ہماری زوجہ محترمہ اصرار کرتی ہے کہ ہم یہ مکان خالی کر دیں لیکن ہمارے جیتے جی یہ ممکن نہیں۔ ہماری بیگم صاحبہ پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا ہے۔ اب انہوں نے اپنی زبان کو کم اور آنکھوں کو زیادہ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔''(۳۰)

بے تکلفی سلیم مقصود کے اسلوب کی تازہ کاری ہے، وہ اپنے تخلیقی فن کے ماہر ہیں۔ بے تکلفی کا عنصر ان کی تحریروں میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہ خوبی ان کے انشائیہ ''عاشقی برائے شاعری'' میں بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہمارے ایک ناقد نے ہماری شاعری کا بغور جائزہ لینے کے بعد فرمایا۔ ''یار! کیا تم شاعری زرہ بکتر بند پہن کو ہاتھ میں تلوار لے کر کرتے ہو؟'' ہم نے جواب دیا۔ ''بالکل نہیں''۔ پھر کہنے لگے۔ تمہاری شاعری سے جنگ و جدال بلکہ انسانی خون کی بو آتی ہے۔ جمالیاتی حس تم میں ہرگز نہیں بلکہ نازک احساسات کا فقدان ہے تمہاری شاعری میں۔''(۳۱)

انشائیہ عربی لفظ انشاء سے مشتق ہے جس کے معنی عبارت آرائی، کوئی بات دل سے پیدا کرنے کے ہیں۔ یہ مصنف پہ منحصر ہوتا ہے کہ وہ کس طرح کے معنی استعمال کرتا ہے۔ انشائیہ کی یہ خوبی سلیم مقصود کے پاس بھی ملتی ہے۔ وہ اس خوبی کا استعمال بہتر انداز میں کرتے ہیں ''آ بیل مجھے مار'' اس انشائیہ میں یہ خوبی ملتی ہے۔ وہ بیلوں کے معنی کبھی سیاسی لیڈروں کے لیتے ہیں تو کبھی عوام یا جنتا کے لیتے ہیں ملاحظہ ہو:

''ان کے ایک مضمون کا عنوان تھا۔ ''دو بیلوں کی جوڑی خوب سجے گی۔

(یہ مضمون انہوں نے اپنے اور اپنے ایک عزیز ترین دوست کے بارے میں لکھا تھا حالانکہ یہ محاورہ ہمارے ملک کی ایک سیاسی جماعت کا انتخابی نشان تھا۔ پھر اس جماعت سے دو بیلوں کی یہ جوڑی چھن گئی اور صرف ان کو ہانکنے والے رہ گئے جس سے اب تک وہ عوام کو جس سمت میں چاہتی ہے ہانک دیتی ہے۔''
(۳۲)

سلیم مقصود سماج پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ساتھ ہی فلموں پر بھی۔ یہ نرالہ انداز ان کی تحریروں کو سب سے جدا بناتا ہے۔ اس نرالے انداز سے آپ بھی لطف اندوز ہوئیے:

''لو میرج کی ابتداء اکثر فلم سے ہوتی ہے۔ اور یہ فلم پر ختم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ہمارے ایک دوست نے ''لو میرج'' فلم دیکھ کر ''لو'' کی فلم ''شادی'' دیکھ کر شادی کر لی اور فلم ''طلاق'' دیکھ کر اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ دراصل فلم میں وہ چیزیں دکھائی جاتی ہیں جو ہماری زندگی میں نہیں ہوتیں۔ ہمارے محلّہ میں ایک فلم زدہ شادی شدہ جوڑا رہا کرتا تھا جس کی ازدواجی زندگی ہندوستانی فلموں کی طرح فلاپ ہو چکی تھی۔ اکثر ہیرو ہیروئین میں کسی نہ کسی بات پر ٹھن جاتی۔ اور ہیروئین بڑے غمگین انداز میں لڑائی کے بعد یہ گانا گانے لگتیں۔

میں نے کب تم سے کہا تھا کہ مجھے پیار کرو
پیار جب تم نے کیا تھا تو نبھایا ہوتا

اور ہیرو گانے لگتے

گزرے ہیں آج عشق کے اس مقام سے
نفرت سی ہو گئی ہے محبت کے نام سے''(۳۳)

سلیم مقصود کے انشائیے کے مزاج کو مدنظر رکھیں تو سلیم مقصود کے فن میں تقریباً تمام خصوصیات ملتی ہیں۔ ان کے انشائیوں میں غیر رسمی طریقہ کار بھی ہے اور بات سے بات نکالنے کا ہنر بھی بکثرت پایا جاتا ہے۔ اسلوب سادہ اور رواں ہے۔ احتجاج، آ بیل مجھے مار، ایک کھنٹے کا سفر، شادی خانہ آبادی ان کے اچھے انشائیے ہیں۔ سلیم مقصود کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہے۔ ان کی تحریر میں سیاسی اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ سلیم مقصود کا انداز بیان نرالا ہے، وہ مسائل کو سلجھانے کی کوشش میں جانوروں سے مثالیں دے دے کر اپنا مطلب بیان کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کی اہم خصوصیت عدم تکمیل بہت خوبصورت انداز میں پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں ذات کا انکشاف خارجی خوبیوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ان کی تحریریں قاری کی سوچ کو متاثر کرتی ہیں۔ ان کے یہاں مزاح کی چاشنی کم

اورطنز کی کاٹ زیادہ ہے۔ان کے ہاں زبان و بیان کی خوبیاں بھی ملتی ہیں مثلاً محاورے،ضرب الامثال،تشبیہ،تلمیح کا استعمال ملتا ہے۔اس کے علاوہ سلیم مقصود کے ہاں فلمی نغموں اور فلموں کی بھی جھلک ملتی ہے۔سلیم مقصود کے انشائیوں میں اختصار کی خوبی کے ساتھ ساتھ سماجی طنز کے تیر انبساط میں پیوست ہیں۔ان کے انشایئے بہترین کہلانے کے مستحق ہیں۔

۸.۴۔سید رحیم الدین توفیق

سید رحیم الدین توفیق ۴/اکتوبر ۱۹۳۲ء میں سید یوسف الدین کے گھر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔چنچل گوڑہ ہائی اسکول، دارالعلوم، سٹی کالج اور ویویک وردھنی سے تعلیم حاصل کی۔والد کے انتقال کے بعد انھیں تعلیم ترک کر کے ملازمت کرنی پڑی۔بی۔اے کی تکمیل کے بعد ایم۔اے پولیٹکل سائنس اتکل یونیورسٹی سے کیا IDPL میں گیسٹ ہاؤز مینیجر کی حیثیت سے خدمت انجام دیں۔اردو ادب سے فطری لگاؤ رکھتے تھے۔موسیقی اور باغبانی سے بھی دلچسپی تھی۔اکثر ان کے مزاحیہ مضامین رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔شگوفہ میں طنز و مزاح اور انشائیے شائع ہو چکے ہیں۔ان کا انتقال ۱۴/مارچ/ ۲۰۰۲ء میں ہوا۔

رحیم الدین توفیق ایک منفرد انشائیہ نگار ہیں۔ان کی تحریر کا انداز بالکل منفرد ہے۔وہ اپنے انشائیے کسی محاورے یا کہاوت سے شروع کرتے ہیں۔جس طرح استاد بنیادی سوالات کے ذریعہ طلباء سے عنوان اخذ کرواتے ہیں اسی طرح وہ اپنے انشائیہ کو شروع کرتے وقت عنوان کی تعریف پیش کرتے ہیں۔ان کا انشائیہ ''مردہ بدست زندہ'' کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''ایک مشہور کہاوت ہے۔مردہ بدست زندہ۔بے چارہ زندوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔وہ جو چاہے اس کا حشر کریں۔انتہائی بے بسی کی ایسی مثال ملنی مشکل ہے۔ جتنا وہ بے بس ہوتا ہے اتنی ہی شدت سے لوگوں کی انسانیت جاگ اٹھتی ہے اور وہ بڑے احترام اور اہتمام سے اس کی آخری رسومات انجام دیتے ہیں۔مردے پر مکھی تک بیٹھنے نہیں دیتے کہ حقیر سی مکھی اس کے لئے پہاڑ کی طرح وزن ہو جاتی ہے۔نہلانے سے پہلے پانی میں انگلیاں ڈبو کر تپش دیکھ لیتے ہیں۔گویا مردے بھی سرد اور گرم محسوس کرتے ہیں۔ایسے نازک اور لطیف احساسات انسانیت کی معراج ہیں جن کا اظہار صرف اسی دن اسی وقت ہوتا ہے۔بعد میں یہ جذبات یوں بھاپ بن کر اڑ جاتے ہیں جیسے دھوپ سے شبنم ایسا رویہ زندوں کے ساتھ روا نہیں رہتا۔محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ وہیں لوگ ہیں۔شاید یہ اس لئے کہ مرحوم ان سے اختلاف کرنے کے جرائت یا حماقت نہیں کر سکتے۔''(۳۴)

ان کے انشائیہ طوالت کے اعتبار سے مختصر ہیں۔تاہم مناسب الفاظ اور سادہ جملے میں معنی کی وسعت کو سمیٹتے ہوئے وہ قاری کو اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔جس سے ذہنی اپج اور نکتہ آفرینی کا جوہر کھلتا ہوا معلوم ہوتا

ہے اس سلسلے میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''جن حضرات کی بیلنس شیٹ میں بہت گڑبڑ ہوتی ہے وہ انتہائی منکسر المزاج اور حلیم الطبع بن جاتے ہیں۔ان کے لبوں پر لوگوں کے لئے نصیحتوں کی بجائے دعائیں ہوتی ہے۔''(۳۵)

اس انشائیہ میں مصنف اپنا نقطہءنظر خوبصورتی سے بیان کرنے پر قادر نظر آتا ہے۔اس کے علاوہ وہ کہیں بہت دور کی کوڑی لانے میں کامیاب نظر آتا ہے۔انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ بات کرنے بہانا ڈھونڈتا ہے اور بات سے بات کرتا چلا جاتا ہے۔سید رحیم الدین توفیق کا بات سے بات پیدا کرنے کا انداز ملاحظہ فرمائیں:

''دکھتی رگ کی نوعیت ہر بندہ کے لحاظ سے جدا جدا ہوتی ہے۔بعض کی دکھتی رگ کوئی شخصیت ہوتی ہے۔عورت مرد کی تخصیص نہیں بعض کی کوئی فطری کمزوری بعض کا کوئی جسمانی عیب یا نقص یا بعض کی کوئی ایسی دانستہ ''حرکت'' جس کا داغ اس کے کردار کو ہمیشہ کے لئے داغ دار کر جاتا ہے اور اسے صاف کرنے والی ایسی کوئی تلافئ مافات جیسی چیز نہیں ہوتی جس کے صحیح طریقہ استعمال کے بعد لوگ اس داغ کو ڈھونڈتے رہ جائیں۔''(۳۶)

رحیم الدین توفیق اپنے آس پاس کے ماحول سے متاثر ہیں۔ان کے انشائیوں میں انکشاف ذات اور غیر رسمی انداز بھی ہے۔اور شگفتگی کے عنصر نمایاں نظر آتے ہیں۔وہ شگفتگی سے اپنا حال دل کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

''بنک میں ایک معمر اور بہت ہی مہذب خاتون ہمارے قریب آئیں اور عاجزی سے کہا بیٹا یہ فارم تو بھر دو پہلے تو ہم نے سوچا آیا انہوں نے وہی کہا جو ہم نے سنا۔اور جب یقین آ گیا تو بڑی شرمندگی ہوئی ہم نے جلدی سے فارم ان کے ہاتھ سے لیا اور چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا کے کہیں اس مزاق سے کوئی لطف اندوز تو نہیں ہو رہا۔ بنک سے باہر نکلے تو فقیروں نے گھیر لیا دو ایک کے ہاتھ میں روپیہ اٹھنی تھما کر آگے بڑھے تو باقی نے راستہ روک لیا ہم نے انہیں سمجھایا کہ صاحبوں ہم وظیفہ یاب ہیں اور مہینہ بیس پچیس روپیے خیرات کی عیاشی نہیں کر سکتے اس پر ایک ناہنجار فقیر آگے بڑھ کر عاجزی سے بولا۔''بابا یہی تو اصل وقت ہے خیرات کرنے کا۔اب بھی نہیں کرو گے تو کب کرو گے۔یہ خیرات ہی وہاں کام آئے گی وظیفہ نہیں۔''(۳۷)

سید رحیم الدین توفیق عام چیزوں کو خاص بنا کر دیکھنے اور دیکھانے پر عبور رکھتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں دوستانہ اور بے تکلفانہ انداز پایا جاتا ہے۔جس میں انشائیہ نگار اپنی خواہشات، خیالات اور عادات واطوار کا بھی اعتراف کرتا ہے جو دوستانہ ماحول میں ممکن ہوسکتا ہے۔وہ اسی ماحول کو بے تکلفی سے پیش کرتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ایک طریقہ یہ ہے کہ تم ان کی قبر کو اس کفن سے ڈھانک دو، ان کی روح کو قرار آجائے گا۔ممکن ہے وہ تمہیں معاف کردیں انہوں نے کہا نہیں یار کفن چور اٹھالے جائیں گے اور جنت بھی ہاتھ سے جائے گی۔تو پھر یوں کرو اسے اپنے لئے ہی رکھ لو اور کسی کو دکھاؤ مت۔'' (۳۸)

سید رحیم الدین توفیق ''عورت تیرا نام کامیابی ہے'' میں لکھتے ہیں کہ ہر کامیاب شخص کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔اس انشائیہ میں انہوں نے دنیا کی تمام عورتوں کی صفت بیان کی ہے۔اور ساتھ ساتھ عورت کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔وہ مختلف عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے تجربات ومشاہدات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخی اور قدیم تصورات کو تحریر کا حصہ بناتے ہیں۔جب وہ تاریخی طور پر عورت کا حوالہ زیرِ بحث لاتے ہیں تو وہاں انھیں جہانگیر کی اور سکندر کی یاد آتی ہے۔ان کے خیال میں جہانگیر کی جہانگیری میں نور جہاں کا ہاتھ تھا، اگر نور جہاں نہ ہوتی تو جہانگیر ایک ضدی عیاش شہزادہ ہوتا۔جہانگیر کی کامیابی میں نور جہاں کا ہاتھ تھا۔اسی لئے وہ کامیاب بادشاہ بنا۔مصنف نے یہاں دوسری مثال سکندر کی دی ہے۔پر یہاں انداز دوسرا ہے۔یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''سکندر کو کامیاب بنانے کے لئے اس کے استاد نے چالاکی سے اسکی محبوبہ کو اس کے آگے یا پیچھے؟ سے ہٹا دیا۔پھر اس کے بعد سکندر نے بے لگام ہوکر جو فتوحات کا سلسلہ شروع کیا تو سیدھا ہندوستان آکر دم لیا۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ سکندر کی کامیابی بھی اس کی محبوبہ کی مرہون منت ہے اگر وہ اس کے راستہ سے نہیں ہٹتی تو؟ تو کیا ہوتا۔سکندر وہیں اپنی چھوٹی سی ریاست میں اپنے تخت کا وارث پیدا کرکے مرجاتا اور تاریخ میں اس کا نام اتنا مشہور نہ ہوتا۔''(۳۹)

اس طرح سید رحیم الدین توفیق انشائیے میں ''عورت تیرا نام کامیابی ہے'' میں اپنی آزاد خیالی کے جوہر دکھاتے ہوئے۔تاریخ کی بہادر اور کامیاب عورتوں جیسے چاند بی بی، مہارانی جھانسی وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ افسوس کرتے ہیں کہ یہ سلسلہ ان ہی پر ختم ہوگیا۔اب ایسی عورتیں ناپید ہیں۔

مجموعی طور پر سید رحیم الدین توفیق ایک ایسے انشائیہ نگار ہیں جن کے ہاں موضوعات کا تنوع اور بات

سے بات پیدا کرنے کا ہنر ہے۔ان کے ہاں شگفتگی کے عنصر نمایاں ہیں ۔ان کے انشائیوں میں دوستانہ اور بے تکلفانہ انداز پایا جاتا ہے۔ان کے ذہن میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو کسی عام تحریر کو انشائیہ سے قریب کر دیتی ہیں۔الفاظ سے کیفیات کے اظہار پر پوری طرح قدرت رکھتے ہیں ۔وہ اپنی معلومات کو موضوع کی مناسبت سے قاری تک دلچسپ اور بہترین انداز میں پہچاتے ہیں۔جس سے قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔وہ وقتِ ضرورت انگریزی الفاظ کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں محاورے، کہاوتیں، اور ضرب الامثال بکثرت پائے جاتے ہیں۔موضوع کی مناسبت کے لحاظ سے تحریف نگاری بھی ملتی ہے۔ان کو ہنسنے ہنسانے کا فن بخوبی آتا ہے اور قاری کو زیرِ لب مسکرانے پر مجبور کرتے ہیں۔وہ اپنی شخصیت اور داخلی کیفیت کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔عورت تیرا نام کامیابی ہے، خلا، تشہیر، دکھتی رگیں، بڑے موزی کو مارا، اور مردہ بدست زندہ ان کے بہترین انشائیے ہیں۔ان کی اسلوبیاتی انداز اور ان کی زندہ دلی ان کے انشائیوں کی شان ہے۔

۹.۴۔سید عباس متقی (ڈاکٹر)

سید عباس متقی ۱۷ر جنوری ۱۹۵۳ء جنگم میٹھ، فلک نما، حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کے بعد پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ''طنز و مزاح'' کے عنواں پر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے حاصل کی۔ ۱۹۸۸ء میں اردو پنڈت گریڈ اردو استاد مقرر ہوئے۔ ۲۰۱۱ء میں محکمہ تعلیمات سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوشی حاصل کی۔ مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی سے فارسی میں پی ایچ۔ ڈی کررہے ہیں۔ طنز و مزاح کے علاوہ منظوم ترجمہ کر چکے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ''دکھتی رگیں'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوچکی ہیں۔ ایک درجن سے زیادہ شعری اور نثری کتب شائع ہوچکی ہیں۔

''آخر یہ بڑھاپا آتا کیوں ہے'' ڈاکٹر سید عباس متقی کا انشائیہ ہے۔ اس انشائیہ میں مصنف نے بڑھاپے کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جوانی کی ناپائیداری اور جلو ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے کے مقابلے میں بڑھاپے کی مرتے دم تک ساتھ نبھاتے چلے جانا ایک رجائی پہلو ہے۔ اسی طرح بعض ایسے افعال و عادات ہیں جن پر عام زندگی پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر سید عباس متقی نے ان کے روشن پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ جیسے کہ بچپن کے بعد بچپن آ گیا ہو۔ ڈاکٹر سید عباس متقی اس انشائیہ میں شگفتگی کے ساتھ خود انکشافی کے پہلوؤں کو قلم بند کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

> ''اب یہی دیکھئے کہ کل پاپڑ کے لئے چھوٹے پوتے سے لڑائی ہوگئی ہم آدھا پاپڑ لینے پر مصر اور وہ پاؤ پاپڑ ہی دینے پر بضد۔ آخرش دونوں کی لڑائی میں پاپڑ چورا چورا ہوگیا۔ بوڑھاپے کی آمد کے ساتھ ہی پتہ نہیں ہم میں ہر چیز کی حرص کیوں پیدا ہوگئی۔ جوانی میں جو ہماری خوراک تھی بڑھاپے میں وہ دوگنی ہوگئی ہے۔ دعوتوں میں لوگ ہمارے ساتھ بیٹھنے سے گھبراتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہماری ہم طعامی میں ان کا نقصان ہے۔ ایک دعوت میں بڑا مزہ آیا ہم کدو کی کھیر کے دیوانے ہیں جب اس کا طشت آیا تو اس خیال سے کے دوسرا طشت فوراً ہی آجائے گا ہم نے طشت ہی اٹھا کر اپنی رکابی میں رکھ لی کہ کون چمچہ شماری میں وقت ضائع کرے۔ چمچہ گری ہو یا چمچہ شماری دونوں سے وقت ہی کیا اوقات خراب ہوتے ہیں۔ کدو کی کھیر کو نہ آنا تھا نہ آئی نصیب نوجوانوں کے ہم کیا کریں۔ لیکن کم بخت نوجوانوں نے ہمارا نام ہی کھیر رکھ دیا۔ بعض شریر تو لاحقے کے طور پر انوپم بھی لگا دیتے ہیں۔''(۴۰)

ڈاکٹر سید عباس متقی کا ایک اور انشائیہ ''بستر'' بھی ہے۔اس انشائیہ میں جہیز میں آئے ہوئے بستر سے انشائیہ کی ابتداء کرتے ہیں۔بستر کی خوبیاں دلکش انداز میں قلم بند کرتے ہیں۔گذرے ہوئے وقت اور موسموں کو یاد کرتے ہیں۔گذرا ہوا وقت بہت اچھا تھا۔بستر پر لیٹ تے ہی نیند کا اجانا اور محوخواب ہونا وہ اپنی ذاتی زندگی کے پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔وہ اس انشائیہ میں غریب کے بستر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غریب کا بستر ذکر کے لائق شئے نہیں ہے۔چونکہ بستر ہی نہیں ہوتا جو نہیں ہوتا اس کا ذکر کیسا؟ غریب جہاں نیند آئی وہ وہاں سو جاتا ہے۔انشائیہ نگار یہاں موسموں کا ذکر کرتے ہوئے بات سے بات پیدا کرتا ہے اور اپنے موضوع سے بار بار بھٹک جاتا ہے جس سے بے ربطگی پیدا ہوتی ہے۔ڈاکٹر سید عباس متقی کے یہاں یہ خوبی دیکھئے:

> ''غریبوں کا بستر کوئی لائق ذکر شئے ہے نہ اس کا سر نہ پاؤں، کبھی یہاں پڑ گئے کبھی وہاں۔گرما تو ان کے بستر پر زیادہ مہربان نہیں ہوتا لیکن برسات اور جاڑوں کے موسم ان پر نہایت مہربان ہوتے ہیں۔کچھ اس انداز سے ان کا مزاج پوچھتے ہیں کہ حکومت کو ان کا مزاج پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ان کا بستر ان کے دستر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔نہ دستر پر گوشت نہ بستر پر پوشت، محض ہڈیاں ہے کہ چیختی رہتی ہیں اور چیخ چیخ کر قومی ترانہ سناتی ہیں۔مائیں اپنے نو نہالوں کو اپنے سینے سے چپکائے برسات بتا دیتی ہیں تو باپ ٹپکوں کے طفیل جاگ جاگ کر ساری رات گزار دیتا ہے۔ایک مزدور کو دیکھا گیا کہ وہ دعا کر رہا تھا اے خدا تو راج بھون، نیلائم اور راج محل جیسی عمارتوں کو ٹپکوں سے محروم رکھ۔ہمیں حیرت ہوئی یہ غالب کی زبان میں بددعا کر رہا ہے۔شاید اس کے خیال میں یہ رہا ہو کہ معدوم چھت ہی ٹپکوں سے محروم ہوسکتا ہے گویا نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں۔بڑے تو مشکلات حیات سے شعوری نبرآزمائی اختیار کرتے ہیں۔''(۴۱)

ڈاکٹر سید عباس متقی اپنے تخلیقی فن کے ماہر ہیں۔بے تکلفی کا عنصر ان کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔اس عنصر کی خوبی ان کا انشائیہ ''ایک ہنگامہ پہ موقف الیکشن'' دیکھئے وہ کس خوبی کے ساتھ یہ بتلاتے ہیں کہ الیکشن کے دوران لیڈر کی کیا حالت رہتی ہے۔وہ کس طرح کی حرکتیں کرتا ہے۔ہندوستانی سیاست پر طنز کرتے ہیں۔عقلمند کرسی چھوڑ کر جانے پر مجبور ہیں تو جاہلوں کا راج چلتا ہے۔الیکشن کے ایام میں سڑکوں پر ایک عجیب وغریب وحشت ناک ہمہ ہمی ہوتی ہے۔انسان کم جانور زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔اور لیڈر بے تکلفی سے اووٹ مانگتے ہیں۔ڈاکٹر سید عباس متقی نے بے تکلفی کے ساتھ الیکشن کا نقشہ بہترین انداز میں کھینچا ہے۔بے تکلف ہو کر ملاحظہ ہو:

''خبردار ''گدھے'' کو ووٹ نہیں دینا۔ وہ آپ کے گھر کا ہے نہ اپنے گھاٹ کا۔ کون حقدار ہے۔ یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اس نے اپنی محبوبہ کے آشنا کا قتل کر دیا ہے۔ اپنی دیوڑھی کا ایک حصہ بیچ کر چھٹکارا پایا ہے۔ بھلّو نے مرتے وقت یہ بات بتائی ___ دوستو! کیا آپ ایسے نیچ۔ کم ظرف۔ گدھے کو ووٹ دینگے۔ آپ کا کتا آپ کا اپنا ہے۔ راتوں میں جاگنے والا۔ بھونکنے والا۔ غنڈہ کورس۔ آج یہ سب کا کہنا ہے۔ کتا آپ کا اپنا ہے۔'' کتے کو ووٹ دو۔ کتے کو ووٹ دو۔''(۴۲)

انشائیہ کا سارا حسن زبان کے استعمال میں ہوتا ہے۔ اس لئے انشائیہ نگار کو صاحبِ اسلوب مانا جاتا ہے۔ انشائیہ وہ صنف ہے جو زبان کو قوت اور وسعت بخشتی ہے اور حسن بھی۔ انشائیہ میں دیگر زبانوں کے استعمال سے زبانیں زندہ رہتی ہیں۔ اور قاری کو دوسری زبانوں کے الفاظ اور دیگر زبانیں سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ ڈاکٹر سید عباس متقی کی تحریروں میں دکنی زبان کا استعمال بہترین انداز میں ملتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہم کسی کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتے خواہ وہ رونے والا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ ہاتھ جوڑ کر آہ وزاری کا سبب دریافت کیا۔ ارشاد ہوا۔ مابدولت کا منشا یہ نہیں تھا کہ حیدرآباد فرخندہ بنیاد بنے صرف پتھر کے عمارتاں تعمیر کی جائیں۔ اپنے رب سوں مابدولت نے یو مناجات کی تھی مرا شہر لوگاں سوں معمور کر۔ لوگاں بھی کیسے ہمارے لوگاں کے نمن تمنا جیسے نئیں۔ تمہارا شمار لوگاں میں کیکو ہوئیگا۔ نیں نیں۔ نا تمارے کنے من کی دولت ناتن کی عزت ہوروں کے پاس نہ اپنوں کا لحاظ۔ میں شہر میں ادمیاں منگا تھا پن کی یاں ادمیاں چ نیں دستیں۔ یہ نکو سمجھو منجے کچ نیں معلوم۔ منج سب پتہ ہے۔ کاں کیا ہورائے سب منجے معلوم ہے''۔ شہزادہ کا یہ شکوہ سن کر ہم شرم سے پانی پانی ہو رہے تھے۔ اب تو ہمیں بھی اپنی حالت پر اور اپنے شہر اور اس کے باسیوں کی حالت پر رونا آیا۔ بادشاہ کی آواز میں آواز ملا کر رونے لگے۔''(۴۳)

ڈاکٹر سید عباس متقی انشائیہ کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے لئے با کثرت فارسی کے جملے استعمال کرتے ہیں۔ دیکھئے:

''ہم نوشہ وعروسہ اور موجودہ صرف میاں بیوی، کئی عدد بچوں کے ساتھ اپنے بستر پر گولڈن جبلی منانے کا ارمان رکھتے ہیں۔ اے سبا آرزو کے خاک

شُدی۔''(۴۴)

ڈاکٹر سید عباس متقی فارسی جملوں کے علاوہ شعر کا بھی بخوبی استعمال کرتے ہیں۔ملاحظہ ہو:

''دل شکر گزار ہو تو ایک نعمت ہزار نعمت ہے اور اگر دل کفران نعمت کی نحوست سے دوچار ہو تو ہزار نعمت بھی ایک نعمت نہیں۔شاید مولانا رومی نے اسی نکتہ کو اپنی مثنوی کی زینت بنایا تھا۔

شکر نعمت افزوں کند فکر نعمت از کفت بیرون کند''(۴۵)

ڈاکٹر سید عباس متقی کے انشائیوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی انشائیہ نگاری میں تقریباً تمام خصوصیات عمدہ ہیں۔ان کے انشائیوں کی خاص خصوصیت یہی ہے کہ وہ ہلکے پھلکے مزاح وطنز کے ساتھ اپنی بات کو شگوفتہ پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ان کے ہاں شخصیت کا اظہار، بے تکلف گفتگو، غور وفکر کی دعوت کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ان کے انشائیہ اپنے اردگرد اور سماجی، معاشرے سے جنم لیتے ہیں۔ان کا اسلوب ان کی سوچ کو ظاہر کر دیتا ہے۔وہ اپنی زندگی کے تجربات وہ مشاہدات کے پہلوؤں کو انشائیہ کے ذریعہ قاری تک پہنچا دیتے ہیں۔ان کی تحریروں میں بات سے بات پیدا کرنا اور بے ترتیبی کثرت سے پائی جاتی ہے۔یہی خصوصیات ان کے انشائیوں کا خاص وصف ہے۔اس کے علاوہ زبان وبیان کی بے شمار خوبیاں پائی جاتی ہیں جیسے تشبیہات، استعارات، محاورے، ضرب الامثال، تلمیح اور صنعتوں کا باکثرت استعمال ان کے اسلوب کی خصوصیات ہیں۔اس کے علاوہ زبانوں کی خوبیوں میں فارسی اور دکنی اردو کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔یہی خصوصیت ان کو دیگر انشائیہ نگاروں سے منفرد رکھتی ہیں۔

۱۰.۴۔شمیم علیم (پروفیسر)

شمیم اختر ناگپور میں پیدا ہوئیں۔ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی اور ناگپور یونیورسٹی سے پولیٹکل سائنس اور پبلک ایڈمنسٹریشن میں ایم۔اے کیا۔پی ایچ ڈی کی ڈگری عثمانیہ یونیورسٹی سے حاصل کی اور جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہوگئیں۔پھر صدر شعبہ، بورڈ آف اسٹڈیز کی صدر اور یونیورسٹی کی اکیڈیمک رکن بھی رہیں۔انھیں پبلک ایڈمنسٹریشن کے لیے بیرونی اسکالرشپ ملی۔اس کے متعلق کئی کتابیں بھی لکھیں۔اچانک اردو کے میدان میں داخل ہوگئیں۔ان کی اردو میں پہلی کتاب ''عکس کائنات'' انشائیوں کا مجموعہ ہے۔وہ بنیادی طور پر انشائیہ نگار ہیں اب تک ان کے تین انشائیوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ا۔عکس کائیات ۲۔سوندھی مٹی کا عطر اور ۳۔جاگ عورت جاگ۔وہ کامیاب افسانے نگار اور انشائیہ نگار بھی ہے۔

شمیم علیم نے مختلف موضوعات پر انشائیہ تحریر کئے جن میں کچھ کا تعلق خارجی مظاہرے سے ہے۔''یہ درد اگر نہ ہوتا'' یہ شمیم علیم کا انشائیہ ہے اس میں وہ درد کے بارے میں بتلاتی ہیں کہ درد کے اقسام ہوتے ہیں۔درد کو ناپنے کا آلہ ابھی تک تیار نہیں کیا گیا۔سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے چاند تک جا پہنچا اور خطرناک سے خطرناک بیماری کا علاج کھوج نکالا لیکن درد کے ناپنے کا آلہ نہ بنا سکا۔درد بھی زندگی کا حصہ ہے، ان کے انشائیوں میں نکتہ آفرینی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔انھوں نے بات کا رخ کتنی آسانی سے موڑ دیا کہ گفتگو آگے بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔اس انشائیہ میں ہر پیراگراف میں ایک نئی بات ہوتی ہے، بات سے بات پیدا کرتے ہوئے وہ انشائیہ کی ایک اہم تکنیک غیر رسمی طریقہ کار کو دلکش پیرائے میں پیش کرتی ہیں۔یہ دلکش انداز ملاحظہ ہو:

> ''اب ذرا ہمارے موجودہ صدر ہند عبدالکلام صاحب کے بالوں کو ہی دیکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے صدر بننے میں سب سے زیادہ اہم رول ان کے بالوں نے ادا کیا۔واجپائی صاحب کی شرط تھی کہ جس کے بال سب سے لمبے اور بے مثال بلکہ بے مہار ہوں گے انہیں صدر بنایا جائے گا جب کہ کئی مضبوط امیدواروں نے رام مندر کے چکر میں اپنا حلیہ ہی بدل دیا تھا۔''(۴۶)

شمیم علیم کا مطالعہ کافی وسیع ہے ان کی سماج پر گہری نظر ہے۔''جستجو امریکہ میں ایک کمرہ کی'' اس انشائیہ میں امریکہ کی طرز زندگی پر ہلکا سا طنز کرتی ہیں۔ہندوستان میں زندگی گزارنے کے کچھ طور طریقے ہیں۔امریکہ کا ماحول آزادانہ ہے، آزادانہ ماحول سے ہونے والی غلطیوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں، یہ دلکش انداز دیکھئے:

> ''انھوں نے پوچھا کیا آپ شادی شدہ ہیں؟ ہم نے دبی زبان میں کہا جی نہیں پھر دوسرا سوال کیا گیا۔کیا آپ کے بچے ہیں؟ ہمیں اس سوال پر بہت

تعجب ہوا کہ جب ہماری شادی نہیں ہوئی تو بچے کہاں سے آئیں گے؟ ۔لیکن پھر ایک دم خیال آیا کہ میاں یہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے یہاں ہر قسم کی آزادی ہے تمہاری طرح نہیں جو ابھی بھی لکیر کے فقیر ہوں۔''(۴۷)

''سوندھی مٹی کا عطر''، شمیم علیم کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔اس کے موضوع سے ہی واضح ہوتا ہے کہ وطن کی مٹی کی خوشبو کو مصنفہ کو کس حد تک جذباتی لگاؤ ہے۔امریکہ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد اپنے وطن کو یاد کرتی ہیں، اپنے وطن سے لگاؤں کا تذکرہ دلکش پیرائے میں پیش کرتی ہیں جیسا بھی ہو اپنا ملک اپنا ہوتا ہے۔اس خوبصورت اور دلکش انداز کو دیکھئے:

''جب خشک مٹی پر پہلی بار بارش کی بوندیں گرتیں ہیں اور وہ گیلی ہو جاتی ہے تو اس کی سوندھی سوندھی خوشبو سے بہتر خوشبو نہیں مل سکتی۔سوچئے نا، لوگ اپنے ملک سے دور اس مٹی اور مٹی کی خوشبو کے لئے کتنا ترستے ہیں۔اگر اس خوشبو کو ہم عطر کی شیشی میں بند کر کے بیرونی ممالک میں رہنے والے ہندوستانیوں تک پہنچا دیں تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔لوگ ٹوٹ پڑیں گے اپنے ملک کی مٹی کی خوشبو کے لئے۔''(۴۸)

شمیم علیم کے بارے میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کا خیال کچھ اس طرح ہے:

''شمیم علیم بنیادی طور پر انشائیہ نگار ہیں لیکن کہیں کہیں مزاح کی ہلکی ہلکی چاشنی اور تھوڑا بہت طنزیہ پیرایہ ان کی تحریر میں دلکشی اور لطف کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔شمیم علیم کی آس پاس کی زندگی اور نشیب و فراز پر گہری نظر ہے۔وہ تفصیل سے کام نہیں لیتیں۔مختصر مختصر لکھ دیتی ہیں لیکن موضوع کا احاطہ کرتے وقت عصری زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جس پر ان کی نظر نہ گئی ہو۔انشائیہ نگار کے لئے موضوعات کی کوئی قید نہیں ہوتی۔اسے لکھنا آتا ہے اور ہر موضوع پر اس کا قلم رواں ہوتا ہے۔''(۴۹)

شمیم علیم انشائیوں میں سماج کے خامیوں کی نشاندہی کرتی ہیں قارئین کو فکر کی طرف آمدہ کرتے ہوئے سماجی بھلائی کی طرف راغب کرتی ہیں۔ان کا انشائیہ ''اور بھی ہیں داستانیں بندروں کی'' میں آج کل کے تعلیمی ماحول پر طنز کرتی ہیں طالبات کی شرارتوں اور حرکتوں کو بندروں کی حرکتوں سے تشبیہ دیتی ہیں۔اقتباس ملاحظ ہو:

''امریکہ آنے کے بعد ایک دن اچانک ہماری ملاقات پھر بندروں سے ہوگئی (اس میں بس اور اس کے ساتھیوں کا ذکر نہیں ہے) بندر ہم سے اتنی محبت

سے ملے کہ ہمیں یقین ہوگیا کہ ضرور یہ ہمارے ویمنس کالج کے دوست ہیں۔
ہم ایک کار میں بیٹھے کینڈا کے سفاری چڑیا گھر میں کھلے جانوروں کا نظارہ
کررہے تھے۔ہم نے وہاں شیر دیکھا لیکن اس نے گھانس بھی نہیں ڈالی۔ہم
ادھرادھر دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک بندروں نے ہماری گاڑی کوگھیرلیا۔کوئی
چھت کے اوپر چڑھ گیا تو کوئی سامنے گلاس پر جا بیٹھا۔دوایک بندر کھڑکی سے
لٹک کر اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔کھڑکی کے آئینے تو بند تھے پھر بھی
مارے ڈر کے ہمارا حال برا تھا۔ہم نے ان کی بہت خوشامد کی۔آئندہ ملے کا
وعدہ کیا۔تب کہیں انہوں نے ہماری جان چھوڑی۔بس وہ دن اورآج کا دن
ہم نے کبھی بندر کا تصور تک نہیں کیا۔لیکن مجتبیٰ حسین کے مضمون نے آج ہماری
بھولی بسری یادوں کوتازہ کردیا۔خدا سے دعا ہے کہ ہمیں ہرقسم کے بندروں سے
چاہے وہ جانور ہوں یاانسان دوررکھے۔۔آمین،،(۵۰)

خواتین انشائیہ نگاروں میں ایک اہم نام پروفیسر شمیم علیم کا بھی ہے۔ان کے چند انشائیے قارئین کے لئے دلچسپی کا سامان رکھتے ہیں۔ یہ ایک خاتون ہونے کے ناطے خواتین کے مسائل کوموضوع بناتی ہیں۔خواتین کے حالات زار پران کی تحریریں زیادہ ملتی ہیں جیسے طلاق، بیوی سے شوہر کی بےتوجہی، معاشرہ کی بےحسی، اور جہیز کی لعنت وغیرہ اس کے علاوہ سماج کے ٹھیکیداروں اور سیاستدانوں پر طنز بھی کرتی ہیں۔ وہ قاری کوفکر پر آمدہ کرتی ہیں اور معاشرے کی صلاۃ وفلاح کے لئے متوجہ کرتی ہیں۔ان کے زیادہ تر انشائیوں میں وہ اپنی خوش طبعی سے رنگ بھرتی ہیں اور طنز ومزاح کی ہلکی ہلکی لہروں سے کام لے کر وہ مسکراہٹوں کے پھول بکھیرتی ہیں۔ان کے انشائیہ مختصر ہوتے ہیں، ان کے ہاں بےتکلفی، بےربطی اور غیر رسمی طریقہ کار بھی موجود ہے۔ان کے انشائیے قاری کومسحور کرتے ہیں۔

۱۱.۴۔ عابد معز (ڈاکٹر)

نام سید خواجہ معز الدین ہے۔ قلمی نام ''عابد معز'' لکھتے ہیں۔ ۲۵ر جنوری ۱۹۵۵ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۷۹ء عثمانیہ یونیورسٹی میڈیکل کالج سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا اور ۱۹۸۵ء میں ایم۔ ایس۔ سی (تغذیہ) سے کیا۔ چند برس حیدرآباد میں سیول اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے خدمت انجام دیئے۔ ۱۹۸۷ء میں سعودی عرب کا رخ کیا اور منسٹری آف ہیلت ریاض، سعودی عرب میں برسرخدمت ہیں۔ عابد معز مزاح نگار اور انشائیہ نگار بھی ہیں۔ طب پر بھی کئی مضامین لکھے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ''واہ حیدرآباد'' حیدرآباد شہر کے مختلف سماجی اور معاشرتی پہلوؤں پر لکھی گئی ہے، یہ اپنے طرز کی واحد کتاب ہے۔ پھر انشائیوں کا مجموعہ ''سک گزیدہ'' شائع ہوا ہے ان کی تحریریں سادہ اور سلیس ہیں۔ ''یہ ناتھی ہماری قسمت'' عابد معز کے شگفتہ افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ ''پھر چھڑی بات'' روزنامہ اعتماد اور اوراق میں شائع ہونے والے کالموں اور انشائیوں کا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ ''بات سے بات'' کالموں کا مجموعہ ہے جو عرب کی ہفتہ روز رسالہ میں شائع ہوتے تھے۔ ''فارغ البال'' یہ طنز و مزاحیہ مضامین، افسانوں اور کالموں کے بعد انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ ''اردو ہے جس کا نام''، ''عابد معز نمبر'' (ماہنامہ شگوفہ)۔ ڈاکٹر مزاح نگار نمبر (ماہنامہ عدسہ)۔ اس کے علاوہ سائنسی مضامین کے کتب بھی شائع ہوچکی ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں ذیابیطس کے ساتھ ساتھ، چکنائی اور ہماری صحت، کولسٹرال کم کیجئے، رمضان اور ہماری صحت، حج وعمرہ اور ہماری صحت، فاسٹ فوڈ اور سافٹ ڈرنگ وغیرہ۔ ان کے انشائیوں میں عمدہ انشائیہ یہ ہیں خوش آمدید یا شہر حلیم، نو دو گیارہ کے پانچ سال، اردو کی نئی بستیاں، تکیہ، بش کے پیٹ میں درد، تیل کی سنچری، پاشو باہر سے آیا، آٹو رکشہ کرائے پر، بموں کے ماں باپ اور ہائی ٹیک زندگی وغیرہ۔ ان کے انشائیوں میں حقیقت پسندی اور واقعیت پسندی نظر آتی ہیں۔

''بش کے پیٹ میں درد'' ڈاکٹر عابد معز کا عمدہ انشائیہ ہے۔ اس انشائیہ میں عصر حاضر کی آگہی سے آگاہ کرواتے ہیں۔ وہ بش کے غیر دانشمندانہ سیاسی عزائم پر بھرپور چوٹ کرتے ہیں۔ انہوں نے بش اور امریکہ کا بھی مذاق اڑایا ہے۔ بش کے پیٹ میں درد شروع ہونے کے بعد جب القاعدہ کا نام نہیں لیا گیا تو تعجب ہوا۔ ڈاکٹر عابد معز کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں طنز کا شدید وار اس طرح کرتے ہیں کہ اس کی کاٹ کا مقصد حاصل ہوجاتا ہے۔ اس میں انشائیہ کی تازہ کاری بھی دیکھائی دیتی ہے اور اسلوب کی روانی بھی۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''پیٹ میں بے چینی محسوس ہونے والے دن صدر بش نے معمول کے
> مطابق ڈنر کیا تھا اور دوسرے جی آٹھ ممالک کے لیڈروں کے ساتھ غیر الکحل

بیئر سے شوق فرمایا تھا۔ دوسرے کسی لیڈر کے پیٹ نے گڑبڑ نہیں کی صرف بش کے پیٹ میں فساد ہوا۔ یہی امریکہ کے صدر کی انفرادیت بھی ہے۔ ویسے ماہرین کا خیال ہے کہ بش کے پیٹ میں شاید وائرس نے دہشت گردی مچائی ہے۔''(۵۱)

انشائیہ ''تیل کی سنچری'' میں ڈاکٹر عابد معز لکھتے ہیں کہ پچھلے چار برسوں میں پڑول قیمتیں چار گنا زیادہ ہوگئی ہیں۔ دنیا کی کسی شئے کی قیمت میں اتنا اضافہ نہیں ہوا۔ اس کے لئے وہ صدر امریکہ کو قصوروار ٹھراتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس شخص کی ناعاقبت اندیشی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہوئی ہے۔ بش نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دنیا کو امن وسکون دے گا اور علمی سطح پر سستے داموں تیل سربراہ کرے گا۔ تیل اور ڈالر کے مضبوط رشتے اور اس میں امریکی مفادات کا نقشہ اس تحریر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

''خام تیل اور ڈالر میں گہرا اور مضبوط رشتہ ہے۔ تیل کی خرید وفروخت ڈالر میں ہوتی ہے حالانکہ تیل نکالنے والے علاقوں میں ڈالر کا سکّہ نہیں چلتا لیکن تیل کا کاروبار ڈالر میں ہوتا ہے۔ شاید امریکیوں نے فارسی پڑھی ہے اور یہ بات دنیا سے چھپا رکھی ہے۔ ڈالر کے طاقتور ہونے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ پٹرول ڈالر میں بیچا جاتا ہے۔ بعض ماہرین اس گٹھ جوڑ کو پیڑول ڈالر کہتے ہیں۔'' (۵۲)

انشائیہ کی اہم تکنیک شخصیت کا اظہار بھی ہے۔ انشائیہ نگار اس میں اپنے ذاتی خیالات، جذبات اور مشاہدات کو بڑے خوبصورت پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ اسی پیش کش کے دوران انشائیہ نگار کی شخصیت کے پہلو قاری کے سامنے نمایاں ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر عابد معز کی شخصیت کے کئی پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ''مراشہر'' اس انشائیہ سے ڈاکٹر عابد معز کی مختلف پہلوؤں کی جھلک کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنے ہم وطنوں سے ملنے کے خواب سجائے جب اپنے شہر پہنچتے ہیں تب ان کے خواب ادھورے رہتے ہیں۔ کیونکہ سماج میں ہونے والے مختلف ناخوشگوار واقعات اور رسومات سے وہ تڑپ اٹھتے ہے۔ وہ اپنے خیالات ونظریات کو پیش کرتے ہیں۔ اور ان کا خلوص ہر جگہ ان کے انشائیوں میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔

''چھٹیوں کی تاریخ قریب آنے لگی تو میں خواب دیکھنے لگا۔ دوست احباب سے ملاقاتوں کے خواب دو میں تین چائے پی کر ہوٹلوں میں رات دیر گئے تک خوش گپیوں میں مصروف رہنے کا پروگرام' صبح نہاری ہوگی تو رات بریانی اڑیگی۔ سیکل پر بیٹھ کر چارمینار کے اطراف کی گلیوں کی سیر کرونگا' پان کھا کر

لال پیک سے اِدھراُدھر نقشے بناؤں گا۔گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوکر پرانی یادوں میں گم ہوجاؤں گا۔احباب کے چہرے نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔جب وہ مجھے دیکھیں گے کھلی بانہوں اور مسکراتے چہروں سے میرا استقبال کریں گے۔اور جب مجھے اپنے روبرو پائیں گے تو دوڑ کر لپٹ جائیں گے۔دائیں بائیں اور پھر دائیں گلے ملیں گے لیکن میرے خوابوں کی تعبیر الٹی نکلی۔میرا اپنا شہر اجنبی سالگا۔احباب کے اڑے اڑے خاموش چہرے غم کی تصویر بنے میرے سامنے آئے محسوس ہوا میں چھٹیاں گزارنے نہیں آیا بلکہ احباب کو پرسہ دینے آیا ہوں۔''(۵۳)

ڈاکٹر عابد معز ایک اچھے انشائیہ نگار ہیں۔اور انشائیہ کی شعریات کو شعوری طور پر ملحوظ رکھتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔ ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ان کے یہاں زبان و بیان کا استعمال بہت عمدہ ہے۔وہ اچھے انداز میں اس کا استعمال کرتے ہیں۔مثلاً محاوروں اور ضرب الامثال، تلمیح، تشبیہ کا استعمال بہت عمدہ ہے۔ یہاں دیکھئے کہ انشائیہ نگار نے کس خوبصورتی سے ایک ہی جملے میں تلمیح اور محاوروں کا استعمال کیا ہے۔

''اگر امن پسند شریف شہری ایک دوسرے کی مدد نہ کریں تو کیا دنیا میں امن و امان ہوگا۔اگر ہم خاموش رہے تو آج پڑوسی کی عزت پر حملہ ہوا ہے۔کل ہماری باری ہوگی۔گواہی تو دینی ہے۔سچ کہہ کون سا زہر کا پیالہ پینا ہے یا سولی پر لٹکنا ہے۔اپنے آپ کو ہمت دلانے کے باوجود بھی ہم پر ایک خوف سا طاری تھا۔''(۵۴)

اگر ہم ڈاکٹر عابد معز کے انشائیوں کا مجموعی طور پر جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر عابد معز کے فن میں تقریباً تمام خصوصیات سمٹی ہوئی ہیں۔ان کے انشائیوں میں غیر رسمی طریقہ کار بھی ہے اور بات سے بات نکالنے کا ہنر بھی۔اسلوب رواں اور سادہ ہے۔ان کے یہاں زبان و بیان کا عمدہ استعمال ہے مثلاً تشبیہ، تلمیح، محاورے، ضرب الامثال، صنعت تضاد اور روزمرہ کے الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔ڈاکٹر عابد معز ایک صاحب مطالعہ شخص ہیں۔ان کا اپنی تہذیب اور ثقافت سے رشتہ گہرا ہے۔تجربات اور مشاہدات کی رنگ آمیزی ان کی تحریروں میں جان پیدا کردیتی ہے۔ان کے انشائیوں میں عصری آگہی اور عصری بصارت بھی ہے۔وہ اپنے اطراف و اکناف کے ماحول سے واقف ہیں۔ان کے انشائیوں میں عام آدمی کے دکھ درد اور ان کے مسائل کی ترجمانی ملتی ہے۔ڈاکٹر عابد معز کے انشائیہ کی تشکیل و تعمیر میں سارے محرک اور عوامل نظر آتے ہیں۔ان کی تحریر قاری کے ذہن پر دیرپا اثر رکھتی ہیں

اور قاری کے ذہنوں کو متاثر بھی کرتی ہیں۔ان کے اسلوب کی دلکشی اور دل آویزی قاری کو مسحور کرتی ہے۔

۱۲۔۴۔عاتق شاہ خان

عاتق شاہ خان ۱۹۳۳ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو کیا۔اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سردار پٹیل کالج میں بحیثیت لکچرر خدمت انجام دیں۔افسانہ، رپورتاژ، تمثیل، سوانح، طنز و مزاح کے علاوہ انشائیہ میں طبع آزمائی کر چکے ہیں۔بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔فٹ پاتھ کی شہزادی، ایک وقت کا کھانا، مائی ڈیئر شکنتلا، ہم جنم جنم کے ساتھی، راستے کی کہانی، دو منٹ کی خاموشی اور بھی افسانے لکھے ہیں۔عابڈ روڈ سے خالی ہاتھ رپورتاژ ہے، میں کتھا سناتا ہوں تمثیل ہے، اور میں چیخو نگا سوانح ہے، چالیس قدم، انڈین کاجو، ماموں کی بکریاں طنز و مزاح ہیں۔اس کے علاوہ ان کے انشائیہ وقت بہ وقت رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

عاتق شاہ کی تحریروں میں انشائیہ نگاری کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ان کے انشائیہ مرکز کے اطراف گھومتے رہتے ہیں۔مثلاً ''ساڑی'' کا آغاز ہی انشائیہ نگاری کی سوچ اور اسلوب کو ظاہر کر دیتا ہے جس میں سماجی مطالعہ کی گہری جھلک دکھائی دیتی ہے۔اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''جو بات ساڑی میں ہے وہ کسی میں نہیں!
>
> ساڑی خواہ وہ ریشم کی ہو یا کھدر کی، کالی ہو یا سفید ساڑی، ساڑی ہے! ساڑی میں بڑی وسعت ہے اس کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ لگانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔بڑے بڑے پیروں قسم کے مرد ایک سرے سے دوسرے سرے تک زندگی بھر سفر کرتے رہے۔لیکن منزل تک پہنچ نہیں سکے۔اور عمر ختم ہو گئی۔ویسے ساڑی کی لمبائی پانچ گز سے چھ گز یعنی آج کے زمانے میں کچھ کم پونے چھ میٹر ہوتی ہے۔کوئی دبلی پتلی خاتون پونے پانچ میٹر پر اکتفا کرتی ہیں۔اور کوئی پھیلی پھیلی پونے چھ میٹر پر۔اس کے علاوہ یہ اپنے اپنے ظرف پر منحصر ہے کہ کہاں اور کیسے سمایا جائے۔''(۵۵)

اس انشائیہ میں عاتق شاہ نے ساڑی کی مقام پیدائش کا حال بیان کرتے ہوئے ساڑی کے اقسام گنوائے ہیں۔اور اس کو ہاتھوں ہاتھ لئے جانے کا تذکرہ اتنے دلکش انداز میں کرتے ہیں کہ قاری اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔عاتق شاہ چھوٹی چھوٹی اور روزمرہ اور سامنے دکھائی دینے والی چیزوں کو انشائیہ کا موضوع بناتے ہیں۔مثلاً ''ساڑی''، ''جھاڑ'' اور ''قینچی'' وغیرہ ان کے خوبصورت انشائیے ہیں۔صرف اشیاء اور مظاہر عاتق شاہ کی نگاہِ

انتخاب میں نہیں آتے بلکہ ان کی تحریروں میں افعال و اعمال، احساسات اور کیفیات بھی ان کے انشائیوں کے موضوع بنتے نظر آتے ہیں۔ ان کے انشائیہ کے مطابق ''جھاڑو'' ایک لفظ ہی نہیں اپنے پیچھے جذباتی اور جدلیاتی عمل کی پوری کہانی سمیٹے ہوئے ہے۔ اس لئے جملوں میں طنز کی کاٹ اور مزاح کی لہر کا پیدا ہوجانا فطری ہے۔ ''جھاڑو'' کے ایک لفظ کے ضمن میں ان کے ذہن میں ہزاروں شیوہ نے کیسے کیسے پہلو نکال لئے ہیں۔ ''جھاڑو'' کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''ہزاروں سال سے بھنگن بھنگی ہے۔ اور اس کی بیوی بھنگن۔ یہی نہیں بلکہ ان کے گھر میں ہر پیدا ہونے والا لڑکا یا لڑکی پیدائشی بھنگن یا بھنگی ہوتا ہے۔ آزادی کے پچاس برس بعد بھی ان کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا جب کہ ملک کی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں ان کے نام کی دہائی دے کر جینے والے معزز ارکان ٹھالی سے ایرکنڈیشنڈ روم میں رہتے ہیں۔ اور ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں۔۔۔!
>
> لیکن آج بھنگی یا بھنگن کو ہوش آ گیا ہے۔ ہزاروں برسوں کی نیند اور غفلت کے بعد وہ جاگ گئے ہیں۔ اب ان کی سمجھ میں آ رہا ہے کہ کن کن سطحوں پر ان کا استحصال کیا جاتا رہا۔ اب ان کے اور ان کے بچوں کے چہرے غصے سے تمتما کر لال بھبھوکا ہوگئے ہیں۔ انھوں نے اپنی اپنی جھاڑوؤں کو زمین پر پھینک دیا ہے۔''(۵۶)

عاتق شاہ افعال و اعمال کی طرح کیفیت کو بھی نظر انداز نہیں کرتے لہذا وہ قینچی کو اپنے مطابق نہیں بلکہ عقلی اور شعوری سطح پر دیکھتے ہیں۔ انہیں تخلیقی عمل کا مظاہرہ کرتے دیکھا جاسکتا ہے۔ عاتق شاہ کا فن ان کے دلیرانہ اور شگفتگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ شگفتگی سے کس طرح بے تکلف ہوکر بیان کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ قینچی بڑے کام کی چیز ہے۔ چاقو سے لے کر ٹیلرنگ ٹیبل تک وہ یوں کر کر چلتی ہے جیسے کسی خاتون کے منہ میں زبان۔ یہ بھی ایک محاورہ ہے جو مرد حضرات نے خواتین کے تعلق سے وضع کیا۔ (حالاں کہ محاورے وضع نہیں ہوتے) قینچی کی طرح عورتوں کی نہیں بلکہ مردوں کی صرف مردوں کی زبان چلتی رہتی ہے (استثنائی صورتوں کو چھوڑتے ہوئے) دن بھر اور رات بھر کے بڑے حصے تک وہ مسلسل بولتے جاتے ہیں۔ دراصل

اس محاورے کے ذریعہ عورتوں کو بدنام کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔اس کی بنیادی وجہ ایک ہی سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ مردوں کے ہاتھ میں چونکہ قلم تھا' اس لئے انھوں نے اپنے قلم کا ناجائز استعمال کیا۔اگر اس قلم کو چھین کر عورتوں کے ہاتھوں میں دے دیا جائے تو پتہ چلے گا کہ عورتوں کے زبان قینچی کی طرح چلتی ہے یا مردوں کی۔''(۵۷)

عاتق شاہ خان انشائیہ ''پیاز کا اغوا'' میں بڑھتی ہوئی گرانی کا ذکر کرتے ہوئے ،متوسط اور غریب طبقہ کے پریشان حال افراد کا ذکر کرتے ہیں جس کا گذر بسر اکثر پیاز پر ہوتا ہے۔عاتق شاہ اس انشائیہ میں روزمرہ کے الفاظ کا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''پیاز کی تلاش میں (دکان دکان) گھومتے ہوئے میں سوچنے لگا۔اس تلاش میں میں، تنہا نہیں تھا بلکہ میرے ساتھ بچے، بوڑھے مرد عورت (اپنے اپنے) ہاتھوں میں باسکٹس اور تھیلیاں لئے (حیران پریشان) (گلی گلی) اور (کوچہ کوچہ) گھوم رہے تھے!

بڑی سڑک پر ایک بڑا جنرل اسٹور تھا جو اپنی ایمانداری اور کم نرخوں کی وجہ سے مشہور تھا۔اور جہاں سے میں اکثر تو نہیں لیکن (کبھی کبھی کچھ نہ کچھ) خرید لیتا تھا۔

کار میں سے ایک لمبی چوڑی گوری چٹی عورت برآمد ہوئی جو (قریب قریب) چھ فٹ کی تھی۔''(۵۸)

عاتق شاہ کے فن انشائیہ نگاری کا یہ کمال ہے کہ ان کے اسلوب کی دلکشی اور دل آویزی جہاں قاری کو مسحور کرتی ہے وہیں عاتق شاہ کا قد وقامت بھی پوری طرح سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔عاتق شاہ اپنے مختصر انشائی خزانہ کے باوجود بڑے انشائیہ نگاروں کی فہرست میں جگہ پانے کے پوری طرح سے اہل اور حقدار نظر آتے ہیں۔

اگر ہم انشائیہ کے مجموعی مزاج کو مدنظر رکھیں تو عاتق شاہ کے فن میں تقریباً تمام خصوصیات سمٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ان کے انشائیوں میں غیر رسمی طریقہ کار بھی ہے اور زود ہضم بھی اور ایجاز واختصار بھی، نکتہ آفرینی بھی ہے اور بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر بھی، اسلوب بھی بہت خوب ہے، کہیں سادہ اور آسان تو کہیں بوجھل پن ہے۔

عاتق شاہ کے انشائیے بہترین انشائیوں میں شمار کئے جاتے ہیں کیونکہ ان کے انشائیوں کے مضامین روزمرہ کی استعمال شدہ چیزوں کے نام ہوتے ہیں۔عاتق شاہ مطالعہ کے عادی تھے ان کا اپنی تہذیب اور ثقافت سے رشتہ بہت گہرا تھا۔تجربات اور مشاہدات کی آمیزش اور متخیلہ کی رنگ آمیزی نے ان کی تحریروں میں جان پیدا

کردی تھی۔ عاتق شاہ اپنے انشائیوں کی تشکیل وتعمیر میں سارے محرک اور عوامل نظر میں رکھتے ہیں۔ عام موضوع میں وہ یوں رنگ آمیزی کرتے ہیں کہ قاری کی دلچسپی دوبالا ہوجاتی ہے۔اوراپنی دلکش شخصیت کی خوشبوتحریر میں اس طرح بھر دیتے ہیں جیسے عطار اپنے مشک میں رکھتا ہے۔

عاتق شاہ کی جاندار زبان بھی انشائیہ کے موضوع سے مطابقت رکھتی ہے۔ان کی تحریر نہ صرف بھرپور اثر رکھتی ہے بلکہ سوچ کو متاثر کرتی ہے۔ان کے انشائیوں میں طنز کے ہلکے سے نشتر ملتے ہیں اور مزاح کی چاشنی بہت خوب ہے۔عاتق شاہ باریک بین ہیں۔وہ اشیاء کو دیکھنے کے لئے جو زاویہ نظر رکھتے ہیں وہ قابلِ فخر ہے۔ان کے انشائیہ ایک نقطہ سے شروع ہوکر اسی مرکز کے اطراف گھومتے ہیں۔

۱۳.۴۔عبدالستار ساحرؔ (ڈاکٹر)

سید عبدالستار کی ولادت ۹/اگست ۱۹۵۷ء کو کڈپہ میں ہوئی۔ان کو سب قلمی نام ''ستار ساحرؔ'' کے نام سے جانتے ہیں۔ساحرؔ صاحب نے سابق صدر شعبہ اردو (جامعہ وینکٹیشوراتروپتی) محترم پروفیسر سلیمان اطہر جاوید صاحب سے پی ایچ ڈی کے لیے شرف تلمذ حاصل کیا۔بعد ازاں آپ کا تقرر بحیثیت اُستاد شعبہ اردو، جامعہ سری وینکٹیشوراتروپتی میں ہوا۔اسی یونیورسٹی میں چیرمین بورڈ آف اسٹڈیز بھی ہیں، اور امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کے ایم۔اے کا کورس بھی ترتیب دیا۔ستار ساحرؔ ایک بہترین پروفیسر، شاعر، اور انشائیہ نگار ہیں۔ان کی تصانیف یہ ہیں ''ہندوستانی تہذیبی عناصر'' محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں، ''دبستان'' گولکنڈہ کی شاعری میں، ہندوستانی عناصر، تنقیدات، جنوبی ہند میں اردو مرقع نگاری (ترتیب)، میزان (شہر کڈپہ کے شعر و ادب کا بدلتا مزاج)، نقوش تنقید، اکتساب فکر، اس کے علاوہ زیر ترتیب انشائیوں کا اور شعری مجموعے بھی آپ کی تحریرات کا حصہ ہے۔

ستار ساحرؔ کی علمی و ادبی خدمات کے عوض اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے ایوارڈ برائے ''تنقیدات'' اور ضلع سطح پر ڈسٹرکٹ کلکٹر کڈپہ کی جانب سے ''سپاس نامہ'' اور منجانب اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے بسٹ ٹیچر ایوارڈ سے نوازا۔

ستار ساحرؔ اپنی تحریروں کے ذریعہ انشائیہ نگاری کی رونق بڑھاتے چلے آرہے ہیں۔انشائیہ میں اختصار ان کی جان ہے۔ان کی تحریر کی لطافت سے پڑھنے والوں کے ذہنوں کی ترنگوں میں ایک نیا جوش اُمڈتا ہوا محسوس ہوتا ہے ساتھ ہی ان کی ظرافت سے مزین چٹکیاں سونے پر سہاگہ کا کام انجام دیتی ہیں۔آپ کے انشائیے بہترین انشائیے کہلاتے ہیں۔یہ زندہ دل تحریریں قاری کے ذہن و دل کو بیدار کرتی ہیں۔

ہر وہ بات جو انشائیہ کے ذریعہ خوب تر انداز میں کہیں جاسکتی ہے وہ انشائیہ کا موضوع ہے۔انشائیہ دلکش اور پر لطف اسلوب میں تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنے کا نام ہے۔ڈاکٹر عبدالستار ساحرؔ نے بہت ہی انوکھے اور اچھوتے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔جن پر کسی کی نظر نہ گئی ہو۔مثلاً مٹکے، بوڑھاپا، زمین، رشتے، اور ڈی وغیرہ ہیں۔''مٹکے'' ان کا نمائندہ انشائیہ ہے۔اس انشائیہ کا آغاز دیکھئے عام انداز میں شروع کرنے کے بجائے ایک الگ زاویہ سے آغاز کرتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''نرم و نازک، خوبصورت، بدصورت، کھردرے، رنگین، بے رنگ، موٹے پتلے، لمبے اور چوڑے، اس قدر فرق کیوں نہ ہو ضروریات کے لحاظ سے مٹکوں کا الگ الگ ہونا لازمی ہے۔قیمتیں بھی تو ایک نہیں ہوتیں اور نہ ہی استعمال۔

طرفہ تماشہ یہ کہ گاہک اور ان کا مزاج کچھ بھی تو ایک جیسا نہیں، بھلا مٹکے ایک۔۔''(۵۹)

ڈاکٹر عبدالستار ساحرؔ ایک اور انشائیہ ''بڑھاپا'' ہے اس انشائیہ میں وہ بڑھاپے کے چند حقائق دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اور بڑھاپے کے فائدوں کو بہت عمدگی سے بتلاتے ہیں۔ بڑھاپا آنے سے کس کس طرح کی فائدے ہوتے ہیں؟ بڑھاپا بہت مفید اور کارآمد ہوتا ہے اس عمر میں انسان اپنی ہر خواہش منوا سکتا ہے۔ بچپن کے بعد بچپن آتا ہے، تو عمر کی پختگی سے نصیحت اور مشورے دے سکتے ہیں۔ بچوں کی طرح ضد بھی کر سکتے ہیں۔ بڑھاپا بزرگی کی علامت ہے، اکثر لوگ اس بزرگی کے لئے درازعمر مانگتے ہیں لیکن بزرگی کو قبول نہیں کرتے۔ بڑھاپا توجہ چاہتا ہے، اپنا پن اور پیار کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ خوبصورت اقتباس ملاحظہ ہو:

''بڑھاپا'' اکثر موت سے ڈرتا ہے لیکن اطمینان بخش ہوتا ہے کیوں کہ بیشتر رشتوں کا لطف اور کئی اچھے برے تجربات اس کے حصے میں آتے ہیں حتی کہ اپنوں اور غیروں کا ستانا رلانا اور پھر ہنسانا بھی۔ ''بڑھاپا'' دراصل ذمہ داریوں کا بوجھ کم کر دیتا ہے۔ نصیحت، رائے مشورے بلکہ اور بہت کچھ صرف بوڑھوں کا حصہ ہے کیوں کہ ان معاملات میں کوئی دوسرا معتبر نہیں ہوسکتا۔ ''بڑھاپا ہے جس کا نام'' وہ اپنی نمایاں خصوصیات سے پہچانا جاتا ہے جیسے، صبر وتحمل، سکون واطمینان، سنجیدگی ومتانت، رہنمائی ونگرانی وغیرہ۔ ''بڑھاپا'' بادصبا کا آخری جھوکا ہے جو نیند سے قریب تر کر دیتا ہے ایسی نیند جس میں استقلال اور ہمیشگی پائی جاتی ہے۔۔''(۶۰)

اس پیراگراف میں ان کی انفرادی رنگ کی جھلک صاف نظر آرہی ہے یعنی وہ مٹکے کی عکاسی یوں کر رہے ہیں جیسے کسی دوشیزہ صفات بیان کر رہے ہوں۔ انشائیے کا یہ انفرادی انداز اسلوب کا حامل ہے۔ وہ مٹکے کے بارے میں عبارت آرائی کا حسن دوبالا کرتے ہیں۔ مٹکے کی قسمت کا فیصلہ خوبصورت اور دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ کمار نے کیسے کیسے مٹکے بنائے ہیں اور ان مٹکوں کو تقدیر کہاں کہاں لے جاتی ہے، دلکش انداز میں تحریر قلم بند کرتے ہیں۔

''بازار میں آنے کے بعد مٹکوں کی قسمت کا فیصلہ ہوتا ہے''۔

''چند مٹکوں پر کسی خریدار کی نظر ہی نہیں پڑتی۔''

''کوئی ٹھوک بجا کر کسی مٹکے کو دیکھتا ہے لیکن خریدتا نہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہوتی ہیں اہم وجہ یہ کہ اس مٹکے میں وہ مضبوطی اور پختگی نظر نہیں آتی

جس کی خریدار کو تلاش ہوتی ہے۔اور جو مٹکے خریدے جاتے ہیں ان میں سے
کسی کے مقدر میں امیر کا گھر ہوتا ہے تو کسی کا نصیب غریب کے گھر پھوٹتا
ہے۔''

''بعض مٹکے کہیں پہنچنے اور اپنے وجود کا نشان چھوڑنے سے پہلے ہی ٹوٹ
جاتے ہیں''۔

'' مٹکے بنانے کا سلسلہ صدیوں پرانا ہے لیکن آج بھی جاری وساری۔''

'' پتہ نہیں کب تک چلے گا میرے خیال سے قیامت تک۔''(۶۱)

اس انشائیہ میں ''خدا کا تخلیقی شاہکار انسان ہے'' خدا نے ہر طرح کے ہر قسم کے انسان بنائے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار ساحؔر نے کمار نے کیسے کیسے مٹکے بنائے ہیں کہ کر اللہ تعالی کی تخلیق کی طرف اشارہ کیا ہے۔اس انشائیہ میں انشاء کے نئے معنی بھی نکالتے ہیں اور قیامت تک اللہ تعالی کا یہ کارخانہ جاری وساری رہے گا۔''بازار میں آنے کے بعد مٹکوں کی قسمت کا فیصلہ ہوتا ہے وہ اس میں انشائیہ کے تخلیقی فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔دنیا میں آنے کے بعد انسانوں کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔ان کا مشاہدہ وسیع اور اسلوب تازہ کاری کی طرف مائل ہے۔وہ ضرب الامثال اور محاورات سے معنی کشیدہ کرتے ہیں اور پھر انہیں اپنے خوبصورت انداز میں جوڑتے چلے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالستار ساحؔر کا ایک اور انشائیہ ''ڈی'' ہے۔اس انشائیہ کے تحت ''ڈی'' ایک چھوٹے سے حروف کے کتنے پہلو بیان کرتے ہیں گویا ان کی نگاہ کسی ایک نقطہ پر مرکوز نہیں ہوتی بلکہ وہ اس متنوع پہلوؤں پر غور کرتے ہیں۔ان کا یہ انشائیہ خوبصورت اور دلکش ہے لیکن یہ زیادہ تر سنجیدگی کے حامل ہے تاہم کہیں کہیں ان کے جملے ان کے مشاہدے اور تجربے کو چند لفظوں میں سمیٹنے کی خوبصورت کاوش نظر آتی ہے۔اس انشائیہ میں وہ ''ڈی'' کی اتنی خوبیوں کو بیان کرتے ہیں کہ ایک تخلیق کار کا قلم کیسے آس پاس کا احاطہ کرتا ہے۔اس خوبصورت انداز کو دیکھئے:

''انگریزی حروف تہجی کے چوتھے حروف ''ڈی'' کی تخلیقیت کا جواب نہیں
بے شمار وسیع مفہوم کے حامل الفاظ ''ڈی'' سے شروع ہوتے ہیں۔جس میں
محبوب ترین لفظ Darling (محبوب) ہے۔اور اس میں اختلاف کی گنجائش
بھی کم ہے۔ یہ لفظ کہنے اور سننے میں جس قدر اچھا لگتا ہے اس سے بھی کہیں
زیادہ چلنے پھرنے میں۔۔۔۔Daughter (بیٹی) اللہ تعالی کی نعمت غیر
مترقبہ اور صحیح معنوں میں والدین اور شوہر کے بڑھاپے کا بہت بڑا اور لاجواب

سہارا، Dear (پیارا) اگر ورد زبان بن جائے تو ہر ایک کی زبان شیرین
ہوجائے گی اور ملک زیریں۔''(۶۲)

ان کا ایک اور انشائیہ ''زمین'' ہے۔اس میں انہوں نے تاریخی وثقافتی ومعاشرتی حیثیت پر بات کرتے ہیں اور لفظوں کے بہاؤ کو ایک تحریر میں لاتے چلے جاتے ہیں۔مختلف اشاروں کی معنویتی سطح کھولتے جاتے ہیں۔ ان کی خیال آرائی بہت خوب ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ بلند پرواز کو زمین پر واپس آنا پڑتا ہے۔زمین کی مقناطیسیت کے کشش کو ظاہر کرتے ہیں۔یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہر انسان بلکہ کائنات میں اکثر کی پناہ گاہ زمین ہے سب کو چھوڑ کر اشرف المخلوق انسان کو لیجئے، اس کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، بھاگنا دوڑنا غرضیکہ جینا مرنا زمین پر ہے۔زندگی کا تصور حتی کہ موت کا بھی زمین کے ساتھ وابستہ ہے اور ایسا کہ دونوں کو الگ ہی نہیں کیا جاسکتا دراصل زمین عاجزی وانکساری ہمت اور حوصلہ کی علامت ہے یا یوں کہئے کہ مجموعہ علامات۔اس پستی میں کئی بلندیاں پوشیدہ ہیں یعنی اس زمین سے ہی بہت سے آسمان پیدا ہوئے۔زمین کے نیچے ہونے سے پستی کا مفہوم لینا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ نیچے ہونے کے باوجود اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔زمین اور دوسرے معنوں میں ''فرش'' کے بغیر ''عرش'' پر اڑان بھرنے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر ہو ہی نہیں سکتا۔''(۶۳)

مجموعی طور پر ڈاکٹر عبدالستار ساحرؔ اپنے ہم عصروں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ان کے خیال کی رو، نکتہ آفرینی، بات سے بات پیدا کرنا اور شگفتگی کے عناصر نمایاں ہیں۔ان کے انشائیے جامعیت اور اختصار پر منحصر ہے۔یہ تمام عناصر کی موجودگی انہیں منفرد اسلوب کا حامل انشائیہ نگار بناتی ہے۔ان کے انشائیوں میں انکشاف ذات کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ضرورت کے لحاظ سے ضرب الامثال اور محاوروں کا استعمال عمدہ ہے۔ان کے انشائیے ''زمین''، ''ڈی'' اور ''بڑھاپا'' ان انشائیوں میں مضمون کا انداز پایا جاتا ہے۔ان کی یہ تحریریں سنجیدہ ہے ان میں انشائیہ کے چند ایک خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

۱۴.۴۔سید فضل اللہ مکرم (ڈاکٹر)

پروفیسر سید فضل اللہ مکرم عصر حاضر کے اردو محقق، نقاد اور مشہور ادیب ہیں۔ بہترین پروفیسر، مترجم اور تبصرہ نگار، مزاح نگار اور معروف انشائیہ نگار ہیں۔ وہ کسی شہرت کے محتاج نہیں ان کی ولادت شہر جگتیال کے ایک علمی گھرانہ میں ہوئی۔ ان کے والد سید سمیع اللہ گورنمنٹ ڈگری کالج جگتیال میں لکچرار تھے اور ان کے دادا جناب سید محبوب اور نانا جناب محمد حنیف سرکاری مدارس میں تدریسی عہدوں پر فائز تھے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم جگتیال میں حاصل کی شعبہء اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد سے ایم اے میں گولڈ میڈل حاصل کیا اور اسی جامعہ سے ایم فیل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی نیٹ، سلٹ کے امتحان بھی کامیاب کر چکے ہیں بعد ازاں اورینٹل اردو جامعہ عثمانیہ کے چیر پرسن بھی رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم اورینٹل اردو پی جی کالج حمایت نگر حیدرآباد میں تدریسی خدمات انجام دیئے اور اورینٹل اردو پی جی کالج اور ریسرچ سنٹر میں وہ اسوسیٹ پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد میں جنوری ۲۰۲۰ء سے صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

سید فضل اللہ مکرم کی اب تک ۸ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں نظریات جدید، سخنور جدید، نظم اور مضامین، نظم ونثر اور سنگ وثمر وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر علمی، تحقیقی وتنقیدی، تبصرے اور مضامین ملک و بیرون ملک کے جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں تلنگانہ مائنارٹیز ریسیڈنشل اسکول میں اردو کے نصابی کتب ششم تا دہم، بورڈ آف انٹرمیڈیٹ تلنگانہ کہ سال اول اور دوم کی اردو کتابوں کے بھی چیف ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر بی آر امبیڈکر فاصلاتی کورس کی بی اے کی پانچ کتابیں انہیں کی ادارت میں شائع ہوئی ہیں اور مختلف جامعات کی فاصلاتی تعلیم کے لئے وہ پچاس سے زائد اسباق لکھ چکے ہیں اور E-Learning کے بھی پانچ اسباق انڈر گریجویٹ کے لئے تیار کر چکے ہیں۔ اردو کی ادبی ویب سائٹ jhaneurdu.com کے اعزازی مدیر بھی ہیں۔

ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم کا ایک انشائیہ ''ویلکم پلیگ'' ہے، اس میں انہوں نے ''پلیگ'' جو کہ چوہوں کی بیماری ہے۔ مگر ملک کے کونے کونے میں یہ کس طرح پھیلتی ہے اس کا ذکر دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ انسان کی ضرورت یا خواہش کے کئی روپ بدل کر پلیگ سے منسلک کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں۔ انسان کی خودغرضی اس سے کیا کچھ کرواتی ہے اور انسان جو خود کو بہت عمدہ سمجھتا ہے اپنے مطلب کے لئے کس طرح گرتا ہے، پلیگ کے ذریعہ اس کے کئی اقسام بتاتے ہیں اور شگفتگی کے ساتھ ہلکے طنز کے تیر چلاتے ہیں یہ دلکش انداز ملاحظہ ہو:

''معاشی پلیگ میں کچھ چوہے ہر شد مہتا بن جاتے ہیں اور ستم ظریفی یہ کہ بلیاں بھی منہ پر کپڑا باندھے اس کار ثواب میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ سماجی پلیگ میں چوہے زبردست اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جب کے تعلیمی پلیگ میں کتابیں پڑھنے کی بجائے کتابیں بیچنے کی دھن سوار ہو جاتی ہے اور سستا لٹریچر پڑھ کر خود کو باادب سمجھنے کے رجحان کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ سیاسی پلیگ میں چوہا دیوار کی بلی بن جاتا ہے اور موقع ملتے ہی شیر کے کان کترنے لگتا ہے۔ البتہ مذہبی پلیگ میں جو سماج کا مشہور و معروف پلیگ ہے۔ جو ہمہ تن دستیاب رہتا ہے۔ اس میں یاترائیں منظّم کی جاتی ہیں اور کارسیوا کے ذریعہ تہذیب و تمدن کی مظبوط عمارتیں ڈھادی جاتی ہیں۔ بھارت میں پلیگ پھیلنے سے چوہوں کی نسل کشی کی ایسی منظّم اور منصوبہ بند تحریک چلائی گئی کہ اللہ اللہ ہمیں ۱۹۸۴ء کا دلی، ۱۹۸۹ء کا بھاگل پور اور ۱۹۹۳ء کا بمبئی یاد آجاتا ہے۔''(۶۴)

''چشم یاہو'' ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم کا ایک اور انشائیہ ہے اس انشائیہ میں وہ چشم یاہو کے معنی پوشیدہ نہیں رکھتے وہ نئی بات کی وضاحت خود ہی کرتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ضرب الامثال کا بھی بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ انشاء کے معنی عبارت آرائی، کوئی بات دل سے پیدا کرنے کے ہیں۔ ان کے نزدیک الفاظ کا انتخاب معنی کے لحاظ سے ہوتا ہیں ان کے یہاں نئی بات کے ساتھ کہاوتوں کا استعمال بہت عمدہ ہے۔ یہاں دیکھئے:

''آشوب چشم کے لئے ہم نے ''چشم یاہو'' کی اصطلاح وضع کی ہے گو کہ یہ نئی اصطلاح بنیاد پرستوں (مذہب کے نہیں) کو ناگوار گزرے گی اور وہ اس سلسلے میں طوطا چشم بن جائیں گے۔ نہ صرف آنکھیں دکھائیں گے بلکہ آنکھیں لڑائیں گے اور اس اصطلاح کی وہ درگت بنائیں گے کہ بے چاری آنکھ اٹھانے کے لائق نہیں رہے گی ویسے یہ دور متبادل یا مترادف کا دور ہے۔''(۶۵)

فضل اللہ مکرم محاورے اور ضرب الامثال کے ذریعہ اپنی بات کو مختصر انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ انشائیہ نگار کبھی کبھی ان دونوں عناصر کو بروئے کار لاتا ہے۔ اپنی تخلیقیت کو کام میں لاتے ہوئے اپنی پیش کش کو دلچسپ اور چست بناتا ہے۔ ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم کے یہاں بھی یہ خوبی بہت عمدہ انداز میں پائی جاتی ہے۔ وہیں انشائیے کی فضاء ہلکی پھلکی اور شگفتہ نظر آتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہمارے یہاں صرف قاضی کے گھر کا چوہا سیانا ہوتا ہے مگر مغربی ممالک میں ہر چوہا سیانا ہوتا ہے تبھی تو جاپان میں کمپیوٹرائز چوہے پائے گئے ہیں

جو،غلّہ نہیں کھاتے بلکہ کمپیوٹر کے چھوٹے چھوٹے چپس کھا جاتے ہیں۔ جو ہزاروں روپیوں کے ہوتے ہیں۔اسی لئے جاپانی حکومت نے بلی کونوسوچو ہے کھانے کی شرط کی زبردست حمایت کی ہے۔'' (٦٦)

اس انشائیہ میں انشائیہ نگار کی توجہ خارجی مناظر کی طرف ہے،بعض جملوں میں اس کیفیت کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم احساسات اور جذبات پر مضبوط گرفت رکھتے ہیں۔اپنے انشائیوں میں اس کا ذکر بخوبی کرتے ہیں۔ان کے تحریروں میں حقیقی کیفیت ابھر کر سامنے آتی ہے اور زود ہضم کی اچھی مثالیں ان ہاں کے پائی جاتی ہیں۔ملاحظہ ہو:

''چشم یا ہو خصوصاً ایسے شوہروں کے لئے حوصلے کا باعث بنے گی جو زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ اپنی بیوی پر رعب ڈالنے کی حسرت رکھتے ہوں۔آپ دیکھیں گے کہ آپ کی بیوی چپ چاپ سر جھکائے دور کھڑی ہوگی۔آپ جو چاہیں حکم دیں۔خود ہی تعمیل کردی جائے گی۔اگر آپ چشمہ نکال کر آنکھیں دکھائیں تو وہ سرتا پا لرز جائے گی اور اپنی غلطیوں کی معافی کی درخواست کرے گی۔حتیٰ کے مہر بھی معاف کردے گی۔''(٦٧)

ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم کی تحریروں میں بات سے بات پیدا کرنے کا اسلوب پایا جاتا ہے۔ایک چھوٹی سی چیز کے بہت سے پہلو بیان کرتے ہیں۔ان کی نگاہ کسی ایک نقطہ پر مرکوز نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کے متنوع پہلوؤں پر غور کرتے ہیں۔

''پلیگ دراصل چوہوں کی بیماری ہے مگر اس کو ملک کے کونے کونے میں پھیلانے میں آدم زادوں کے تاریخی رول کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔سچ پوچھئے تو ان دونوں کے تعاون سے ہی طاعون کو پر لگ گئے ہیں اور ساری دنیا میں اس کا ڈھنڈورا پیٹا گیا ہے اور چوہے راتوں رات شہر کے ساتویں آسمان تک پہنچ گئے ہیں۔'' (٦٨)

ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم کے انشائیوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ موضوع کو ادھر سے ادھر ہونے نہیں دیتے، موضوع کے ساتھ طنز و مزاح کے آلات سے بھی کام لیتے ہیں۔قاری کی دلچسپی حاصل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ان کے انشائی کاوشوں کے پیچھے ان کا تجربہ،مشاہدہ اور مطالعہ صاف محسوس ہوتا ہے۔اس کے علاوہ وہ اپنی بات کو طویل نہیں کرتے۔وہ مناسب جملوں میں ایک رخ اور پہلو بیان کرنے کے بعد آگے چلے جاتے ہیں۔ان

کے انشائیے تقریباً تین صفحوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔جس کی وجہ سے قاری اپنی سہولت سے ان کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوا منزل سے آشنا ہوتا ہے۔مصنف جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ قاری کے دل و دماغ میں پہنچ جاتا ہے۔اشارہ شاعری کا ایک ضروری جوہر ہے۔وہ پہلے اشارے کی لفظیات کی حدیں بیان کرتے ہیں پھر اس کے معاشرتی پہلو کو سامنے لاتے ہیں۔اس کے مثبت و منفی معنی کھولتے ہیں پھر مختلف اشاروں کی معنویاتی سطحیں بتاتے ہیں۔ان کے ہاں بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر بھی ہے، بے ربطی بھی ہے، غیر رسمی طریقہ کار کے عنصر ان کے ہاں بہت پائے جاتے ہیں۔محاورے، ضرب الامثال کا استعمال بھی بہت عمدہ ہے اور روزمرہ کے الفاظ کا استعمال بھی کثرت سے ہوتا ہے۔

۱۵.۴۔فاطمہ تاج

نام فاطمہ تاج النساء، تخلص تاج ، پیدائش ۱۹/اکتوبر ۱۹۴۸ء حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ان کے والد سعادات مدینہ منورہ کے قصیدہ گوشاعر تھے۔تاج کوشاعری وراثت میں ملی۔وہ اچھی شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ نثر کی دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ۔ان کی اب تک ۱۲ کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں سے ۶ شعری مجموعے ہیں حوصلہ،خوشبوئے غزل، پھول غزل کے، ہیرے بھی پتھر ہیں،ایک چراغ اورنثری مجموعے یہ ہیں آس پاس، امانت، دلاسا، وہ، چھاؤں کی چادر دھوپ کی کلیاں وغیرہ۔ وہ غزلیں ،نظمیں ، مزاحیہ مضامین ،تبصرے اورناول تحریر کرتی ہیں۔

ان کوکئی ایوارڈ سے نوازا گیا جیسے اتر پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ، اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایوارڈ، امتیاز میر ایوارڈ (آل انڈیا میرا کیڈمی)، مدرٹریسا ایوارڈ (ساہتیہ ادب دہلی) وغیرہ ۔حیدرآباد کی کئی نسائی ادبی تنظیموں کی فعال رکن رہی ہیں۔

فاطمہ تاج اپنے اس انشائیہ ''جوتا چل گیا'' میں اپنی بات کوطویل نہیں کرتیں بلکہ وہ مناسب جملوں میں ایک رخ اور پہلو بیان کرنے کے بعد آگے چلی جاتی ہیں۔مجموعی طور پران کا انشائیہ ایک سے تین صفحوں تک چلتا ہے۔اورایسے انداز میں اپنی بات کو بیان کرتیں ہیں کہ جو کچھ مصنف کہنا چاہتا ہے وہ قاری تک پہنچ جاتا ہے۔اس انشائیہ میں انہوں نے انسان کی سب سے اہم ضرورت جوتے کے بارے میں کہتی ہیں کہ انسان کی اصل پہچان اس کے جوتے سے ہوتی ہے۔جوتے انسان کے غماز ہوتے ہیں، جوتے انسان کے رعب اور حیثیت کا پتہ دیتے ہیں، جوتے کے اقسام گنواتے ہوئے شخصیتوں کا ذکر کرتی ہیں کہ کس طرح کا شخص کس طرح کے جوتے پہنتا ہے۔

> ''جوتے کی کھٹا کھٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بڑی جابر قسم کی شخصیت ہے لیکن اندر سے بے حد کمزور صرف جوتے کی آواز سے لوگوں کو مرعوب کرنا چاہتی ہے ورنہ بہادری، حوصلہ مندی بالکل نہیں۔فوجی جوتوں کا قبیلہ بالکل الگ ہے۔سیاسی لیڈروں کے جوتے ان کی موٹروں اور دانتوں سے زیادہ چمکیلے ہوتے ہیں۔شاعروں کے جوتوں پر تہ بہ تہ گرد کسی شاعرانہ خیال کا تعاقب میں صحرانوردی ان کے جوتوں کا حلیہ بگاڑ دیتی ہے۔مصوروں میں اکثر نامور مصور جوتا پہن کر اپنے پاؤں کو قید کرنا نہیں چاہتے چاہے انہیں کسی دعوت کلب میں آنے کی اجازت ملے یا نہ ملے انھیں یہ خوف ہوتا ہے کہ کینوس کے رنگ جوتے پر اتر آئیں تو جوتے کی اہمیت اس سے زیادہ ہوجائے گی۔''(۶۹)

''چندہ'' فاطمہ تاج کا ایک عمدہ انشائیہ ہے۔ وہ اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو دلچسپ انداز میں پیش کرتی ہیں۔ انشائیہ ایک مزاج کا متقاضی ہے جس شخص کے مزاج میں عمومی اہمیت کی حامل اشیاء کو مختلف انداز اور زاویے سے دیکھنا آتا ہے پھر اس کے پاس الفاظ کا ایک متناسب ذخیرہ بھی ہے۔ اس ذخیرے میں سے انشاء کے معنی تلاش کرنا اور بات سے بات پیدا کرنے کی اہلیت بھی رکھنا فاطمہ تاج کو خوب آتا ہے اور ساتھ ہی ان کے جملوں میں ہلکا پھلکا طنز بھی جھلکتا ہے۔ وہ اس انشائیہ میں ''چندہ'' اور ''چندا'' کا فرق شگفتگی کے ساتھ بیان کرتی ہیں اور چندہ کے ہمہ اقسام گنواتی ہیں کہ چندہ مانگنے والے کس طرح کے ہیں اور کس کس بات پر چندہ وصول کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''چندہ طلبی'' کے اغراض و مقاصد نیک ہوں یا بد، ہم جاننا نہیں چاہتے اور ویسے بھی کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ ''الف لیلوی کی داستانیں'' سن سکیں۔ موجودہ دور میں ہر شخص ''عدم الفرصت'' ہے وقت کبھی تنگ نہیں تھا جتنا آج ہے۔ ضروری و غیر ضروری دونوں کی مصروفیتوں نے انسان کو جکڑ لیا ہے، ہاں مگر چندہ مانگنے والوں کے پاس کافی وقت رہتا ہے کیوں کہ لوگ نجات حاصل کرنے کے لئے چندہ جلدی سے دے دیتے ہیں تاکہ جان چھوٹے۔ مگر جان ایک سے چھوٹے تو دوسرے میں جا پھنستی ہے۔ ''غربت'' نے بھی آج کل بھیک کم اور چندہ مانگنا زیادہ شروع کر دیا ہے۔''(۷۰)

فاطمہ تاج کی سماج پر گہری نظر ہے وہ سماج کی حال حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ موضوع کے ساتھ ساتھ زبان و بیان میں بھی قدرت رکھتی ہیں۔ ''اور جوتا چل گیا'' فاطمہ تاج کا ایک انشائیہ ہے۔ اکثر ادیب ''جوتے'' کے موضوع پر لکھتے ہیں مگر فاطمہ تاج کا انداز کچھ نرالا ہے۔ وہ اس انشائیہ میں کبھی معصومیت تو کبھی شرارتی ہونے کا اظہار کرتی ہیں۔ وہ جوتے کی رسائی کا تذکرہ کرتے ہوئے سنجیدہ فکر کی جانب اپنا رخ موڑ لیتی ہیں۔ انشائیہ میں ضرب الامثال اور محاروں کا استعمال کرتی ہیں۔ دیکھئے وہ کس سنجیدگی سے سماج کے حالات کو بیان کرتی ہیں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اعلی خاندان کا احساس رکھنے والے بہو اور دامادوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں جس سے ان کے نہ صرف جوتے گھس جاتے ہیں بلکہ پاؤں بھی زخمی ہو جاتے ہیں۔ کچھ قدامت پسند لوگ کئی برس جوتا نہیں خریدتے پرانے جوتے کی ریپیرنگ کروا کر ''موچی قوم'' کی پرورش کرتے رہتے ہیں یہ لوگ دراصل سوشل ورکر ہیں جو غریب طبقے یعنی جوتا سینے والوں کے روزگار کا

سبب بنے رہتے ہیں۔"(۱۷)

مجموعی طور پر ان کے انشائیوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں انشائیہ نگاری کی خصوصیت پائی جاتی ہیں۔ان کے انشائیوں کی خاص خصوصیت یہی ہے کہ وہ ہلکے پھلکے مزاح کے ساتھ ساتھ اپنی بات کو لطیف اور شگفتگی کے پیرائے میں پیش کرتی ہیں۔ان کے یہاں بات سے بات پیدا ہونے کی خصوصیت ملتی ہے۔یہی خصوصیت ان کے انشائیوں کا خاص وصف ہے۔ان خصوصیات کے علاوہ شخصیت کے خارجی پہلو کو بیان کرتی ہیں کہیں کہیں بے تکلفی اور بے ربطی بھی ملتی ہے۔موقع کی مناسبت سے محاوروں اور ضرب الامثال کا استعمال بھی کرتی ہیں۔اور روزمرہ کے الفاظ کا بخوبی استعمال ملتا ہے۔ان کے انشائیے قاری کو فرط مسرت بہم پہنچاتے ہیں۔جس سے قاری مسحور ہوتا ہے۔

۱۶.۴۔ فیروز حیدر

فیروز حیدر ۱۹۵۶ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم حیدرآباد سے ہی حاصل کی۔وہ انشائیوں میں ہلکے پھلکے مزاح کے ساتھ اپنی بات کو طنز کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔وہ اپنے آس پاس کے ماحول سے بخوبی واقف ہیں۔وہ زندگی کے ہر پہلو پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہوئیانھیں پوری طرح سے اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فیروز حیدر کا انشائیہ ''ردی'' ان کا نمائندہ انشائیہ ہے۔اس میں انھوں نے کاغذ کی افادیت بتلاتے ہوئے کہتے ہیں اگر کاغذ ایجاد نہ ہوتا تو بہتر ہوتا کیونکہ حکایتیں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہتی۔کاغذ کے ذریعہ انسانوں کے ذہنوں میں نفرت اور تعصب کا زہر نہ پھیلتا۔اس انشائیہ کے ذریعہ بہت گہری بات کہتے ہیں کہ کاغذ جب تک کورا رہتا ہے اور اس میں کرارہ پن رہتا ہے اس کی اہمیت ہوتی ہے۔اس طرح جب تک انسان کام کرتا ہے ٹھیک رہتا ہے۔چاہے وہ کاغذ ہو کہ انسان عمر کے آخری حصہ میں دونوں ردّی میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔فیروز حیدر سماج پر گہری نظر رکھتے ہیں۔اس انشائیہ میں سماج کی حقیقت اور کرب کو شگفتگی سے پیش کرتے ہیں۔مصنف انسان کو بہتر طریقہ سے سمجھاتا ہے۔فیروز حیدر وقت کو نئے زاویے سے دیکھنا جانتے ہیں اور قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہیں۔قاری اول تا آخر انشائیہ نگار کے ساتھ رہتا ہے،اس کی توجہ کہیں اور ادھر ادھر نہیں ہوتی۔اس انشائیہ میں ہلکی سی مزاح کی چاشنی میں طنز کے تیر چلاتے ہیں یہ خوبصورت اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''مرزا کا خیال ہے کہ انسان اور کاغذ میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ایک عقل سے کورا ہوتا ہے اور دوسرا ذات سے کورہ اور کرارہ۔دونوں کی قدر اس وقت تک ہوتی ہے جب تک کورہ پن اور کرارہ پن برقرار ہے اور دونوں ہی زندگی کے آخری حصہ میں ردی میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔
>
> ردّی کی تعریف کے لئے ضروری ہے کہ کاغذ کی برائیاں کی جائے۔ویسے بھی یہ انسانی فطرت ہے کہ ایک کی تعریف کرتے وقت دوسرے کی برائی کی جائے۔ردّی ایک صفت ہے یا ایسا وصف ہے جس کی وجہ سے موصوف کو نکما ناکارہ اور بے مصرف سمجھا جاتا ہے۔تحقیر اور بے وقتی اس کا نصیب اور گھر کا کوئی غیر اہم گوشہ اس کا مقدر بن جاتے ہیں۔بقول مرزا،انسانوں میں جو حالت بے کار گھر داماد کی کہی نااہل ریٹائرڈ شخص کی ہوتی ہے۔وہ ردّی کی حالت کہلاتی ہے۔ایک روز مرزا کسی دوست کے گھر بیٹھے ہوئے تھے جو ملازمت سے ریٹائر

ہوکر گھر کی ردی میں اضافہ کر چکے تھے۔اچانک ایک چھوٹا لڑکا گھبرایا ہوا آیا اور کہنے لگا'' دادا جان۔آپ کہیں چھپ جایئے۔ردی والا آیا ہے۔کل ممی کہہ رہیں تھیں کہ آپ کی حالت بالکل ردّی ہوگئی ہے۔ویسے یہ بات ابھی تصفیہ طلب ہے کہ انسان ردّی ہونے پر ریٹائر کیا جاتا ہے یا ریٹائر ہونے پر ردّی میں شمار کیا جاتا ہے خیر بات ہورہی تھی کاغذی ردّی کی۔''(۷۲)

انشائیہ میں شخصی ردِعمل کو لازمی تسلیم کیا جاتا ہے۔انشائیہ ایک ایسا فن ہے جس میں فنکار کی شخصیت کی عکاسی ہوتی ہے۔انشائیہ نگار جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے ذاتی خیالات، جذبات، مشاہدات اور تجربات کو بڑے خوبصورت پیرائے میں پیش کرتا ہے۔فیروز حیدر اپنی دلکش شخصیت کی خوشبو اس طرح تحریر میں بھر دیتے ہیں گویا چمنستان کھل اٹھتا ہے۔

''ایک روز ایک چہلم کی دعوت میں بریانی نوش فرما کر مرزا کو یہ احساس ہوا یہ معمولی بریانی نہیں بلکہ غیر معمولی بریانی ہے۔اس روز اس قدر خوش ہوئے کہ بٹلر کی بلائیں لے لیں۔اور باورچی کی دست بوسی کے بعد اس سے عہد و پیمان کروائے کہ ان کی چہلم کی بریانی بھی وہی پکائے گا۔

اس واقعہ کو کئی روز بعد سے مرزا کسی دعوت میں نظر نہیں آئے تو ہم بے چین ہوگئے اور مرزا کی خیریت لے نے جب ان کے گھر پہنچے تو مرزا کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئے۔چہرے پر سوجن، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے۔بال الجھے ہوئے۔ایسی حالت میں مرزا کو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ہمیں پریشان دیکھ کر مرزا نے کہا'' کیا بتاؤں وہ باورچی۔وہی چہلم کی بریانی والا۔کم بخت، باورچی نہیں ملک الموت بن گیا ہے۔روز خواب میں نظر آتا ہے۔اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے صرف ایک ہی سوال کرتا ہے۔بریانی کب پکانا ہے۔بریانی کب پکانا ہے۔''(۷۳)

فیروز حیدر اپنے قاری سے بہت جلد بے تکلف ہوجاتے ہیں۔جیسے اپنے دوست سے بے تکلف گفتگو میں محو ہو۔وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کو بے تکلفی سے قاری کے سامنے بیان کرتے جاتے ہیں۔یہی بے تکلف گفتگو کا انداز فیروز حیدر کے یہاں بھی ملتا ہے۔

''ہم نے کہا۔۔''یار مرزا پہیلیاں نہ بجھواؤ، صاف صاف کہو کیا واقعی کانا دجال آگیا ہے، کیا وہ ہمارے ملک میں ہے؟ کیا وہ ہمارے ہی شہر میں ہے؟ کیا

تم اسے جانتے ہو؟ کیا وہ ہمارے فلمی ویلنوں کی طرح ہے؟ کیا وہ ہمارے
لیڈروں کی طرح ہے؟''(۷۴)

فیروز حیدر کی بات ہی کچھ اور ہے، فیروز حیدر کو انشائیوں میں نئے معنی پیدا کرنے پر قدرت حاصل ہے، وہ اس انداز سے نئے معنی تخلیق کرتے ہیں کہ قاری ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، قاری کے ذہنوں پر دیر پا اثر چھوڑتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ایک روز میں مرزا کے ایک شاعر ڈاکٹر کے دوست کے مکان پر پہنچا، ان
کا دواخانہ مکان کے اندر ہی تھا، جب میں اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ اس کا سارا
خاندان پریشانی کے عالم میں آپریشن تھیٹر کے باہر ہوا ہے، میں بھی ان میں
شامل ہوگیا، کچھ ہی دیر بعد تھیٹر کا دروازہ کھول کر نرس چیختی ہوئی باہر آئی، مبارک
ہو! مبارک ہو! غزل ہوئی ہے، یہ سن کر میں حیران ہوگیا، لیکن ان کی بیگم صاحبہ
رنجیدہ ہوگئیں اور کہا، اس بار بھی غزل ہوئی ہے، میں سمجھتی تھی نظم ہوگی۔''(۷۵)

فیروز حیدر ایک اچھے انشائیہ نگار ہیں اور انشائیہ کی شعریات کو شعوری طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں روزمرہ کے الفاظ اور محاورات اور ضرب المثال کی بھی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ فیروز حیدر کا محاوروں کو توسیع کر کے پیش کرنے کا خوبصورت انداز ملاحظہ فرمائیں:

''ہم بری طرح بوکھلا اٹھے جب ایک دن مرزا نے یہ کہا کہ دجال آچکا ہے،
یہ سنتے ہی ہماری آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا پیروں تلے زمین کھسکنے
لگی۔ ابھی ہم سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ زوردار گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک کرقت
آواز ہمارے کان کے پردے کے پرخچے اڑ گئی۔'' (۷۶)

فیروز حیدر کے انشائیوں کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں میں انشائیہ نگاری کی تمام خصوصیات بہت عمدہ ہیں۔ ان کے انشائیوں کی خاص خصوصیت یہی ہے کہ وہ ہلکے پھلکے مزاح کے ساتھ اپنی بات کو طنز کے ذریعہ کہیں کہیں پیش کرتے ہیں۔ ان کے ان انشائیوں کی اہم خصوصیت انشائی معنی نکالنا ہے۔ وہ اپنی بات کو لطف اور شگفتہ پیرائے میں پیش کرتے ہیں وہ اپنے آس پاس کے ماحول سے بخوبی واقف ہیں۔ بہت خوبصورتی سے انشائی انداز کی اہم خصوصیت بے تکلفی کو بے تکلف ہوکر قلم بند کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں بات سے بات پیدا کرنے کی خصوصیت بھی بہت عمدہ ہے۔ بے ربطی اور زود ہضم بھی بہت عمدہ ہیں۔ ان کے انشائیوں کے موضوع مختلف ہیں۔ اس کے علاوہ زبان و بیان کے بے شمار خوبیاں بھی ان کی تحریروں میں ملتی ہیں۔ مثلاً

تشبیہات و استعارات، محاورات، کہاوتیں، ضرب الامثال اور صنعتوں کے علاوہ تلمیحات، تحریف نگاری کی عمدہ استعمال ان کے اسلوب کی خصوصیات ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان کے الفاظ کا کہیں کہیں استعمال بھی ملتا ہے۔

۱۷.۴۔قدیر زماں

محمد عبدالقدیر نام ہے اور قلمی نام قدیر زماں ہے۔ آپ کی پیدائش ۱۵/اکتوبر ۱۹۳۳ء آبائی وطن کریم نگر ضلع موضوع گمبھیر پور میں ایک زمیندار گھرانے میں ہوئے۔ جگتیال میں ثانوی تعلیم حاصل کی اور ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد آئے، فی الحال حیدرآباد میں مقیم ہیں۔ حیدرآباد میں کئی ایک چھوٹی بڑی ملازمتوں کے بعد محکمہ امداد باہمی کے عہدے سب رجسٹرار پر منتخب ہوئے۔ ملازمت کے دوران اپنی تعلیم جاری رکھتے ہوئے ایل۔ایل۔بی اور ایم کام کی ڈگری حاصل کی۔ جامعہ عثمانیہ میں پوسٹ گریجویشن میں داخلہ لیا اور آرٹس کالج کے طلباء یونین کے صدر منتخب ہوئے۔ مجلّہ عثمانیہ کے علاوہ ایک رسالہ ''سفینہ'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔

قدیر زماں کی تصانیف افسانے، ڈرامے اقبالیات کے علاوہ انگریزی اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں تراجم ہیں۔ رات کا سفر (۱۹۹۷ء)، ادھورا سفر (۱۹۹۰ء)، ڈرامائی ادب میں ماورا (۱۹۹۷ء)، اور پنجرے کا آدمی (۱۹۸۷ء)، جو Edward Albee کی ''دی زو اسٹوری'' سے ماخوذ ہے۔ ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہونے کے علاوہ ان کے تین ڈرامے اسٹیج پر پیش بھی کئے گئے۔ تراجم میں ایڈیسن Oedipus the King by Sophocles (سوفوکلیز) روپوشی کی تحریریں (ویمنا) جو ساہتیہ اکاڈمی کی جانب سے شائع ہوئی، پرچھائیں ایتا بھ گھوش کی The shadow line کا ترجمہ کیا۔ قدیر زماں نے بہ زبان انگلیسیہ خاصہ مواد جمع کیا۔

قدیر زماں مترجم، ڈرامہ نگار، افسانہ نویس، تاریخ داں اور تلخیص کار، بہترین طنز و مزاح نگار اور فکشن نگار ہیں۔ اردو اور انگریزی زبان پر عبور حاصل ہے۔ فکشن اور ڈرامہ نگاری میں بہت مصروف ہیں۔ کھلونے والا، ادھورا سفر اور رات کا سفر افسانوی مجموعے ہیں۔ تلاش اقبال تنقید کی بہترین کتاب ہے۔ تصوف بہ یک نظر غیر معمولی کتاب لکھی۔ ادبی نگارشات منتخب تراجم و مضامین ہیں۔ پنجرہ کا آدمی، ماورا ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ سوانح اور شخصی خاکے اور انشائیوں میں سوائے انشائیہ اور بزمِ ارباب نظر (سوانحی انشائیہ) ہیں۔ رسائل اور اخبارات میں مضمون اور انشائیے شائع ہوئے ہیں۔

مجتبیٰ حسین قدیر زماں کے تعلق سے رقم طراز ہیں کہ:

''بالآخر ۲۰ جنوری ۲۰۱۸ء کو قدیر زماں طویل علالت کے بعد ہمیں یکا وتنہا چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے۔ ان سے ہمارے ۶۵ برس پرانے مراسم تھے۔ اس اعتبار سے وہ ہماری نوجوانی کے دنوں کے اکیلے دوست باقی رہ گئے تھے۔ ادب اور ثقافت سے ان کا سروکار نہایت گہرا تھا۔ وہ افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، اور تبصرہ نگار بھی تھے۔ ان کے بعض ڈرامے خاصے مقبول ہوئے۔ چار سال پہلے انہوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کے شہرہ آفاق ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کی تلخیص ''وزیر خانم'' کے عنوان سے کی تھی۔''(۷۷)

''سوانحی انشائیہ'' اس کتاب میں قدیر زماں نے شخصی خاکے لکھے ہیں۔ جسے ہم انشائیہ نہیں کہہ سکتے۔ ''سوائے انشائیہ'' میں عرض مصنف کے زیر تحت قدیر زماں کچھ اس طرح فرماتے ہیں:

''زیر نظر میری کتاب'' بزم ارباب نظر (سوانح انشائیے) ۲۰۰۷ء کا تسلسل ہے ان میں قلم بند مضامین کو میں نے ''سوانحی انشائیہ'' کہا ہے۔ خاکے اس لئے نہیں کہا کہ میں مزاح نگار نہیں ہوں اور اس لئے بھی کہ ان میں انشائیہ کی صفات ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ تمام انشائیے نہیں ہیں۔ تخیل آمد کا مرہون منت ہوتا ہے۔ اکثر مضامین بیانیہ کے متقاضی تھے۔ جس طرح قلم چل پڑا میں نے اسی کو روا رکھا۔ کسی مضمون کا شروع سے آخر تک محاوروں کہاوتوں اور تخیل سے پر ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ یہ تینوں کہیں کہیں موجود ہوں اور زبان میں فصاحت و بلاغت ہو، تشبیہات، استعاروں اور تلازموں کا استعمال بھی ہو مضمون، طنز اور جھوٹ سے عاری ہو، پسند کروں گا۔''(۷۸)

قدیر زماں خود سوائے انشائیہ کے مقدمہ میں اعتراف کر چکے ہیں کہ ان کی کتاب سوانحی انشائیہ کے اوصاف ہیں۔ اس لئے وہ انھیں انشائیہ قرار نہیں دیتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یہ انشائیے نہیں ہے بلکہ یہ سوانحی خاکے ہیں۔ جنھیں سوانحی انشائیہ کا نام دیا گیا ہے۔ ہم اس کو تلازموں اور اوصاف کی بناء پر انشائیہ قرار نہیں دے سکتے کیونکہ یہ مکمل انشائیے نہیں ہیں۔ ان کی دوسری کتاب ''سوائے انشائیے'' میں انشائیہ کی تعریف تحریر کی ہے جو قدیر زماں حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے سمینار میں پڑھ چکے ہیں اور سوائے انشائیہ اور سوانحی انشائیہ کو انشائیے کا مجموعہ یا انشائیہ قرار نہیں دے سکتے۔

۱۸.۴۔قیسیؔ قمرنگری (ڈاکٹر)

حکیم صدیق احمد نام ہے اور قیسیؔ قمرنگری کے نام سے معروف ہیں۔آپ کی پیدائش ۱۹۵۳ء میں کرنول، رائلسیما (اے۔پی) میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم مقامی مدارس میں حاصل کرنے کے بعد سری وینکٹیشو رالو یونیورسٹی سے ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔ماہنامہ بزم اردو کرنول کے معتمد ہیں شاعر بھی اور مزاحیہ نگار بھی انشائیہ کی سرزمین کو بھی سرسبز وشاداب کررہے ہیں۔

بے تکلفی انشائیہ کی ایک اہم تکنیک ہے۔باتیں کرنے کا یہ انداز نثر میں زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔اسلوب گفتگو میں انشائیہ نگاری کے اس انداز کو بے تکلف کردیا۔بے تکلف گفتگو نے رشتوں کا احساس کروایا کہ وہ کتنے قریبی ہیں۔القاب اور پر تکلف گفتگو سے عاری کرکے اپنوں سے قریب کردیا جو اس کی شان ہے۔قیسی قمرنگری کی تحریروں میں یہ خوبی بہت عمدہ پائی جاتی ہے۔''بتیسّی'' انشائیہ میں بتیس دانتوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تحریر میں یوں قلم بند کرتے ہیں کہ قاری محظوظ ہوتا ہے اپنے آپ کو روک نہیں سکتا اور قاری کے لب پہ مسکراہٹ آ ہی جاتی ہے۔

> ''ہر انسان چاہے جوان ہو یا نوجوان اس کے دانتوں کی تعداد بتیس ہی رہے۔مذکورہ وجوہ کی بنا پر تعداد میں کمی تو ممکن ہے لیکن بتیّسی ناممکن ہی ہے۔دو اصحاب کو آپس میں جھگڑتے دیکھ کر ہم ایک تجربہ کار صحافی کی طرح لطف اندوز ہورہے تھے کہ ان میں سے ایک نے دوسرے سے جھلاّ کر کہا ''اگر ایک طمانچہ ماروں تو چونسٹھ ۶۴ دانت منہ سے باہر آجائیں گے۔'' ہمیں دانتوں کی تعداد میں اس دوگنے اضافہ پر نہایت تعجب ہوا تو مداخلت کرتے ہوئے بولے ''بھائی صاحب دانت تو بتیس ہی ہوتے ہیں یہ چونسٹھ کیسے گرینگے؟'' تو اس نے ہمیں حقارت آمیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے جواب دیا'' مجھے معلوم تھا تم درمیان میں بولوگے اس لئے تمہارے بتیس بھی اس کے ساتھ ملا لیئے تھے۔''(۷۹)

قیسیؔ قمرنگری کا ایک انشائیہ ''سالے'' بھی ہے۔اس انشائیہ میں وہ بہت خوبصورت انداز میں رشتوں کا ذکر کرتے ہیں۔بہن کے شوہر نامدار کو کسی بھی نام سے مخاطب کریں۔مثلاً بھائی جان، دولھے بھائی جان، دولھے پاشا، اور دلھے جانی وغیرہ احترام ہی ہوتا ہے۔اگر وہی بھائی جان یا دلھے بھائی کا رشتہ بیوی کے بھائی سے ہو تو سالا کہلاتا ہے۔اس لفظ ''سالے'' کو بہت دلکش اور شگفتہ انداز میں یوں بیان کرتے ہیں۔دیکھئے:

> ''ہم اسے آپا کے شوہر کہہ لیں، پاپا کے داماد یا پھر ہمارے بہنوئی۔اس

رشتہ کی قدر و قیمت مصائب و آلام کے دوران بھی ہمیں صبر و تحمل کی تلقین دیتی ہے اور ہم اپنے بہنوئی کے ناز نخروں بلکہ بعض اوقات مظالم کو بھی بہ صد ابتسام سہہ کر اپنی کمزور مردانگی کے اظہار سے اجتناب کو حماقت تصور نہیں کرتے۔ اگر کوئی از راہ مذاق ہمیں ''سالا'' کہہ دے تو آنکھوں کے دائرے وسیع ہو جائیں گے اور رنگت کی سرخی معشوقہ کے رخسار کو شرمانے لگے گی لیکن انہی الفاظ کو اگر آپا کے شوہر نامدار کی زبانی سماعت کا موقع ملے تو ہمارے افتخار کا عالم قابلِ دید ہوتا ہے۔۔''(۸۰)

قیسی قمر نگری دانتوں کے بارے میں اس طرح تفصیل بیان کرتے ہیں کہ ضعیف اشخاص کے دانت پھر بھی مظبوط ہوتے ہیں لیکن جوانوں کے دانت جوانی میں ہی نکلتے ہیں یا انہیں دانتوں کی بیماری ہو جاتی ہے۔ یا دانتوں کو کیڑا لگ جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ مصنوعی دانتوں کو استعمال کرتے ہیں۔ مصنوعی دانتوں کی خوبصورتی کا قصہ یوں بیان کرتے ہیں کہ قاری کی دلچسپی دوبالا ہو جاتی ہے۔ انشائیہ کی ایک خصوصیت زود ہضم ہے اس خصوصیت کے سلسلے میں جانسن نے کہا تھا کہ:

"An erregular indigested pice not a regular and orderly composition."۔ ناپختہ دلیلوں پر یہ تحریر منحصر ہوتی ہے۔ اسی میں انشائیہ کی خوبصورتی پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک شاعر دوست ہیں جن کے اشعار کی طرح ان کی بتّیسی بھی مصنوعی ہے۔ چونکہ مصنوعی بتّیسی سے اردو الفاظ کا حقیقی تلفظ ممکن نہیں، لوگ ان کے سنجیدہ اشعار کو بھی مزاحیہ اشعار سمجھ کر انہیں ہندوستان ہی نہیں خلیجی ممالک کے مشاعروں میں بھی مدعو کر لیتے ہیں ایک مشاعرہ سے قبل منسٹر صاحب نے ہمیں ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ منسٹروں کا ڈنر جسے عرف عام میں بُفے کہا جاتا ہے ایک انتہائی غیر مہذب عشائیہ۔ جس میں شرکاء کو اپنا حصہ حاصل کرنے کے لئے کشتی لڑنا پڑتی ہے اچھی خاصی ورزش کے بعد جب ہم اپنے حصہ کا رزق حاصل کرنے کے لئے میز تک پہنچے تو شاعرِ موصوف کو میز کے نیچے بیٹھا ہوا پایا۔ وجہ بس یہی تھی کہ دھکم دھکے میں شاعر صاحب کی مصنوعی بتّیسی میز کے نیچے جا گری اور اسے حاصل کرنے کے لئے میز کے نیچے پہنچ گئے لیکن واپسی کا راستہ نہ ملا تو مجبوراً تمام لوگوں کے کھانا کھا چکنے تک میز کے نیچے ہی بیٹھے رہے۔ بعض اوقات وہ اپنے

ترنم کو مظہر امام اسٹائیل عطا کرنے کی کوشش میں ڈائس پر بھی اپنی بتّیسی گرا بیٹھتے ہیں۔''(۸۱)

قیسی قمر نگری اس انشائیہ میں ''سالے'' کی قسمیں گنواتے ہیں کون سے بہنوئی کس حد تک بہتر ہے اور بہنوئی نے سالوں کی مدد کس طرح کرتے ہیں، دونوں کا آپسی رشتہ آپسی رشتہ کتنا مضبوط ہے پیش کرتے ہیں۔قیسی قمر نگری اس انشائیہ میں افعال واعمال، احساسات وکیفیات کو بھی موضوع بناتے نظر آتے ہیں۔ان کی اس تحریر میں فطری طور پر مزاح کی لہر اور ہلکی طنز کی کی کاٹ موجود ہے۔ وہ اعمال وافعال کی کیفیت کو شعوری سطح پر پیش کرتے ہیں۔ان کے اسلوب کی دلکشی قاری کو مسحور کرتی ہے۔ان کی تحریر کا یہ انداز ملاحظہ ہو:

''ہمارے ان خیالات کی مایوسی میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی میں ایک سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے وائس چانسلر نے اپنی تقریر میں فرمایا کے آپ اردو والے رشتے میں شری وینکٹیشورا سوامی کے سالے ہوتے ہیں۔''(۸۲)

قیسی قمر نگری کے انشائیے کے موضوع مختصر ہوتے ہیں۔معمولی عنوان کو غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ان کی زبان میں بے ساختگی اور ایک مخلص دوست کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔طنز وظرافت کے نشتر پند ونصیحت کے ساتھ چلاتے ہیں۔ان کے انشائیے دلچسپ ہیں جو قاری کے ذہن پر اثر چھوڑتے ہیں۔ان کا انشائیوں میں غیر رسمی طریقہ کار بھی ہے اور انشائیے اختصار پر مبنی ہوتے ہیں۔ان کا اسلوب رواں اور سادہ ہے کہ کہیں بوجھل پن پیدا نہیں ہوتا۔تجربات اور مشاہدات کی آمیزش انکی تحریر میں جان پیدا کر دیتی ہے۔انہوں نے اسلوب میں خارجی جہتوں کو کھل کر بیان کیا ہے۔ذاتی انکشاف سے پرہیز کرتے ہیں، بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر بہت عمدہ ہے، وہ وقت ضرورت محاوروں اور ضرب الامثال کا استعمال بھی ٹھیک طور پر پیش کرتے ہیں۔

۱۹.۴۔مجتبیٰ حسین

احمد حسین واہلیہ امیر النسا بیگم کے گھر ایک چراغ روشن ہوا۔جس کا نام حسن تھا جس کو ہم سب مجتبیٰ حسین کے نام سے جانتے ہیں۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد جب انھیں براہ راست چوتھی جماعت میں داخلہ دلایا گیا تو جماعت کے لحاظ سے عمر بھی بڑھا کر درج کرانی پڑی۔مجتبیٰ حسین کے قول کے مطابق جو شگوفہ رسالہ میں درج تاریخ پیدائش ۱۵/جولائی،۱۹۳۶ء ہے یہ درست ہے۔انہوں نے گلبرگہ سے میٹرک کیا عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔اے کے علاوہ پبلک ایڈمنسٹریشن میں ڈپلوما کیا۔روزگار کے سلسلے میں روزنامہ سیاست سے ۱۹۶۲ء تک وابستہ رہے۔اسی اخبار میں مزاحیہ کالم نگاری شروع کی۔۱۹۷۲ء میں حیدرآباد سے دہلی منتقل ہوئے۔اورنیشنل کاؤنسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ سے وابستہ ہوئے جہاں سے ۱۹۱۹ء میں بحیثیت ایڈیٹر وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔کئی بیرونی ممالک کا سفر کیا مثلاً جاپان، برطانیہ،فرانس، امریکہ ،کینڈا، روس، ازبیکستان، پاکستان،سعودی عرب،سلطنت عمان اور متحدہ عرب امارات وغیرہ۔مجتبیٰ حسین نے مزاحیہ کالم نگاری میں اپنے اس سفر کی ابتداء کی۔بعدازاں انہوں نے کئی مزاحیہ مضامین،خاکے اور سفرنامے لکھے۔چند اہم تصانیف کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

بہرحال(۱۹۲۷ء)،تکلف برطرف(۱۹۶۹ء)،سو ہے وہ بھی آدمی(۱۹۷۲ء)،قصہ مختصر(۱۹۷۴ء)، آدمی (۱۹۸۱ء)، جاپان چلو جاپان (۱۹۸۳ء)، الغرض(۱۹۸۷ء) ، چہرہ در چہرہ(۱۹۹۳ء)، سفر ہمت (۱۹۹۵ء)،آخرکار(۱۹۹۷ء)،ہوئے ہم دوست جس کے(۱۹۹۹ء)،میرا کالم،مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں تین جلدیں پر مشتمل ہیں اور آپ کی تعریف(۲۰۰۵ء) کے علاوہ ہندی میں پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ہندوستان کے کئی علاقائی زبان میں تراجم۔ان کا سفرنامہ، جاپانی،چینی زبان میں بھی شائع ہوا۔ان کی مکمل ۲۴ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اعزازت: پدم شری ایوارڈ برائے ادب وتعلیم،اڈیسہ ادیبوں کی تنظیم سرس ساہتیہ سمیتی کٹک کی جانب سے یاسیہ رتن کا خطاب ۱۹۸۰ء،کل ہند مخدوم محی الدین ادبی ایوارڈ،آندھراپردیش اردو کا ادبی ۱۹۹۹ء کل ہند ایوارڈ برائے طنز و مزاح ، ہریانہ اردو اکاڈمی علاوہ ازیں تصانیف پر ملک کی مختلف اکاڈمیوں کے انعامات مل چکے ہیں۔انہیں ۱۰ سے زائد ایوارڈز حاصل ہوئے۔اور ۲۷ مئی ۲۰۲۰ء کو حیدرآباد میں اس دنیاءِ فانی کو الوداع کہا۔

''چینی ایش ٹرے کی یاد میں''،مجتبیٰ حسین کا بہت عمدہ تحریر ہے۔اس میں وہ دلچسپ واقعات دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں۔وسیع مطالعہ کے مالک ہے ان کے مشاہدات اور تجربات میں کافی وسعت بھی ہے۔

اپنی تخلیق کو شگفتگی سے تحریر فرماتے ہیں۔ان کی تحریروں سے قاری لطف اندوز ہوتے ہیں۔ایک دور میں ایش ٹرے کا بہت فیشن چل رہا تھا۔ بہت سارے لوگ سگریٹ کے شوقین تھے ایک وقت تھا کہ لوگ سگریٹ پی کر اس کے دھواں کو گول گول چھلا بنا کر اس طرح چھوڑتے کہ دوسرے لوگ ان سے متاثر ہوتے۔سگریٹ بجھانے کے لئے تقریبا ہر گھر میں ایک ایش ٹرے ضرور ہوتی۔اکثر ہمارے یہاں کی روایت ہے کہ غیر ممالک کے چیزوں کی بہت قدر کی جاتی ہے زیادہ تر چین کی۔مجتبی حسین ''چینی ایش ٹرے کی یاد میں'' میں اپنے دوستوں کے ساتھ کسی بھی موضوع پر لاحاصل بحث،سگریٹ کے پر لطف کش،ایش ٹرے میں سگریٹ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور سگریٹ کی راکھ سے ایش ٹرے کے فل ہونے کے اسباب کے ساتھ ساتھ ماضی کی یادوں کو اجاگر کرتے ہیں۔اور ان کے دوستوں کے مباحث، عادات واطوار بہت عمدہ گی سے پیش کرتے ہیں۔خوبصورت اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ادھر جب سے چین نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا میں اپنی سگریٹ کی آگ کے علاوہ اپنے دل کی آگ بھی اس ایش ٹرے میں بجھانے لگا تھا۔مگر جب یہ ٹوٹ گیا تو مجھے یوں لگا جیسے یہ اپنے ساتھ پندرہ سالہ سماجی، ادبی، اور تہذیبی زندگی کی یادیں بھی لے کر چلا گیا ہے۔اسی ایش ٹرے کے اطراف بیٹھ کر میرے دوستوں نے بڑے بڑے معرکے سر کئے تھے۔ بہت سے ادیبوں کو ادب میں مقام عطا کیا تھا۔ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی تھی۔کسی فلسفیانہ مسئلے پر غور کرتے کرتے اکثر اوقات میرے احباب ایش ٹرے کو سگریٹوں سے بھر دیتے تھے اور جوں جوں ایش ٹرے سگریٹوں سے بھرتا جاتا تھا میرے دوستوں کے ذہن خالی ہوتے جاتے تھے۔ میرے دوستوں اور ایش ٹری میں یہی تو ایک فرق تھا۔ جب ایش ٹرے لبالب بھر جاتا تو میں بحث کے'' حاصل'' کو کوڑے میں پھینک آتا تھا اور نئے سرے سے ہم لوگ کسی مسئلے کو پھر سے اٹھا لیتے تھے۔ یوں بھی دور جدید کے بہت سے مسائل کا بوجھ صرف ایش ٹرے ہی اٹھائے پھرتا ہے۔ جب احباب چلے جاتے اور میں ڈرائنگ روم میں اکیلا رہ جاتا تو میں ایش ٹرے میں جھانک کر یہ دیکھ لیتا تھا کہ ہم نے آج کتنی بحث کی ہے اور ابھی کتنی بحث ہونی باقی ہے۔'' (۸۳)

مجتبیٰ حسین کی تحریر کو لطافت سے پڑھنے والوں کے ذہنوں کی ترنگوں میں ایک نیا جوش امڈتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ساتھ ہی ان کی ظرافت سے مزین چٹکیاں سونے پر سہاگہ کا کام انجام دیتی ہیں۔اگر انسان اپنے سوچنے سمجھنے کے نظریہ کو بدل دیں تو ہوسکتا ہے اس کی کئی مشکلیں آسان ہوجائیں۔مجتبی حسین ''ہماری بے مکانی دیکھتے

جاؤ'' میں نظریہ کی عکاسی جابجا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مالک مکانوں پر بھرپور طنز کرتے ہیں کہ ان کے حرکات وسکنات سے کرایہ داروں کی زندگی کس طرح متاثر ہوتی ہے۔ یہ خوبصورت اقتباس ملاحظہ ہو:

''مگر میرے لئے یہ خوشی کی بات نہیں ہے۔ کرایہ کے مکان میں ازدواجی زندگی کا جو لطف ہے وہ ذاتی مکان میں کہاں۔ میں نے تم سے شادی ہی اس لئے کی تھی کہ تمہارا اپنا کوئی ذاتی مکان نہیں ہے' کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ جس دن تمہیں اپنا مکان مل جائے گا۔تم اپنی ساری توجہ مجھے بنا بے سنوارنے کے بجائے مکان کو بنانے سجانے میں صرف کردوگے_____ میں اپنے اور تمہارے بیچ کسی مکان کو حائل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی۔ پھر ہماری خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز یہی ہے کہ تمہارا زیادہ وقت مکانوں کے مالکوں سے لڑنے یا انہیں خوش کرنے میں گزرتا ہے۔ مجھ سے لڑنے کی تمہیں مہلت ہی نہیں ملتی۔ جس دن مالک مکان ہم دونوں کے بیچ سے نکل جائیگا، ہم ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوجائیں گے۔ یہ ایک ایسی جنگی حکمت عملی ہے جس کے باعث ہمارے دائمی اور پائیدار امن قائم ہے۔ میں گھریلو اور عالمی امن کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں۔ چاہے مجھے ذاتی مکان سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑے۔''(۸۴)

مجتبیٰ حسین کا ایک اور مضمون ''ایک ملاقات دیمکوں کی ملکہ سے'' ہے۔اس تحریر میں وہ ان لوگوں پر سخت حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ جہاں کی لائبریری میں گرد وغبار کے انبار لگے ہوں اور وہاں اردو کے کتابوں کی خستہ حالی ہو۔لائبریری کی کتابیں دیمک کی غذا بن گئی ہو۔مجتبیٰ حسین اس مضمون میں بھی قلم کے جوہر دکھاتے ہیں۔ان کی نظر بالغ اور شعور توانا ہے، ان کا یہ مضمون خواجہ حسن نظامی کے انشائیہ ''جھنگر'' سے ملتا جھلتا ہے۔ان کی تحریروں میں ہلکا سا طنز بھی ملتا ہے۔غور فرمایئے:

''جب میں لائبریری کے اردو سیکشن میں داخل ہوا تو یوں لگا جیسے میں بھوت بنگلہ میں داخل ہوگیا ہوں۔ میں خوفزدہ سا ہوگیا، لیکن ڈرتے ڈرتے میں گرد میں اٹی ہوئی ''کلیات میر'' کھولی تو دیکھا کہ اس میں سے ایک موٹی تازی دیمک بھاگنے کی کوشش کررہی ہے، میں اسے مارنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک دیمک نہ کہا، ''خبردار! جو مجھے ہاتھ لگایا تو میں دیمکوں کی ملکہ ہوں، باادب با ملاحظہ ہوشیار، ابھی ابھی محمد حسین آزاد کے ''آب حیات'' کا خاتمہ کرکے یہاں

پہونچی ہوں، جس نے آبِ حیات پی رکھا ہے، اسے تم کیا مارو گے، قاتل سے
دبنے والے اے آسماں نہیں ہم، دیمک کے منہ سے اردو مصرعہ کو سن کر میں
بھونچکا سارہ گیا، میں نے حیرت سے کہا، تم تو اچھی اردو بول لیتی ہو بلکہ اردو
شعروں پر بھی ہاتھ صاف کر لیتی ہو، بولی اب تو اردو ہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے
اور کھانا پکانا بن گیا ہے''۔ پوچھا کیا اردو زبان تمہیں بہت پسند؟ بولی! پسند اور
ناپسند کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے، زندگی میں سب سے بڑی اہمیت آرام اور سکون
کو حاصل ہے، جو مجھے یہاں مل جاتا ہے، تم جس سماج میں رہتے ہو وہاں آرام
سکون اور شانتی کا دور دور تک کہیں کوئی پتہ نہیں ہے۔''(۸۵)

انشائیہ کی ایک خصوصیت بات سے بات پیدا کرنا ہے۔ جس میں انشائیہ نگار خود سے ہی کوئی بات کہتا ہے پھر جواز نکال کر بات سے بات پیدا کرتا ہے۔ جس سے یکسانیت کا شکار نہیں ہوتا اور قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ مجتبیٰ حسین بہترین انداز میں بات سے بات کا اظہار کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

''آدمی اور جانور میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جانور جگالی کرتا ہے اور آدمی
صرف گالی دیتا ہے، جگالی کرنے سے جانور کی غذا ہضم ہو جاتی ہے اور گالی
دینے سے آدمی کے منہ کا ذائقہ بدل جاتا ہے۔''(۸۶)

مجتبیٰ حسین کا اسلوب سادہ اور رواں ہے، وہ بہت خوبی کے ساتھ الفاظ کے ذریعہ نئے معنی پیدا کرتے ہیں۔ نئے معنی میں تلاش کرنے کا یہ انداز ملاحظہ ہو۔

''میرے دوست نئے سرے سے اپنے اپنے سگریٹ جلا لیتے اور ''بحث
پیا'' میں جھانک کر یہ دیکھتے رہتے کہ ہماری بحث کہاں تک پہونچی ہے۔''
(۸۷)

مجتبیٰ حسین بے تکلفی کو بھی شوخی کے ساتھ پیش کر رہے ہیں یہ انداز بیان ملاحظہ فرمائیں:

''ہم نے کہا بھائی صاحب! آپ ایک سنجیدہ سوال کو ایک غیر سنجیدہ آدمی پر
ضائع کر رہے ہیں، رہا یہ سوال کہ بجٹ غریبوں کے حق میں ہے یا نہیں تو سلسلے
میں عرض یہ ہے کہ ابھی ہم نے یہ اعلان سنا کہ جو غریب آدمی ۶۵ برس کا
ہو جائے گا اسے ماہانہ ستر روپے وظیفہ دیا جائے گا، بھائی صاحب! جس غریب
آدمی کے لئے ایک دن کا جینا بھی دشوار ہو۔''(۸۸)

مجتبیٰ حسین اپنے موضوع کی مناسبت سے تاریخی، ادبی، ثقافتی معلومات کو اس انداز میں قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ قاری ان کی طرف متوجہ ضرور ہوتا ہے۔مجتبیٰ حسین قاری کی خوشی کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''مجھے تصویروں میں مسکراہٹ بہت پسند آتی ہے۔''مونالیزا کی مسکراہٹ تو اتنی کھائی کہ اکثر بار بدہضمی ہوگئی۔زمانے کو اس کی مسکراہٹ آج تک سمجھ میں نہیں آئی مجھے اس کا ذائقہ سمجھ میں نہیں آیا عجیب مسکراہٹ مٹھائی جیسی ذائقہ ہے کھائے جاؤ تو بس کھاتے ہی چلے جاؤ۔بھلے پیٹ بھر جائے لیکن نیت نہیں بھرتی۔''(۸۹)

مجتبیٰ حسین کے اسلوب میں دلکشی اور رعنائی ہے۔ان کی تحریروں میں مزاح اور تفکر کا عنصر نمایاں ہے۔ کہیں عبارت میں دلکشی و شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔وہاں انشائیہ ہلکا پھلکا اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔ان کی خیال آفرینی کمال ہے۔ان کا اسبِ قلم دوڑتا جاتا ہے ان کے الفاظ ایک رو کی طرح اس کے پیچھے دوڑتے ہیں جو صفحات پر پھیل جاتے ہیں۔روانی بھی ان کے تحریروں کی خوبی ہے۔ان کا زاویہ نگاہ کچھ خاص ہے وہ موضوع کا جائزہ ایک خاص نقطے پر کھڑے ہو کر لیتے ہیں۔وہ اپنے گرد و پیش کے مناظر کو بھی موضوع بناتے ہیں۔بے تکلفی، بے ربطگی، اور شگفتگی ان کی تحریروں میں شامل ہیں۔اس کے علاوہ زبان و بیان کی تمام خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔مثلاً تشبیہ، محاورہ، ضرب الامثال، کہاوتیں اور وقت ضرورت انگریزی الفاظ کا استعمال بہت عمدہ ہے۔ایش ٹرے، دیمک، اور اپنے کرائے کے گھر سے، ہماری بے مکانی دیکھتے جاؤ، یہ چند ایسے مضامین ہیں جو انشائیے سے بالکل قریب ہیں۔ ان میں انشائیہ کی چند ایک خصوصیات پائی جاتی ہیں۔اگر وہ باطنی کیفیات کو اجاگر کرتے تو کامیاب انشائیے تحریر کر سکتے تھے ساتھ میں اختصار و ایجاز سے بھی کام لیتے تو ان کے انشائیے سونے پر سہاگہ ہوتے۔

۲۰.۴۔ محمد برہان حسین

محمد برہان حسین ۱۹۳۶ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ان کے والد غفور حسین صدیقی تھے۔ برہان حسین عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔یس۔سی تک تعلیم حاصل کی ،اور ان کو ادب سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔مزاحیہ مضامین تحریر فرماتے تھے ساتھ ہی ''رہنمائے دکن'' میں کالم تحریر کرتے تھے۔''رہنما ورہرو'' ان کا مطبوعہ ''رہنمائے دکن'' میں شائع ہو چکا ہے۔''چند کلیاں نشاط کی'' مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جو شائع ہو چکا ہے۔شگوفہ میں اکثر انشائیہ اور مزاحیہ مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں۔ان کے مزاحیہ مضامین کے سلسلے میں جیلانی بانو کچھ اس طرح لکھتی ہیں:

> ''برہان حسین کی تحریر شگفتہ اور دلچسپ ہے۔ان کے بارے میں کچھ نہیں، بلکہ بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے۔کیونکہ انہوں نے آج کے اعصابی تناؤ والے ماحول،اور دکھتے ہوئے دلوں کے لئے اپنے شوق اور دلکش تحریروں سے آکسیجن پہنچانے کا کام لیا ہے۔''(۹۰)

محمد برہان حسین کو ادب سے دلچسپی اور شوق ہونے کے سبب مختلف موضوعات پر کئی تصنیفات لکھیں۔ ان کے اسی ادبی شوق نے انھیں پروان چڑھایا۔محمد برہان حسین اپنے ادبی ذوق کے سلسلے میں خود تحریر کرتے ہیں:

> ''حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی جن کی صحبتوں اور تحریروں کے مطالعہ سے مجھ میں آسان اور دلکش اردو لکھنے کا ذوق پیدا ہوا۔''(۹۱)

محمد برہان حسین کی تحریروں میں انبساط ہے۔سماجی مسائل کو مزاح کے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اسلوب میں بھی سیدھا سادہ انداز اپناتے ہیں۔موضوع کے اعتبار سے وہ سامنے کی اشیاء ہی لیتے ہیں۔موضوع سے متعلق ضروری مواد کے علاوہ فاضل مواد کو خاطر میں نہیں لاتے۔ان کے اسلوب کی جھلک ملاحظہ فرمائیں:

> ''مقامی لوگوں میں گنڈی پیٹ کے شوقین دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ مالدار لوگ بیوی کے ساتھ شادی سے پہلے ہو آتے ہیں۔اکثر یہاں کی پکنک بر دکھادے اور ''سلکشن گالنس'' کے طور پر بھی استعمال کی جاتی ہے۔لیکن غریب لوگ شادی کے بعد ایک بار ضرور جاتے ہیں۔اب یہ اور بات ہے کہ جن کی ازدواجی زندگی اچھی ہوتی ہے وہ گنڈی پیٹ کی دل سے عزت کرتے ہیں۔ لیکن جن کی ازدواجی زندگی برباد ہے وہ اسی پر الزام دھرتے ہیں۔اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک صاحب نے ایک عمارت دکھا کر کہا ''شادی خانہ ہے''۔

وہ صاحب بپھر کر بولے ''بربادی خانہ کہو میاں میری شادی یہیں تو ہوئی تھی''۔غرض خوش حال لوگ گنڈی پیٹ کا شکریہ کرنے جاتے ہیں اور بدحال گالیاں دینے مگر ایک صاحب نے جو صاحب عرفان ہیں، کہا ''مرد کی ذات ہوتی ہی بے وفا میاں!'' خوش حال لوگ گنڈی پیٹ جا کر ایک اور چانس لیتے ہیں کہ ایک اور لڑکی مل جائے تو عقد ثانی کرلیں۔ بدحال لوگ یہ چانس لینے جاتے ہیں کہ کوئی ناگہانی حادثہ ان کی موجودہ بیوی سے نجات دلائے۔''(۹۲)

محمد برہان حسین کا ایک انشائیہ ''سینما بینی'' ہے جس میں انہوں نے مختلف لوگوں کے فلم دیکھنے کی الگ الگ وجوہات کو بیان کرتے ہوئے ٹکٹ بلاک کس طرح ہوتا ہے اور لوگ کس طرح بلاک میں ٹکٹ خرید کر اپنا پسندیدہ شو دیکھتے ہیں چاہے اس میں ان کی آدھی تنخواہ کیوں نہ کٹ جائے۔اس طرح وہ اپنے انشائیہ میں طنز و مزاح کے ساتھ زندگی کے مشاہدات کو ایک طلسمی ماحول میں ترتیب دیتے ہیں۔

''بہرحال ہر مرض کی دوا فلم ہے اور ہر صحت مند انسان کی بیماری فلم ہے۔فلم دیکھنے والوں کا دائرہ اتنا وسیع ہے۔۔۔۔اس کا اندازہ ایک واقعہ سے بخوبی ہوسکتا ہے۔''ایک دفعہ پکچر ہاؤس میں دوسرا شو ساڑھے دس بجے بھی شروع نہیں ہوا لوگ مینیجر پر برس پڑے مینیجر نے کہا صاحب ناراض مت ہوئیے۔۔۔۔رمضان کا مہینہ ہے لوگ تراویح ختم کر کے آتے ہیں۔ان کا تو خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود فلم دیکھنا اب بھی معیوب نہ سہی مگر اچھی حرکت نہیں تصور کی جاتی۔مثال کے طور پر اگر شادی کی بات چیت چل رہی ہو اور یہ معلوم ہوجائے کہ لڑکی ''ہنٹر والی'' سے لے کر ''دیوداس'' تک کوئی فلم نہیں چھوڑتی تو لڑکی والوں کو صفائی دینی پڑتی ہے گھر بار کی ذمہ داری پڑ جائے گی تو یہ شوق خود بہ خود ختم ہوجائے گا۔ایک صاحبہ کے سامنے ایک رشتہ کے سلسلہ میں کسی لڑکی کا ذکر ہوا تو چیخ اٹھیں افواہ! وہ تو اتنی آوارہ ہے ہر فلم میں پہلے دن اس کو موجود دیکھ لو۔۔۔۔ہم شریفوں میں وہ نبھنے کی نہیں۔''(۹۳)

انشائیہ کی ایک اور خوبی داخلی کیفیت ہے۔برہان حسین اس خوبی کو اپنی گہری نظروں سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ اپنی شخصیت کو کبھی مرزا، کبھی شرفو میاں، کے ذریعہ اظہار کرتے ہیں تو کبھی میں اور ہمارے ذریعہ سامنے آتے ہیں۔وہ اپنی داخلی کیفیت کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

''مرزا صاحب کے پروگرام کے مطابق شہر کے ایک ہال میں جو اس قسم

کے تقاریب کے لئے مشہور تھا اسٹیج سجا اور سامعین کی تالیوں کی گونج میں مرزا صاحب نے دونوں صحافیوں کی گلپوشی کی ایک مہمان خصوصی اور دوسرا صدر محفل تھا اسکول ٹیچر فکر ڈوم نے (ادبی نام) جو خود کو پروفیسر مشہور کئے ہوئے تھے تقریر شروع کی۔۔۔'' یہ صاحب اور مین بالکل اجنبی تھے چند دن قبل میرے عزیز دوست اور ناول کے مصنف نے جب ناول میرے حوالے کی تو نہ میرا تقریر کرنے کا پروگرام تھا اور نہ ہی انہوں نے ذکر کیا تھا مگر جب مجھے اس کی رسم اجراء کا دعوت نامہ ملا تو میں نے سوچا اس کی تعریف نہ کرنا ادبی بداخلاقی ہوگی جب یہ کتاب ملی تو میں قرۃ العین کی نئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ایک سرسری نظر ڈالنے کے خیال سے جب میں نے اسے شروع کیا تو آپ یقین کیجئے مجھے وقت کا احساس اس وقت ہوا جب میرے سگریٹ ختم ہوئے، ادھر میں نے گھڑی دیکھی پھر تعجب ہوا کہ رات کیسے گزر گئی اور میں نے اس ناول کو پڑھا اور پھر پڑھنے لگا۔ بے ساختہ میرے دل سے دعا نکلی ''اللہ کرے زور قلم اور زیادہ''۔اس کتاب کے مصنف میرے عزیز دوست ہیں اس لئے بھی اور ایک عظیم ادیب ہیں اس لئے بھی میں نے کچھ کہنا ضروری سمجھا۔ مصنف کا تعلق ہندوستان کے ستائے ہوئے مظلوم اور محنت کش طبقہ یعنی آئی اے ایس سے ہے چنانچہ آپ کو ان کے زیر نظر ناول میں جا بجا، افلاس اور جنسی بے راہ روی کا دور دورہ نظر آئے گا۔''(۹۴)

انشائیہ کی ایک خصوصیت بے تکلفی بھی ہے۔ یہ خصوصیت برہان حسین کے اسلوب کی تازہ کاری ہے۔ وہ اپنے تخلیقی فن کے ماہر ہیں بے تکلفی کا عنصر ان کے پاس بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس عنصر کی خوبی ان کے انشائیہ ''فورین (FOREIGEN) کا جنون'' میں دیکھئے وہ کس طرح خوبی کے ساتھ یہ بتلاتے ہیں کہ پردیس میں رہنے والے ہمیشہ اپنے وطن کی چیزوں کیلئے کس طرح ترستے ہیں۔ اس لئے ان کے رشتہ دار اور عزیز و اقارب اگر کوئی پردیس جا رہا ہے تو کچھ نہ کچھ چیزیں روانہ کرتے ہیں۔ ان کی خاص خوبی ملاحظہ فرمائیے:

''جی ہاں۔ جی ہاں! آپ کیسے جانتے ہیں انھیں۔''

''میں نے دوسرا وار کیا'' وہ کالے عرب میں ہیں نا!''

''جی ہاں۔ جی ہاں''! آپ کیسے جانتے ہیں انھیں۔''

میں نے چڑ کر کہا'' توبہ! مجھے ان سے کیا واسطہ میں تو آپ کے کپڑوں اور

صورت سے سمجھ گیا تھا کہ آپ کے بہنوئی۔۔۔۔''

ہمارے ایک دوست نے آہستہ سے ہمارے کان میں کہا''ارے یار! پوچھو اگر اس کا بہنوئی کویت جانے والا ہے تو خالو اپنے داماد کے لئے کچھ چیزیں بھجوانا چاہتے ہیں اور اگر ابوظہبی جانے والا ہے تو منجھلے چچا اپنے لڑکے کے لئے اچار اور بڑیاں بھجوانا چاہتے ہیں اور اگر سعودی عرب جارہا ہے تو چھوٹے ماموا پنی لڑکی کے لئے''۔ میں نے تنگ آ کر کہا''توبہ توبہ توبہ ہے بھائی کیا مصیبت ہے میں نے کیا مصیبت مول لی''۔ (۹۵)

انشائیہ دراصل عربی زبان کا لفظ ہے۔ جو انشا سے مشتق ہے جس کے معنی عبارت آرائی کے ہیں۔ یہ مصنف پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ قاری پر نہیں چھوڑتا۔ اسی طرح برہان حسین الفاظ کے معنی خود ہی منتخب کرتے ہیں۔ محمد برہان حسین کا نئے معنی کے اظہار کا اپنا ایک انداز ہے، جس میں شگفتگی کے ذریعہ نئے معنی کی وضاحت کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

''شرفو میاں جب بھی عادل آباد جاتے تو بس گھنے جنگلوں اور پہاڑوں میں سے ہوکر جاتی، وہ سوچتے کہ اتنے جنگلوں اور خطرناک پہاڑوں کو عبور کر کے لوگ عادل آباد میں کیوں جا بسے پھر خیال آتا شاید انہیں بھی غفلت میں پکڑ کر وہاں لا چھوڑا گیا ہو۔

ایک دفعہ ایک خطرناک موڑ پر ساتھی مسافر نے ان سے کہا،'' دیکھئے یہ ہیر پن بینڈ ہے''۔ شرفو میاں نے اسے حیرت سے دیکھ کر کہا'' آپ کو بس میں سے سڑک پر پڑا ہوا ہیر پن نظر آ رہا ہے۔۔۔۔۔ اور اس کا بینڈ BEND بھی، وہ مسافر ہنسا۔ آپ پڑھے لکھے آدمی نظر آتے تھے اس لئے یہ ٹرم TERM استعمال کی تھی۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ایسا موڑ جو وہیں گھوم کر اسی سمت میں آجاتا ہے۔''(۹۶)

اور ان کی تحریروں میں محاورے، ضرب الامثال، کہاوتوں کا بھی بھرپور استعمال ملتا ہے جس سے انشائیہ کی رعنائی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ محمد برہان حسین تخلیقی فن کے ذریعہ محاورے میں ردوبدل کر کے بات سے بات پیدا کرتے ہے، اس کے علاوہ مثل ہے، دھوبی کا کتّا گھر کا نہ گھاٹ کا'' برہان حسین نے اس ضرب المثل میں ردوبدل کر کے اس طرح پیش کیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

''اس کے بعد میری حالت ٹھیک اسی دھوبی کے گدھے کی طرح ہوگئی جو گھر

کا ہوتا ہے نہ گھاٹ کا۔!!''(۹۷)

محمد برہان حسین اپنے تخلیقی فن کے ذریعہ محاوروں اور ضرب الامثال میں ردو بدل کر کے انشائیہ کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں یہ ان کی تحریر کی خوبی ہے۔ برہان حسین اپنی تحریروں میں انشائیہ کی شعریات کو شعوری طور پر ملحوظ رکھتے ہوئے لکھتے ہیں۔اور برہان حسین کے پاس شعریات کا بھرپور استعمال ہوتا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''مگر جدید بزرگ تحقیقاتی کاموں کو بھی کباڑیئے کی دکان سے شروع کرتے ہیں۔ چنانچہ بقول شاعر:

میں نے جو گیت تیرے پیار کے خاطر لکھے
اب انھیں گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں

چند ایسے ہی جدید بزرگوں کی تحقیقات اخباروں کے کالموں میں چھپا کرتی تھیں ان تحریروں کو لوگ مزاحیہ کالم سمجھ کر پڑھتے تھے اور عبرت پکڑتے تھے کہ

جو دل کو جلائے، ستائے، رلائے
بابا ایسی ریسرچ سے ہم باز آئے!''(۹۸)

محمد برہان کے انشائیوں میں بے تکلفی بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔انکشاف ذات کو مرزا کے سہارے پیش کرتے ہیں۔زود ہضم اور عدم تکمیل کی خصوصیات کو مدنظر رکھ کر انشائیہ مکمل کرتے ہیں۔اپنے نفسیات اور شعور سے حاصل کردہ احساس کو ضائع نہیں کرتے بلکہ انشائی خاکہ تیار کرتے ہیں۔اور اپنے انشائیوں کے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کرتے ہیں۔دراصل انشائیہ ایک مزاج کا متقاضی ہے جس شخص کے مزاج میں عوامی اہمیت کی حامل اشیاء کو مختلف انداز اور زاویے سے دیکھنا آتا ہے پھر اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ بھی ہو وہ ایک بہترین انشائیہ نگار کہلاتا ہے یہ تمام خوبیاں محمد برہان حسین میں بھی پائی جاتی ہیں۔اس کے علاوہ ان کے انشائیوں میں الفاظ کے نئے معنی وہ خود ہی منتخب کرتے ہیں اور خود ہی واضح بھی کرتے ہیں۔انشائیے کی شعریات کو شعوری طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں محاورے اور ضرب الامثال کا استعمال بکثرت ہوتا ہے اور محاوروں اور ضرب الامثال کو ردو بدل کر کے اپنی تحریروں کو قلم بند کرتے ہیں۔اس کے علاوہ زبان و بیان کی بے شمار خوبیاں ان کی تحریروں میں ملتی ہیں، مجموعی طور پر محمد برہان حسین ایک اچھے انشائیہ نگار ہیں۔

۲۱.۴۔ مسیح انجم

مسیح الدین نام اور مسیح انجم قلمی نام ہے۔ ۶/اکتوبر ۱۹۳۳ء کو ویلکٹور، تعلقہ سدی پیٹ، ضلع میدک میں پیدا ہوئے۔ بی۔اے، بی۔ایڈ تک تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں پیشہ درس وتدریس سے وابسطہ ہوئے۔ ۱۹۹۱ء کو وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ ان کے مضامین اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ یہ بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں۔ طنز ومزاح پر ان کی تین کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ سائیڈ سے چلئے ۱۹۷۳ء، در پردہ ۱۹۷۶ء اور چنانچہ ۱۹۸۳ء کے بعد طرفہ تماشہ ان کے مضامین کا مجموعہ جو ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے بارے میں مسیح انجم خود فرماتے ہیں۔

> ''چند فنٹیاسی، چند انشائیہ چند مضامین اور چند خاکوں پر مشتمل اس مجموعہ کا نام ''طرفہ تماشہ'' ہے۔ جو میرا چوتھا مجموعہ ہے۔''(۹۹)

مسیح انجم طنز ومزاح کے ایسے ادیب مانے جاتے ہیں جس میں طنز ومزاح کم مگر تیز وتند اور مزاح کی چاشنی زیادہ ہے۔ وہ شہری اور دیہاتی زندگی کے مسائل کو خوبصورت انداز میں تحریر کرتے ہیں۔ محمد مسیح الدین انجم کا قلیل علالت کے بعد ۳۱ مئی ۱۹۹۸ء میں وصال ہوا۔

انشائیہ کے معنی نئی بات پیدا کرنے کے ہیں۔ بعض مصنفین الفاظ کا استعمال معنی کے لحاظ سے کرتے ہیں، یا جملہ جو معنی دے رہا ہے وہی اس کے اصل معنی ہوتے ہیں۔ گویا معنی کے لحاظ سے الفاظ کا انتخاب مصنف خود کرتا ہے۔ مسیح انجم انشائیہ کے معنی سے بخوبی واقف ہیں۔ اکثر اپنے انشائیوں میں ''دجال'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ انشائیہ میں خوبصورت انداز میں انشاء کے معنی بتلاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''میں اس قسم کے لیڈروں کو جب دیکھتا ہوں تو گھبرا جاتا ہوں کیونکہ ان کے اس بونتہ کے اندر دجّال چھپا ہوتا ہے۔ لیکن عوام اس کو پہچان نہیں پاتے لہذا وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ دجّال کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ جلوس نکلتے ہیں۔ نعرہ بازی شروع ہوجاتی ہے۔
>
> جیتے گا بھئی جیتے گا : بونتے والا جیتے گا
>
> اور پھر دجّال الیکشن جیت جاتا ہے۔ جیسے ہی وہ اقتدار پر آجاتا ہے فورا ً بونتہ کو جھٹک دیتا ہے اور رضائی اوڑھ لیتا ہے۔ تب وہ بونتہ ستیہ نارائینا کی بجائے بی ستیہ نارائینا کی نیم پلیٹ لگاتا ہے۔ اب اس کو عوام سے کئے ہوئے وعدے یاد نہیں رہتے۔ وعدہ تو خیر دور کی بات ہوئی۔ عوام کی سیدھی سادی

زبان اس کو سمجھ میں نہیں آتی۔ یہاں تک کہ وہ خود اپنی مادری زبان بھول جاتا ہے اور اقتدار کی زبان میں بات کرنے لگتا ہے۔ یہیں سے ترسیل کا المیہ شروع ہوجاتا ہے۔ عوام اپنی مادری زبان اور سیدھی سادی اردو زبان میں اپنا حق مانگتے ہیں۔۔۔

ع ''روٹی، کپڑا اور مکان''

وہ اقتدار کی زبان میں جواب دیتا ہے۔

''اپڑی تپڑی، پوتی کا پان''(۱۰۰)

مسیح انجم انشائیہ ''بونتہ'' میں ''دجّال'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ ''دجّال'' کا لفظ تاریخی تلمیح کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس انشائیہ میں مسیح انجم نے سماج کی ایک پروقار شخصیت جو سیاسی بازی گری میں ماہر ہیں جس کو عوامی نمائندگی حاصل ہے۔ اس شخص کو سماج میں عام طور پر لیڈر کہا جاتا ہے۔ لیڈر میں موجود تمام خصوصیات کو مدنظر رکھ کر مسیح انجم نے ''دجّال'' کہہ کر بھرپور طریقہ سے لیڈر کی شان میں اضافہ کیا ہے۔ بونتہ، مفلسی اور غریبی کی علامت ہے۔

ان کا ایک انشائیہ ''ہنڈر ڈوی'' (100V) بھی ہے۔ اس میں انہوں نے سماج کے اس عام طبقہ کا ذکر کیا جس کو روزانہ اٹھ کر کہیں بھی جانا ہو تو وہ بس کا رخ کرتے ہیں۔ بس میں دورانِ سفر پیش آنے والے واقعات کو اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا مشاہدہ وسیع اور اسلوب تازہ کاری کی طرف مائل ہے۔ ان کے اس انشائیہ میں بے تکلفی اور شگفتگی کا انداز نظر آتا ہیں۔ گویا ان کے ہاں انشائیہ ایک ایسے عمل سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ جس کے مختلف پہلو ہیں۔ ان کے ہاں دوستی اور بے تکلفی کی مثال بہت عمدہ ہے وہ روزمرہ اور عام بول چال کے الفاظ کا استعمال بہت خوبی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

''کھڑے کھڑے جب ہمارے پاؤں جواب دے چکے اور کمر ڈھیلی پڑ چکی تو تب کہیں ''ہینڈر ریڈوی'' آئی۔ صمدانی نے فوراً خبر دار کیا ''ارے مسیح گھس!'' ہم نے کہا، ''یار ایسی بھی کیا جلدی'' بس کو خالی تو ہونے دو، پھر اطمینان سے گھسیں گے!'' بولے'' ارے یار! یہ بس خالی ہونے والی نہیں ہے۔ اس میں جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، وہ سب کے سب ''پاس ہولڈرس'' ہیں۔ اور الٹا سفر کرتے آرہے ہیں۔''(۱۰۱)

انشائیہ کی ایک تکنیک بات سے بات پیدا کرنا ہے۔ جس سے انشائیہ میں بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔

مسیح انجم بہت خوبصورت انداز میں بات سے بات پیدا کرتے ہوئے اپنے دل کی بات کہہ دیتے ہیں۔غور فرمائیں:

''جب موصوف نے عملی مظاہرے کے طور پر بورڈ پر چاک سے لکھ کر بتانے کی کوشش کی تو چاک چاک نہیں رہی تھی بلکہ چاک چاک ہوگئی تھی۔''
(۱۰۲)

ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''سارے لیڈر جو کل تک 'ایک وقت کا سوال ہے بابا' کی صدا لگایا کرتے تھے، میرے ووٹ کی مابہ دولت کا لقب اختیار کر کے منسٹر بن جاتے ہیں۔اور پھر میرے حصے میں صرف وعدے چھوڑ جاتے ہیں۔''(۱۰۳)

انشائیہ کا فن آزادی کا تقاضہ کرتا ہے۔وہ کہیں نظر نہیں آتا۔انشائیہ نگار اپنی جگہ آزاد ہوتا ہے۔اور وہ اس کا فائدہ اٹھا کر کوئی بھی بات کہہ دیتا ہے۔اور خود ہی جواز بھی پیدا کرتا ہے، جس سے بے ربطگی کا مظاہرہ بڑی خوبی کے ساتھ کے ہو رہا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''ہینڈریڈوی' میں سیٹ حاصل کرنا، پارلیمنٹ کی سیٹ حاصل کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔وہ اس لیے کہ پارلیمنٹ کی سیٹ حاصل کرنے کچھ قاعدے اور قوانین ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر ایک لاغر اور مریل قسم کا انسان حتی کہ قربانی کے لئے نا قابل قبول قرار دیا گیا ''دو پایہ'' بھی پارلیمنٹ کی سیٹ کا اہل قرار پاتا ہے۔لیکن ''ہینڈریڈوی'' میں سیٹ حاصل کرنے کا کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔''(۱۰۴)

انشائیہ نگار بس کی سیٹ کی بات کرتے کرتے پارلیمنٹ کی سیٹ تک پہنچ گیا یہی انشائیہ کی بے ربطگی کا اظہار ہوتا ہے جس کو انشائیہ نگار شگفتگی کے ساتھ اپنا حال دل بیان کرتا چلا جاتا ہے۔

مسیح انجم انشائیہ کے موضوع کو ادھر سے ادھر ہونے نہیں دیتے۔موضوع کے مرکز سے ہٹتے نہیں، مرکز کے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں اس کے علاوہ طنز و مزاح کے آلات سے بھی کام لیتے ہیں۔اور اپنا ہدف یعنی قارئین کی دلچسپی حاصل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ان کی انشائی کاوشوں کے پیچھے ان کا تجربہ، مشاہدہ اور مطالعہ صاف نظر آتا ہے۔ان کا اسلوب دلکش اور جاندار ہے۔جملوں میں ربط اور تسلسل کے ساتھ ساتھ معنوی گہرائی پائی جاتی ہے، انشائی عمل تہدار اور معنی خیز ہیں۔بے تکلفی اور شگفتگی کا انداز بہت خوب ہے۔گویا ان کے ہاں انشائیہ ایک

ایسے عمل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اس کے مختلف پہلو ہیں۔ جو ہلکا پھلکا اور غیر سنجیدہ اسلوب کا حامل ہوتا ہے۔ روایات وحقائق کے ساتھ لطیفے نما قصے بھی بہت عمدہ ہیں۔ وہ دوسری زبانوں کو بھی زندہ رکھتے ہیں۔ مسیح انجم انگریزی اور تلگو زبانوں کا استعمال بہت خوب کرتے ہیں۔ ان کی صنف انشائیہ سے دلچسپی اور انشائیہ کی شعریات کا استعمال وقت ضرورت مصرعہ کا انداز بیان بہت خوب ہے۔ وہ انشائیہ میں تین مصرعہ والی نظم کا بھی استعمال بخوبی کرتے ہیں۔ وہ گویا انشائیہ میں ایسے اسلوب کے قائل ہیں جس میں تازہ کاری کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ ان کے جملوں میں تشبیہات، محاورے، ضرب الامثال کا استعمال بہت خوبصورتی سے ہوتا ہیں۔ اور علمی وفنی اصطلاحات کا بھی بہ وقت ضرورت استعمال ملتا ہے۔ اسلوب کو متنوع اور پر لطف بنانے کے لئے ہر طرح کی تراکیب وسلیقہ مندی سے استعمال کرتے ہیں۔ باکثرت روزمرہ الفاظ کا استعمال ان کو دوسرے انشائیہ نگاروں سے منفرد بناتا ہے۔

۲۲.۴۔ممتاز مہدی

منجو قمر کسی نام کے محتاج نہیں۔ان کا شمار نامور ہستیوں میں ہوتا تھا۔منجو قمر شاعر ہونے کے علاوہ ممتاز ڈرامہ نگار بھی تھے۔منجو قمر کے یہاں ۱۵؍فروری ۱۹۵۲ء کو ملتانی پورہ، بیگم بازار میں ایک لڑکے کی پیدائش ہوئی جس کا نام سید ممتاز مہدی رکھا گیا۔ممتاز مہدی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ تحتانیہ اردو بیگم بازار میں ہوئی۔وسطانیہ کی تعلیم مدرسہ گوشہ محل معظم جاہی مارکٹ سے حاصل کی اور ایچ ایس سی (ایم۔پی) کی سند مدرسہ گوشہ محل عثمان گنج سے لی۔ گورنمنٹ سٹی کالج سے بی۔اے کیا۔شعبہ اردو، حیدرآباد ایو ینگ کالج بشیر باغ سے ایم۔اے میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔شعبہ اردو حیدرآباد یونیورسٹی سے ایم۔فیل اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ان کا تقرر پراویڈنٹ فنڈ آفس حیدرآباد میں ہوا۔

ممتاز مہدی کو ادب ورثہ میں ملا تھا۔ادبی ماحول میں انکی پرورش ہوئی۔بچپن سے ہی انھیں علم وادب کا شوق تھا اور ان کا ذوق وشوق آگے پروان چڑھا۔آسمان کی بلندی پر اپنا نام روشن کیا۔گریجویشن سے پہلے ہی ممتاز مہدی ''نوافسانے'' تحریر قلم بند کیں۔اور نویں منزل اس کا نام رکھا۔گرائجویشن کے دوران پہلا انشائیہ ''خواب'' تحریر کیا۔دوسرا انشائیہ ''برناڈ شاہ'' اور تیسرا ''فجو'' تحریر کیا۔جو شگوفہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ممتاز مہدی شاعر، ادیب، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، طنز ومزاح نگار اور انشائیہ نگار کی حیثیت سے مقبول ہیں۔ان کے انشائیوں کے بارے میں ڈاکٹر حبیب نثار اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''شامت اعمال'' میں ممتاز مہدی کے جملہ ۲۳ مضامین انتخاب کئے گئے ہیں جن میں سے بہت سے مضامین شگوفہ میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں کچھ غیر مطبوعہ ہیں ان انشائیوں کے بغور مطالعہ سے فنکار کے فن کے ارتقائی مدارج بہ آسانی سامنے آجاتے ہیں۔یہ فال نیک ہے کہ ممتاز مہدی کا فن ارتقاء پذیر ہے جو ان کے فن کی سچائی پر دال کرتا ہے۔
>
> ممتاز مہدی کے انشائیوں میں راقم الحروف کو دو مدارج صاف نظر آتے ہیں۔ان کے ابتدائی مضامین انشائیوں میں چھوٹے چھوٹے واقعات کو بیان کرتے ہوئے مزاح پیدا کرنے کی کوشش صاف نظر آتی ہے اس زمرہ میں ''فجو''، ''برناڈ شاہ''، ''خواب'' وغیرہ آتے ہیں۔اس کے بعد ممتاز مہدی کے فن میں ایک خوشگوار تبدیلی آئی اور انھوں نے مختلف واقعات کے تقابل اور انسانی افعال کے تقابل کو موضوع بنایا ہے اور اس ایک لفظ کے وسیلے سے انسانی افعال

کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اور طنز کے تیر چلائے ہیں۔ دراصل فن کے ارتقاء کی یہی وہ منزل ہے جہاں ممتاز مہدی اپنے ہم عصر نوجوان مزاح نگاروں انشا پردازوں سے منفرد و ممتاز نظر آتے ہیں''۔

آگے ڈاکٹر حبیب نثار اس طرح فرماتے ہیں:

''ممتاز مہدی گفتار کے غازی ہرگز نہیں ہیں لیکن انھیں بات سے بات پیدا کرنا اور بات اٹھانے اور بات بڑھانے کا سلیقہ آتا ہے اور جس عنوان پر چاہے وہ قلم اٹھا سکتے ہیں۔ ''شامت اعمال'' کے مضامین اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ ممتاز مہدی کو اپنے محسوسات کو جاندار اور جاذب نظر بنا کر پیش کرنے کا فن بھی آتا ہے، اور خوشنما تحریر تو ان کے اسلوب کا ایک حصہ ہے ہی۔ ان معنی میں اور اس تفصیل و تجزیہ کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ممتاز مہدی کے ان مضامین کو جو ایک لفظ کے محور پر گھومتے ہیں ایک لفظ کے وسیلے سے بیان ہوئے ہیں طنزیہ و مزاحیہ مضمون کہنا شاید ٹھیک نہیں ان کے مضامین انشائیہ کی تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ اسلئے ان کو انشائیے قرار دینا چاہئے۔ طنز و مزاح ان انشائیوں کا جز ضرور ہے لیکن طنز و مزاح ان مضامین کا محور نہیں اسی لئے ان کو انشائیہ کہنا ہوگا۔''(۱۰۵)

ان کی تصانیف: اردو ڈرامہ کے فروغ میں منجو قمر کا حصہ، نویں منزل افسانوں کا مجموعہ، شامت اعمال اور الٹی گنگا مزاحیہ مضامین اور انشائیوں کا مجموعہ ہیں۔ ان کی مزاح نگاری کے سلسلے میں پدم شری ڈاکٹر مجتبیٰ حسین اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

''ممتاز مہدی اردو کے سچے عاشق اور پرستار ہیں۔ وہ ایک نہایت ہی مہذب اور شائستہ، کم گو اور شریف النفس انسان ہیں اور ایسے انسان آج کے معاشرے میں ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ میں انہیں ایک اچھے مزاح نگار کی حیثیت سے بھی بہت پسند کرتا ہوں۔ طنز و مزاح نگاری کے لئے زبان و بیان پر جس گہری قدرت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کے پاس ہے۔ وہ بلند بانگ قہقہے بکھیرنے والے مزاح نگار نہیں ہیں بلکہ تبسم زیرِ لب کے قائل ہیں ان کا انداز بیان دلکش اور دل فریب ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ اردو طنز و مزاح کے سرمائے کو مالا مال کرتے رہیں۔''(۱۰۶)

ڈاکٹر ممتاز مہدی کے یہاں موضوعات کا تنوع ہیں۔ انھوں نے بہت ہی انوکھے اور اچھوتے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ کامیاب انشائیہ نگار کی یہ خوبی ہونی چاہئے کہ وہ ان موضوعات پر قلم اٹھائے جن پر کسی کی نظر نہ گئی ہو۔ ڈاکٹر ممتاز مہدی کے موضوعات میں خواب، برنا ڈشاہ، فجو، مرنا، جینا، کھانا، سونا، سوچنا، پینا، رونا، گھبرانا، نکالنا، بھاگنا، سمجھنا، چائے، جوتا، الٹی گنگا، مقابلہ وغیرہ ہیں۔ ان کے انشائیوں کے عنوانات بہت مختصر ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز مہدی کا ایک انشائیہ ''سوچنا'' بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اس میں ان کی محنت اور فکر انگیزی کا مظہر ہے۔ ''سوچنا'' میں انشائیہ نگار سوچ کو بہت سے مصائب کا سبب قرار دیتے ہیں۔ وہ تمام ایجادات کو انسانی سوچ کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر انسان اتنا گہرا نہ سوچتا تو نئی چیزیں وجود میں نہ آتیں اور ایجادات کرنے کی تحریک نہ ملتی۔ انشائیہ نگار کی نظر میں سوچ سے ایجادات ممکن ہے۔ ڈاکٹر ممتاز مہدی اپنی معلومات کو سوچنا کے ذریعہ قلم بند کرتے ہیں۔ سوچنے کے فائدے بتلاتے ہیں۔ انشائیہ نگار کے خیال میں مشرق والوں نے بہت پہلے سوچنے کے عمل کو چھوڑ دیا تھا بلکہ وہ اپنی سوچ کا استعمال جہیز لینے کی حد تک ہی کرتے ہیں۔ مغرب والوں کی سوچ سے نئی چیزیں ایجاد ہوسکتی ہیں۔ اس طرح انشائیہ نگار سوچ کا تقابل کرتے ہوئے ہندوستان پر طنز کے ہلکے تیر برساتے ہیں اور شگفتگی کے ساتھ بات سے بات بھی پیدا کرتے ہیں۔ انکا یہ فنی انداز ملاحظہ فرمائیں:

> ''ذرا سوچئے۔۔۔۔! اگر گیلی لوز مین کو بیضوی شکل کی کہتا تو وہ قید تنہائی نہ بھگتتا اور قید میں قندیل کو ہوا میں جھولتا دیکھ کر سوچتا اور نہ گھڑی ایجاد ہوتی۔ انسان گھڑی گھڑی گھڑیوں کے 'چکرویو' میں گرفتار بھی نہ ہوتا۔ گھڑی کا وجود نہ ہوتا تب بھی انسان سوچتا، چلتے، پھرتے اٹھتے، بیٹھتے، کھاتے، پیتے۔ اسی سوچ کے نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں جیسے نیوٹن نے سوچا سیب شاخ سے ٹوٹ کر نیچے کیوں گرا، اوپر کیوں نہیں گیا؟ لیجئے اس سوچ نے ہنگامہ بپا کردیا۔ مقناطیس اور زمین کی کشش کے علم نے اسٹرونواٹس اور کاسمونالس کو ساری دنیا کے محبوب چودھویں کے چاند، اور ننھے منّوں کے چندا ماما، تک پہنچادیا اور اس قدیم ترین محبوب یا ماما کے چہرے سے نقاب اُتار دیا اور چاند میاں کے سوچنے میں نمایاں تبدیلی آگئی۔
>
> گراہم بیل نے باپ کے بہرے پن کو دور کرنے کی سوچا تھا اور ایجاد کیا 'ٹیلی فون' جس میں آپ سوچ سمجھ کر یا بغیر سوچے سمجھے ہی بہت کچھ بول سکتے ہیں۔ کولمبس، انڈیا کے لئے نکلا تھا، پہنچ گیا امریکہ یعنی سوچا کچھ اور ہوا کچھ اور۔

یہ یورپی نوجوانوں کی سوچ اور کھوج ہے۔ ہندوستانی نوجوان جی بھر کے جہیز
دینے والے گھروں کی سوچ اور کھوج میں لگے رہتے ہیں۔''(۱۰۷)

انشائیہ نگار جب گفتگو کے دوران خیالات کے بیان میں ترتیب و تنظیم کا خیال نہیں رکھتا اور بار بار اپنے موضوع سے بھٹکتا رہتا ہے۔ چونکہ انشائیہ ایک آزاد ترنگ ہے اس لئے انشائیہ نگاری کو یہ آزادی ہوتی ہے۔ اسی لئے اپنے خیالات کو بے ترتیبی سے پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ ممتاز مہدی دیکھئے اس پیراگراف میں کمپیوٹر کی بات کرتے کرتے غالب کا ذکر چھیڑتے ہیں۔ اور غالب سے سیدھے جہیز کی بات پر آجاتے ہیں۔ اس بے ترتیب کو ترتیب سے ملاحظہ فرمائیں:

''اکیسویں صدی ایک طرح سے کمپیوٹروں کی صدی ہوگی' حالات کی سنگینی کا
احساس ان میں بھی بہت زیادہ ہوگا، ان مشکل حالات میں بھی اردو مقبول رہے
گی اور اکثر کمپیوٹر غلام محمد کی دھن میں غالب کی یہ غزل گنگناتے پائے جائیں
گے۔

ع رہئیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

جہیز کی مانگ میں بہت ہی خوشگوار اضافہ ہوگا یعنی ہر قسم کے کمپیوٹر مانگے
جائیں گے۔ امیر ترین لوگ کمپیوٹروں کے علاوہ ''چاند گاڑیاں'' بھی جہیز میں
دیں گے دلہنوں کے مستقبل کا خیال کر کے آج کے دور میں ''ابدی سکون'' والا
کوئی ساز و سامان نہیں دیا جاتا لیکن اکیسوی صدی میں جہیز میں ''نیوکلر اسلحہ''
بھی دیا جائے گا۔''(۱۰۸)

ممتاز مہدی بھی اپنے قاری سے بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ جیسے کسی بے تکلف دوست سے محو گفتگو ہوں۔ وہ بے تکلفی سے قاری کے سامنے اپنے مشاہدات اور تجربات کو بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے قاری سے بے تکلف انداز میں اپنے مشاہدات و تجربات کو پیش کرتے ہیں۔ ان کا بے تکلفانہ انداز دیکھئے۔

''ہم ایسے حضرات سے بھی واقف ہیں جو نیند میں چلنے کے عادی ہوتے
ہیں۔ ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آئے ہیں کہ نیند میں اٹھے گھر سے چلے تو پھر
کبھی گھر نہ لوٹے۔ کچھ لوگ سوتے سوتے وہی حرکتیں کرتے ہیں جو دن بھر ان
کا معمول یا مشغلہ ہوتا ہے' جیسے ہمارا چھوٹا بھائی ہر رات اپنے بستر پر پتنگ
اڑانے لگتا ہے۔ یکا یک شور مچاتا ہے، پکڑ لیا۔ پکڑ لیا۔ ''ارے کھینچ''۔ ارے
کھینچ''۔ ابے چھوڑ''۔ ''دے ڈھیل''، ''دے ڈھیل''۔ اور ایک دوست ہیں جن

کی کرانہ کی دوکان ہے۔ وہ چیخ پکار نہیں کرتے بلکہ نیند کے آتے ہی پوڑیاں
باندھنے لگتے ہیں۔ جاگنے پر ان سے کہیں تو حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتے
ہیں۔ اور سب کے ساتھ خود پر قہقہے لگاتے ہیں۔''(۱۰۹)

ممتاز مہدی انشائیہ کی شعریات کو شعوری طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں اکثر غالب کے اشعار کا استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر شعراء اور مزاحیہ اشعار کا استعمال بھی بہت خوب ہوتا ہے۔ دیکھئے اس شعر کو توڑ توڑ کر نثر کے انداز میں کس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

''ہمیشہ زندہ رہنے والے ایک شاعر کا قول نہیں بلکہ شعر ہے:

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

گویا شعر کا ہے کو ہے ایک صدی پہلے آج کے حالات کی ویڈیو گرافی
۔۔۔۔۔ ہنستے ہنستے چلتے پھرتے مرنے کو خوش بختی کہا گیا لیکن:

گھستے گھستے پاؤں کی زنجیر آدھی رہ گئی

چناں چہ آدھی ہڈیاں گھس جاتی ہیں لیکن مرنے کا نام نہیں۔''(۱۱۰)

ممتاز مہدی اپنے انشائیہ ''جھگڑنا'' میں آزاد خیالی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ جھگڑنے میں تمام اقسام کے لڑائی جھگڑوں کے بارے میں بتاتے ہوئے جنگ کی ابتداء میں جنگ کے ہتھیار کا ذکر کرتے ہوئے قلم کو بھی ہتیار بنا کر لڑنے کے گن بتلاتے ہیں۔ حیدرآباد میں لڑنے کی وجوہات گالی سے لے کر مار پیٹ تک ذکر کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ''لکھنا'' کے حوالے سے بھی ان کا انشائیہ خوبصورت اور دلکش ہے۔ اس میں ابتداء میں اللہ تعالی کے قسمت لکھنے سے فرشتوں کے اعمال لکھنے کا ذکر کرتے ہیں۔ تحریر کی ابتداء کس طرح ہوئی اور کس پر لکھا جاتا ہے اس کو بیان کرتے ہیں۔ یہ انشائیہ زیادہ تر سنجیدگی کا حامل ہے تاہم کہیں کہیں ان کے جملے ان کے مشاہدے اور تجربے کو چند لفظوں میں سمیٹنے کی خوبصورت کاوش کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر ممتاز مہدی کا شمار ابتداء کے انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ جن کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے وہ اشیاء کی طرف نہیں کیفیات کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ اور بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ جہاں اس پر ایک سنجیدگی اور متانت آجاتی ہے۔ وہاں تحریر میں آہستہ آہستہ شگفتگی کا عنصر کم ہونے لگتا ہے باکثرت معلومات ہونے سے کبھی کبھی مضمون کا شبہ ہوتا ہے۔ اور احساس اور وجدان کے بجائے معلوماتی رنگ ان کی تحریر میں ابھر کر آتا ہے۔ وہ حقیقت اور سچائی کو خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بے ربطگی کا انداز

خوب ہے۔ ان کی تحریروں کا اسلوب سیدھا سادھا اورر واں ہے۔ ان کے انشائیے گہرائی اور گیرائی سے عاری ہیں۔ انشائیہ کی ایک خاص خوبی داخلیت یا خود کلامی ہوتی ہے لیکن وہ خارجیت سے کام لیتے ہیں۔ ان کے ہاں زبان و بیان کی بھی خوبیاں موجود ہیں۔

۲۳.۴۔منظورالامین

پروفیسر منظورالامین ۱۹۲۵ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔آپ ایک ممتاز ادیب،مترجم،شاعر،صحافی تھے۔انہوں نے ملازمت کا آغاز دکن ریڈیو حیدرآباد سے کیا اور پھر آل انڈیا ریڈیو کے کئی اسٹیشنوں پر ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔دور درشن کے ایڈیشنل ڈائرکٹر رہ چکے ہیں اور ڈائرکٹر جنرل دوردرشن کے عہدے سے وظیفہ یاب ہوئے۔انہوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے بڑی تعداد میں فیچر،ڈرامے،میوزیکل فیچر اور بیلے لکھے اور پروڈیوس کئے اس کے علاوہ انہوں نے موضوعاتی نظمیں اور مزاحیہ مضامین بھی تحریر کئے۔پروفیسر منظورالامین مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور کشمیر یونیورسٹی میں اپنی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ان کا انتقال ۳/مارچ ۲۰۱۷ء میں ہوا۔

تازگی اور اسلوب کی قدرت کے ساتھ ساتھ منظورالامین کے انشائیوں میں جو نمایاں ہے وہ یہ ہے بات سے بات پیدا کرنے کا انداز۔وہ کسی ایک موضوع کو لکھنا شروع کرتے ہیں تو اسی حد تک محدود نہیں رہتے بلکہ وہ زندگی کی طرح خارج اور داخلی دونوں سطحوں پر فکری سفر جاری رکھتے ہیں۔''جوتا''ان کا کامیاب انشائیہ ہے۔اس میں انہوں نے Gulliver اور Lilliput کی کہانی سے شروع کیا ہیں۔اور جوتے کے اقسام گنواتے ہوئے اس کے سائز کے بارے میں دلچسپ انداز میں واقعات بیان کیا ہے۔جوتے کے ذریعہ دنیا کی سیر کرواتے ہیں کس ملک کے لوگ کس طرح کے جوتے پہنتے ہیں۔جوتے کے فائدے اور نقصانات بتلاتے ہوئے جوتے کے ہار کو کون پہننا پسند کرتے ہیں اس کا ذکر خوبصورت انداز میں کرتے ہوئے قدیم رسموں اور روایتوں کے جوتے چرانے والی رسم کا بہت خوبی کے ساتھ تذکرہ کرتے ہیں۔اور آخر میں Cinderella کے قصہ پر سبق آموز بات کے ذریعہ اختتام کرتے ہیں۔

> ''اس کے برعکس ایک زمانے میں ہمارے چینی بھائی اپنے گھروں میں اپنی لڑکیوں کو لوہے کے جوتے پہنایا کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے پاؤں ٹھٹھر کر رہ جاتے تھے کیونکہ چھوٹا پاؤں خوبصورتی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔کہتے بھی ہے سر بڑا سردار کا' پاؤں بڑا گوار کا، ان چینی گڑیوں کے پاؤں واقعی چھوٹے چھوٹے خوبصورت نظر آتے تھے، جی چاہتا تھا کہ ان پاؤں کو اٹھا کر سر پر رکھ لیا جائے۔پاؤں کو سر پر رکھنے کی تکنیک کافی پرانی ہے۔خاص کر پاؤں کو سر پر رکھ کر بھاگ نکلنے کی تکنیک کو قومیں اور ملتیں صدیوں سے آزماتی اور چمکاتی آئی ہیں،افراد قوم پاؤں کو سر پر کیسے رکھتے ہوں گے اس ۔۔گرتو

ہمیں معلوم نہیں ہاں ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ قومیں اپنا بیڑا خود غرق کیسے کرلیا کرتی ہے۔شمشیر دستان اول طاؤس ورباب آخر۔''(۱۱۱)

منظورالامین کا ایک انشائیہ ''بچہ، باپ، دادا'' ہے اس میں وہ کہتے ہیں کہ بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے۔وہ انکشاف ذات سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اس بات کو بچپن میں سمجھ نہیں سکا کہ بچہ آدمی کا باپ کیسے ہوسکتا ہے۔بچوں کی شرارت کا ذکر قلم بند کرتے ہیں:

''انگریزی کی ایک کہاوت میں کہا گیا ہے:''بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے!''

بچپن میں جب ہم نے یہ کہاوت سنی تھی تب ہمارے چھوٹے سے دماغ میں یہ بڑی سی بات سما نہیں سکتی تھی کہ بچہ آدمی کا باپ کیسے ہوسکتا ہے، بڑے ہونے پر یہ بات آسانی سے ہماری سمجھ میں آ گئی کہ بچہ آدمی کا باپ ہی نہیں بلکہ دادا بھی ہوتا ہے اور صاحب ___ دادا یعنی صرف باپ کا باپ ہی نہیں بلکہ بمبئی والا دادا بھی!

آپ کہیں گے اللہ اللہ، ایسے ننھے منے شگوفوں کے لئے یہ کینہ، یہ بغض، یہ دشمنی، یہ عداوت! ابھی تو یہ پھول بھی نہیں بنے۔لیکن BUDDY آپ کو اس کا علم نہیں کہ یہ ہستیاں جنہیں آپ شگوفے یا غنچے یا کلیاں کہتے ہیں کیا کیا گل کھلانے والے ہوا کرتے ہیں۔شکلاً تو یہ شریف، معصوم اور بھولے ہوتے ہیں لیکن اصلاً ہوتے کچھ اور ہیں۔''(۱۱۲)

منظورالامین کے اسلوب میں انشائی شعریات کا استعمال بہت خوب ملتا ہے۔وہ کہیں شعر کا استعمال جوں کا توں کرتے ہیں تو کہیں شعر کو نثر بنا دیتے ہیں۔وہ پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے کو نثری انداز میں یوں تحریر کرتے ہیں:

''پہلے پتہ پتہ انسان کو معرفت کردگار کا دفتر نظر آتا تھا۔پتے بھی انسان کو جانتے تھے۔پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے خاص کر گاؤں، قصبوں میں پیڑ بہت عزیز سمجھے جاتے تھے۔پیڑ بھی گاؤں والوں کی محبت کا جواب محبت سے دیا کرتے تھے، جب کسی گاؤں والے کو کسی کام میں کامیابی ہوتی تو گاؤں کے پیپل کے پتے تالیاں بجا بجا کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اب نہ وہ پیپل ہے نہ وہ پتے!''(۱۱۳)

منظورالامین کے انشائیوں میں طنز کی کاٹ اور مزاح کی لہر کا پیدا ہوجانا فطری ہے۔''عزم اور ازم'' میں

کس طرح طنز ومزاح سے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ یہاں مصنف گھڑی کی بات کرتے کرتے دفتروں میں کام کرنے والوں کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ بعدازاں وہ استعفے پر جانے والے کا قصہ یوں سناتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

''ان کے ریٹائرمنٹ کے موقع پر باس نے نوٹس نکال دی کہ اگلے دن صبح گیارہ بجے مسٹر اسلم کو الوداعی چائے دی جائے گی سب لوگ شریک ہوں' چائے کے بعد باس نے کسی جادوگر کی طرح پہلے تو جیب سے ایک بڑا لفافہ نکالا، اسے کھول کر اس میں سے ایک چھوٹا پیکٹ نکالا' پھر پیکٹ کو کھول کر اس میں سے ایک خوبصورت سی ڈبیا نکالی اس ڈبیا کو کھول کر اس میں سے ایک گھڑی نکالی اور اسلم کو دیتے ہوئے بولے:

''مسٹر اسلم آپ کے وظیفہ یاب ہونے پر نایاب گھڑی ہم آپ کو تحفے میں دے رہے ہیں' واضح ہو کہ یہ گھڑی کام نہیں کرتی' سدا بند رہتی ہے' آپ نے بھی تو ساری عمر دفتر میں کام نہیں کیا۔''(۱۱۴)

منظور الامین کی تحریروں میں زبان و بیان کا استعمال بہت خوب ہے۔ مثلاً محاورے، ضرب الامثال، تلمیح وغیرہ۔ ان کے ہاں تلمیح کا خوبصورت اور دلچسپ انداز میں استعمال ہوتا ہے کہ قاری کبھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا بلکہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ ان کے ہاں دیکھئے صنعت تلمیح کا خوبصورت اقتباس:

''دیکھا جائے تو آج کے انسان کو اتنی راحتیں اور آسائشیں میسر ہیں کہ پچھلے ہزاروں لاکھوں سالوں میں بھی انسان کو کبھی نہیں ملی تھیں۔ آج کا علاؤالدین پرانے چراغ کو نہیں گھستا بلکہ ایک بٹن دباتا ہے جس کے دباتے ہی راحت کا جن حاضر ہو جاتا ہے۔ اسی لئے آج کے دور کو Bush- butt on civilization بھی کہتے ہیں ویسے آج کا دور میکانیکی تہذیب کا دور ہے جو اعلیٰ انسانی قدروں کی نفی کرتا ہے۔''(۱۱۵)

منظور الامین کے انشائیوں میں مزاح اور لطیفے بہت زیادہ ہیں جس کے باعث تحریر انشائی کشش سے پوری طرح معمور نظر نہیں آتی۔ اس کے علاوہ معلومات باکثرت پیش کرتے ہیں۔ قاری کو بہت کچھ بتلانا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے انشائیوں میں مضامین کے انداز کا شبہ ہوتا ہے۔ منظور الامین انشائیوں کا آغاز محاوروں یا کہاوتوں سے شروع کرتے ہیں۔ اور ان کی تحریروں میں قصے اور کہانیاں بہت پائی جاتی ہیں۔ بات سے بات پیدا کرنا، بے تکلفی اور بے ربطی کے ساتھ شگفتہ بیانی کا استعمال بہت خوب ہے۔ وہ خود انکشاف ذات میں خارجی پہلو کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں گہرائی اور گیرائی سے عاری ہے۔ ان کی تحریروں میں زبان و بیان کا استعمال بہت

خوب ملتا ہے۔ وہ تلمیح اور اشعار کا با کثرت استعمال کرتے ہیں۔ محاوروں اور ضرب الامثال کے علاوہ تحریف نگاری کا استعمال بھی بہت خوب ہے۔ وہ انگریزی اور فارسی زبان کا با کثرت استعمال اپنے قلم نوک سے قلم بند کرتے ہیں۔ ان کا شمار ابتدائی انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

۲۴.۴۔نریندر لوتھر

نریندر لوتھر کی پیدائش ۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء، میں ہوشیار پور پنجاب میں ہوئی۔نریندر لوتھر کا شمار ہند، پاک کے ممتاز اردو کے منفرد طنز و مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ ایک ادیب ، مزاح نگار اور مورخ رہے ہیں۔معاشیات اور پولیٹکل سائنس سے ایم۔اے کیا ہے۔انگلینڈ سے انڈسٹریل مینجمنٹ میں پی جی ڈپلومہ بھی کیا۔۱۹۵۵ء میں ان کا آی۔اے۔ایس کے لیے انتخاب ہوا اور مختلف اہم عہدوں پر فائز رہنے کے بعد بحیثیت چیف سکریٹری آندھرا پردیش وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

اردو میں ان کی چار کتابیں بندکواڑ، مزاج پرسی، الف تحاشہ، اور ہوائی کولمبس (سفرنامہ) شائع ہو چکے ہیں۔انگریزی میں ۱۱ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ادھر چند سال سے حیدرآباد کی تاریخ اور کلچر انگریزی میں مسلسل لکھتے رہے ہیں۔اردو کے علاوہ ۱۲ سے زائد کتابیں مختلف زبانوں میں مضامین، کہانیوں اور تاریخی موضوعات پر شائع ہوچکی ہیں۔دوردرشن کے لئے ڈاکیومنٹری بھی لکھی ہے۔زندہ دلان حیدرآباد کے ابتداء میں نائب صدر اور پھر برسوں صدر رہ چکے ہیں۔جہاں حیدرآباد کی ادبی سرگرمیوں میں نریندر لوتھر کا اہم رول رہا ہے وہیں حیدرآباد کی تاریخ پر ان کی تحریریں کافی مقبول بھی ہوئی ہیں۔بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں حیدرآباد پر تحریر کردہ ان کا ایک انشائیہ بعنوان ''حیدرآباد کا تغرافیہ'' بین الاقوامی سطح پر بے حد مقبول ہوا ہے۔اس کے علاوہ ۱۹۸۵ء میں ان کی تحریک اور رہنمائی میں عالمی جشن مزاح کی تقریب شاندار پیمانے پر منعقد ہوئی تھیں۔کوئی چار سال تک روزنامہ ''ہندو'' میں ان کا ہفتہ وار کالم چھپتا رہا۔مختلف انجمنوں سے ان کا تعلق رہا ہے۔ان کا انتقال ۲۰ جنوری ۲۰۲۱ء کو حیدرآباد میں ہوا۔

نریندر لوتھر کی بات کچھ اور ہے۔نریندر لوتھر کو انشائیوں میں نئے معنی پیدا کرنے میں قدرت حاصل ہے۔وہ اس انداز میں نئے معنی پیدا کرتے ہیں کہ قاری ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، قاری کے ذہنوں پر دیرپا اثر چھوڑتے ہیں۔ان کا پہلا انشائیہ ''حیدرآباد کا تغرافیہ'' ہے۔جیسا کہ اس کے نام سے ہی پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک نیا لفظ ہے جس میں دو الفاظ کو مرکب کر دیا گیا ہے اور اس کا مخفف بنا دیا گیا ہے۔وہ دو الفاظ تاریخ اور جغرافیہ ہیں۔نریندر لوتھر نے انشائیہ ''حیدرآباد کا تغرافیہ'' میں حیدرآباد کے متعلق تمام معلومات قلم بند کی ہے۔اس موضوع کی مناسبت سے حیدرآباد کے محل وقوع کے ساتھ خوبصورت انداز میں نقشہ کھینچا گیا ہے۔حیدرآباد نام کس طرح رکھا گیا، اس کو کس نے بسایا، حیدرآباد کہاں کہاں ہے؟، یہاں کی تاریخی عمارتیں، اور محلوں کے نام وغیرہ، مجموعی طور پر حیدرآباد کا مکمل نقشہ بہت دلچسپ اور شگفتہ انداز میں قلم بند کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''حیدرآباد اصل میں ایک مونث بستی تھی جو بعد میں مذکر شہر بن گیا۔ اس کا اصلی نام ''بھاگیہ نگر'' تھا۔ جب اس کی سیکس بدلی تو یہ ''حیدرآباد'' بن گیا_____ اس طرح جنس کے اس پیمانے پر تبدیلی کا یہ معجزہ پہلی بار یہیں ہوا۔ آج کل کے اوچھے سائنسدان اِسّے دُسّے کیس میں سیکس بدل کر اپنے آپ کو بڑے تیس مار خان سمجھتے ہیں۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ صدیوں پہلے ہندوستان میں ایک پورے شہر کی سیکس بدل دی گئی تھی۔ یہاں کے لوگوں کو اب بھی یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں دوبارہ پھر ویسی ہی تبدیلی نہ واقع ہو جائے۔ اس لئے وہ کسی قسم کے جنسی تذکرے سے احتراز کرتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی نوٹ کیا ہوگا کہ یہاں کے پرانے خاندانوں کی بیگمات اور امیر زادیاں ابھی تک اپنے آپ کو جنس مذکر مان کر بات کرتی ہیں، مثلاً'' میں وہاں گیا''۔۔۔''میں آپ کو دیکھاؤں گا''۔۔وغیرہ وغیرہ۔''(۱۱۶)

انشائیہ کے لئے طنز و مزاح لازمی جز نہیں ہے لیکن انشائیہ نگار اسے سہارے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ انشائیہ نگار طنز سے زیادہ مزاح کا سہارا لیتا ہے۔ کیوں کہ طنز کا تیر تیز اور تیکھا ہوتا ہے۔ اس لئے انشائیہ نگار قاری کو اپنے اعتماد میں لیتے ہوئے مزاح کے سہارے اپنی بات کو منواتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طنز کا بہت کم استعمال کرتا ہے تا کہ انشائیہ کی فضاء غیر سنجیدہ اور پر لطف رہے اور انشائیہ میں قاری کی دلچسپی برقرار رہے۔ اس کی مثال'' بڑا آدمی'' میں زیر لب مسکرا کے ملتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''بڑا آدمی ہونے کے کئی فائدے ہوتے ہیں، ان کے نام پر اسکول، کالج، ہسپتال، یتیم خانے، پارک وغیرہ قائم کئے جاتے ہیں۔ اگر کسی شہر یا ملک میں ایسے ادارے اتنی تعداد میں نہ ہوں تو سمجھ لیجئے کہ اس میں بڑے آدمی کم تعداد میں پیدا ہوئے ہیں، عوام کو ان کی ذات سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جس دن ان کی موت ہوتی ہے اس دن چھٹی ہو جاتی ہے۔ کئی بڑے آدمی جن کو عوام کی بھلائی کا خیال نہیں ہوتا، اتوار یا کسی چھٹی کے دن انتقال کر جاتے ہیں اس طرح ان کے ساتھ لوگوں کی چھٹی بھی مر جاتی ہے۔ جن بڑے لوگوں کو عوام کی فلاح و بہبود کا خیال ہوتا ہے وہ زیادہ تر شام کو دفتر اور اسکول بند ہونے کے بعد ہی اپنے جسم و جان کا رشتہ ختم کرتے ہیں تا کہ نہ صرف چھٹی دی جا سکے بلکہ وقت پر مناسب طریقہ سے اس کا اعلان بھی کیا جا سکے۔ طالب علموں کو عمر رسیدہ

بڑے لوگ زیادہ اچھے لگتے ہیں کیوں کہ ان کی جلد موت کا امکان ہوتا ہے۔''
(۱۱۷)

انشائیہ نگار جب کسی موضوع کے بارے میں اپنے ذاتی خیالات وجذبات اور واردات ومشاہدات کو خوبصورت الفاظ کے ذریعہ بیان کرتا ہیں۔تو نئی باتیں سامنے آتی ہیں۔اس لئے اس انشائیہ کو''پرسنل ایسّے'' کہا گیا ہے۔انشائیہ میں انکشاف ذات کی اہمیت نریندر لوتھر کی تحریروں میں بھی پائی گئی ہے۔ذیل میں اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''سائنس کے علاوہ ہم حساب میں بھی بہت کمزور تھے۔لیکن اس میں فیل ہونے سے بچ گئے۔ ماسٹر نے کہا کہ جتنے سوال غلط ہونگے اتنے ہی بید پڑینگے۔امتحان کے بعد سوالوں کے جواب بلیک بورڈ پر لکھ دئے گئے اور ہر ایک طالب علم سے کہا گیا کہ وہ بتائے کہ اس کے کتنے سوال غلط ہیں۔ہمارے بہت سے ہم جماعتوں کو کافی مار پڑی۔ جب ہماری باری آئی تو ہم نے کہا کہ ہمارا ایک سوال غلط ہے۔اس طرح ہمیں سب سے کم بید پڑے۔''(۱۱۸)

نریندر لوتھر کے ایک اور انشائیہ جس کا موضوع ''کوڈاں'' ہے۔لفظ''کوڈاں'' کوڈ کی جمع ہے۔اس انشائیہ میں وہ تمام محکموں اور عام زندگی کے مختلف کوڈوں سے بہت دلچسپ انداز میں واقف کروارہے ہیں۔جس سرکاری محکمہ، غیر سرکاری محکمے، خاندگی ادارے، فلمیں، ریڈیو، جلسے دیگر محفلیں اور لطیفے کے بھی''کوڈ'' کو بھی قلمبند کرتے ہیں۔ان کا یہ انشائیہ موضوع کی مناسبت سے طویل ہے۔اس میں کوڈ کی مفصل تفصیل شگفتگی سے پیش کی گئی ہے،ملاحظہ فرمائیں:

''کوڈاں''انگریزی لفظ''کوڈ'' کی دکنی اسٹائل پر جمع ہے۔جمع کی ضرورت اس لئے پڑی کہ اس وقت بے شمار کوڈ رائج ہیں۔ویسے تو زبان بجائے خود ایک کوڈ ہے۔پھر ہر زبان کے اپنے کوڈ ہوتے ہیں جو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو کوڈ کے گر جانتے ہیں۔شارٹ ہینڈ بھی کوڈ ہے۔جس کے ذریعہ سے لمبی چوڑی اور سیدھی سادی تحریر چند منحنی لکیروں میں سما جاتی ہے۔

خفیہ پولیس والوں کا اپنا کوڈ ہوتا ہے۔مثلاً انھیں اگر یہ پیغام بھیجنا ہو کہ فلاں شہر میں فساد ہونے کا خطرہ ہے تو وہ کوڈ میں تار بھیج دیں گے کہ جیا بہادری کے لڑکی پیدا ہونے والی ہے۔خبردار ہو جاؤ۔''(۱۱۹)

نریندر لوتھر بہت جلد اپنے قاری سے بے تکلف ہو جاتے ہیں۔جیسے کسی بے تکلف دوست سے محو گفتگو

ہوں۔ وہ بے تکلفی سے قاری کے سامنے اپنے مشاہدات اور تجربات کو بیان کرتے جاتے ہیں۔ان کا بے تکلفانہ انداز بیاں ملاحظہ ہو۔

''مثلاً آپ جب بھی کسی دوست سے ملتے ہیں ہمیشہ یہی سوال پوچھتے ہیں
''کہو بھائی، کیا حال ہے؟''اس کا جواب ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ ٹھیک ٹھاک ہے۔
پھر وہ آپ سے وہی سوال پوچھتا ہے اور پھر آپ وہی جواب دیتے ہیں۔ پھر
چونکہ اور کوئی بات کہنی نہیں ہوتی اس لئے تھوڑی دیر کے بعد آپ ذرا اوب کر
پوچھتے ہیں۔
''اچھا اور کیا حال ہے''
اس کا جواب ہوتا ہے''اچھا اور بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔''(۱۲۰)

انشائیہ ذہن کی ایک آزاد ترنگ ہے۔انشائیہ نگار کو آزادی ہوتی ہے اس وجہ سے وہ اپنے خیالات کی پیش کشی کے وقت اس کا ذہن آزاد ہوتا ہے۔ جب ہم نریندر لوتھر کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی تحریروں میں یہ خصوصیت بڑی عمدہ ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

''کتوں کے ساتھ سیر کرنے والوں کو دیکھ کر یہ پتہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ
مالک کون ہے اور کس کو سیر کروا رہا ہے، کتا، مالک کو جگہ جگہ روکتا ہے تیز تیز
آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے یا سست رفتاری سے پیچھے رہ جاتا ہے کبھی وہ یکدم
رک جاتا ہے۔گھاس کے پتے کو یا کسی کھمبے کو سونگھنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر وہ
ایسے اطمینان سے وہاں رک جاتا ہے گویا منزل مقصود مل گئی۔اس وقت کتے کا
مالک اپنی خفت چھپا کر ایسی بے نیازی سے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیتا
ہے کہ اس بدتمیز جانور سے ہمارا کوئی تعلق ہی نہیں۔ ہم نے کئی بار ایسے اٹکے
ہوئے صاحبوں کو اوورٹیک کیا ہے۔
لیکن سیر پر کتے کو ساتھ رکھنے میں ایک خاص شان ہوتی ہے۔اس سے
صاحبی کو توثیق ہوتی ہے۔''(۱۲۱)

نریندر لوتھر کا اسلوب عمدہ ہے۔تازگی اور ظرافت کے ساتھ ساتھ تاریخ سائنس اور معاشرت کا مطالعہ و مشاہدہ ان کی ایسی خوبی ہے جس سے ان کا اسلوب توانا اور جاندار ہو گیا۔ان کے انشائیوں میں جذبہ و خیال کی متوازن آمیزش ملتی ہے۔ وہ معاشرت، ثقافت اور تاریخ کو ایک احساس میں پیش کرتے ہیں۔ یوں تو ان کی تمام تحریروں میں ان کے پیشے کا عکس پایا جاتا ہے۔جس سے ان کے انشائیے کئی طرح کے مطالعوں کا نتیجہ معلوم ہوتے

ہیں۔ انسانی نفسیات کا مطالعہ، سماج کا مطالعہ، تاریخ کا مطالعہ، جغرافیہ کا مطالعہ، سیاست کا مطالعہ، سائنس کا مطالعہ، اور رسم ورواج اور روایات کا گہرا شعور اور تجربات اور مشاہدات ان کی تحریروں میں شامل ہیں۔ ان کے انشائیوں میں شخصی انکشاف بہت عمدہ انداز میں پایا جاتا ہے۔ انشائیہ کی خاص خوبی بے تکلفی اور بے ربطگی عمدہ ہے اور جگہ جگہ زود ہضم کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ طنز ومزاح کی چاشنی بھی ہے جس سے قاری کو بوریت محسوس نہیں ہوتی۔ زیر لب مسکراہٹ کی پیش کش بہت خوب ہے۔ اس کے علاوہ روزمرہ کے الفاظ کا استعمال بہترین ہے۔ انگریزی زبان کا بھی وقت ضرورت استعمال بھی ہے۔

۲۵.۴۔ یوسف امتیاز

مرزا یوسف بیگ عرف یوسف امتیاز حیدرآباد دکن ۱۹۳۸ء میں نمولی اڈہ کاچیگوڑہ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد مرزا حسین بیگ کے سایہ عاطفت میں تربیت پائی۔ یوسف امتیاز اپنا شجرہ نصب تفصیل سے یوں بیان کرتے ہیں۔

''تم لوگ مجھے کیا سمجھتے ہو۔ اردو شعر و ادب مجھے ورثہ میں ملا ہے۔ ہمارا خاندان شاہ عالم ثانی (۱۷۶۰ء۔۱۷۰۶ء) کے دور میں ہندوستان آیا۔ ہم لوگ سلجوقی اور برلاسی ہے۔ ہمارے جدامجد سعادت یار خان رنگین اردو میں ریختی کے پہلے استاد رہے ہیں۔ ہمارے نانا خواجہ بدرالدین خواجہ امان ''بدستان'' کے پہلے اردو مترجم تھے۔ غالب نے اس کتاب کا پیشِ لفظ لکھا تھا۔ اور اپنے خطوط میں جابجا ان کا ذکر کیا ہے۔ مرزا غالب اور خواجہ امان چونکہ ہم جدامجد ہیں۔ اس اعتبار سے ہمارا شجرہ نسب راست طور پر مرزا غالب سے بھی جا ملتا ہے۔ حکیم مومن خان مومن ہمارے خاندانی رشتہ دار اور قربت دار تھے۔ ہمارے والد کے چچا آغا مرزا سرور بیگ (سرورالملک) چھٹے نظام میر محبوب علی خان کے استاد تھے۔ فرحت اللہ بیگ اور عصمت اللہ بیگ تو میرے چچا ہیں۔ خود میرے والد مرزا حسن احمد بیگ حیدرآباد ہائی کورٹ کے جج ہونے کے علاوہ اردو کی کئی کتابوں کے مصنف رہے ہیں۔''(۱۲۲)

یوسف امتیاز نظام کالج سے بی۔ اے کیا۔ گریجویشن کے فوری بعد مجتبیٰ حسین نے محبوب حسین جگر سے ملاقات کروائی بعد اس کے جگر صاحب نے روزنامہ سیاست میں ہفتہ واری اسپورٹس راونڈ اپ کی ذمہ داری سونپی مختلف نوعیت کے مضامین بھی ان سے لکھوائے۔ ذوق ادب کے بارے میں یوسف امتیاز لکھتے ہیں کہ:

''ادب سے لگاؤ اور ذوق غالباً گھر کے ماحول اور میرے والد محترم مرزا حسین احمد بیگ سابق جج حیدرآباد دکن ہائی کورٹ کی لکھی ہوئی کتابوں سے ملا۔ یا پھر اپنے چچا مرزا فرحت اللہ بیگ کی ماہانہ اردو مجلس کی نشستوں سے حاصل ہوا۔ چادرگھاٹ ہائی اسکول کی میگزین کی ادارت مضمون نگاری کا جینے سے ملی۔ نظام کالج میں ادب میں کہانیاں لکھیں۔''(۱۲۳)

یوسف امتیاز کی شخصیت کے بارے میں مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں کہ:

''یوسف امتیاز بے حد سرخ و سپید تو تھا ہی (بلکہ اب بھی ہے) اپنی باتوں میں ہمیشہ لال مرچوں کی ملاوٹ کر کے اپنی بات کو تلخ اور ترش بنا دیتا تھا۔ اس کی رنگت، چست فقرہ بازی اور زبان سے ڈنگ مارنے کی عادت کی وجہ سے دوست اسے، گورا بچھو کہا کرتے تھے۔''(۱۲۴)

یوسف امتیاز کا انشائیہ ''پھر چھڑی بات جوتو کی'' بہت اچھا انشائیہ ہے۔ اس انشائیہ میں مصنف نے جوتوں کی قیمتیں بتلاتے ہوئے ان تمام باتوں کی طرف توجہ مرکوز کی کہ غصہ نکالنے کے لئے لوگ جوتوں کا ہار پہنایا کرتے ہیں تو چند ایسے لوگ بھی ہیں جو جوتوں سے الماریوں کو سجانے اور سنوارنے کے لئے استعمال کیا کرتے ہیں۔ جوتے سے محبت اور نفرت کے اظہار کے مختلف پہلو پیش کرتے ہیں اس کا انشائی انداز ملاحظہ فرمائیں:

''جوتے بھی عجیب شئے ہیں کہ کسی کو جوتے تو دور کی بات ہے۔ پھٹی پرانی چپل بھی نصیب نہیں ہوتی۔ فلپائین کے سابق صدر ماکولس کی بیوی امیلدا کو قدرت نے جوتے اور سینڈلوں وغیرہ سے اتنا مالا مال کیا کہ یہ ان کے گھر میں دکان کی طرح سجے تھے۔ جب پتہ کٹ گیا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے کی نوبت آئی تو پاؤں میں جوتے ضرور تھے مگر تقریباً چار ہزار جوتوں کی جوڑیاں پیچھے رہ گئیں جو انقلاب کے بعد ملک کے میوزیم کا ایک حصہ بن گئے اور ساری قوم کی ہائے ہائے کا نشانہ بنے۔ کنیڈا کے سابق وزیر اعظم برائن بلمونی کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ ان کے ''گوچی شوز'' کسٹم میڈ ہوتے۔ جب تک برسر اقتدار رہے لوگ گوچی شوز صاف کرنے، پالش کرنے اور یہاں تک کہ چاٹنے تیار رہتے تھے پھر حالات نے پلٹا کھایا تو یہی جوتے مزاق اور طنز کا موضوع ہو گئے۔ جوتوں کے اوصاف میں یہ بھی ہے کہ اچھا جوتا وہی ہے جو نہ پاؤں کاٹے اور نہ چلتے وقت آواز دے۔ شاعروں کا محبوب غالباً ننگے پاؤں ہوتا ہوگا جس کے قدموں کی چاپ اور آہٹ شاعر کے دل کی دھڑکن تیز کر دیتی ہے یا پھر عام بازاری سستے جوتے محبوب کی آمد کی چغلی کھاتے ہوں گے ------ مگر کیا کیا جائے کہ یہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا ہے کہ کب جوتا کاٹنے والا ہے۔''
(۱۲۵)

انشائیہ نگار اپنے خیالات کے بیان میں ترتیب و تنظیم کا خیال رکھتا اور بار بار اپنے موضوع سے بھٹکتا رہتا ہے۔ اس طرح انشائیہ میں بے ربطگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی بے ربطگی انشائیہ کی خصوصیت بن جاتی ہے۔

یوسف امتیاز کی تحریروں میں بے ربطگی کی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔''نائی سے ہیر ڈریسر تک''اس انشائیہ میں مصنف حجاموں اور نائیوں کا ذکر کرتے ہوئے امریکہ کے سابق صدر کا ذکر کرنے لگتے ہیں جو انشائیہ کی اہم خصوصیت ہے۔اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''حجاموں، نائیوں اور موجودہ ہیر ڈریسرز کی یہ قوم آج بھی بے تاج بادشاہ کی طرح دنیا کے ہر مسئلہ پر اپنی ماہرانہ رائے، امور حکومت میں مشورے، کانا پھوسی، سازش، لوکل گاسپ LOCAL GOSSIP میں اب بھی مصروف ہے۔ جب استرے کی چمکتی دھار کسی کی شہ رگ سے قریب ہو اور موت نظروں کے آگے رقص کرتی نظر آئے تب استرا تھامے ہاتھوں سے اختلاف کون کر سکتا ہے چاہے بال کاٹنا ہو یا بالوں کو رنگ کروانا یہ سب ہیر ڈریسر کے رہین منت ہیں۔امریکہ کے سابق صدر ریگن ہزاروں بار انکار کرتے ہی رہیں مگر یہ بات اپنی جگہ سچ ہے کہ وہ اپنی صدارت کے آخری دنوں تک وائٹ ہاؤز کی پرائیوٹ فضا میں اپنے بال رنگواتے ہی رہے۔ ہیر ڈریسر تو ارباب مقتدر کے ناک کا چڑھا ہمیشہ بال رہا جس کو نکالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہیر ڈریسر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اہل غرض کو ہزار پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ جوتیاں سیدھی کرنی ہوں گی اور کام صرف ایک مخصوص شخص کا مخصوص استرا ہی نکال سکتا ہے۔'' (۱۲۶)

یوسف امتیاز کی تحریروں میں خیال آرائی کا حسین امتیز اج بھی ہے۔اور شگفتگی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے جو قاری کی دلچسپی کے باعث بنتا ہے اسی مناسبت سے گفتگو کا اسلوب انشائی ادب حاصل کرتا ہے۔ان کی تحریروں میں مزاح کی چاشنی بہت خوب ہے۔ان کا ایک انشائیہ ''گوری رنگت بھی کیا بری شئے ہے'' بھی ہے۔اس انشائیہ میں گوری اور کالی رنگت کے مختلف پہلوؤں کو بہت خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یوسف امتیاز کی سوچ اہمیت کی حامل ہے۔ان کے ہاں معلومات کا خزانہ محفوظ ہے۔ وہ تاریخی اور مذہبی معلومات کو باتوں ہے باتوں میں قاری تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ خوبصورت انداز ملاحظہ ہو:

''مذہبی دیومالائی کہانیاں ہر جگہ صرف گوراپن ہی نمایاں نظر آتا ہے۔ آرٹسٹوں نے صحیح یا غلط حضرت عیسی کو گورا بنا کر پیش کر دیا یہ اور بات ہے کہ آج کل سیاہ فام اور گورے دونوں اس بحث میں الجھے ہوئے ہیں کہ حضرت عیسی کا رنگ واقعی کیسا تھا۔ان کا پیغام تو ہو گیا درگزر، ہندوستان کی دیومالاؤں میں اس

کا ذکر ہے کہ نند لالہ یشومتی میا سے یہ شکایت کرتے ہیں کہ رادھا گوری کیوں ہے اور میں کیوں کالا۔ کالی کلکتہ والی کا جادو اور کالی کی پوجا سر آنکھوں پر، سیاہ خضاب بالوں کے لئے قبول۔ ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ، منہ کالا کرنا، کالی بلی کا راستہ کاٹنا سماج کے لئے ہرگز گوارخاطر نہیں۔ اسی رنگ کے جھگڑے نے تو ہر انسان کو ایک کامپلکس complex میں مبتلا کر دیا ہے اور لوگ اسی غم میں گھلے جا رہے ہیں کہ وہ کالے کیوں ہوئے گورے کیوں نہ ہوئے۔ اب جو گورے ہیں ان کو نظر لگنے کا خوف اس قدر ستانے لگتا ہے کہ وہ اپنی صورت پر سیاہ تل کا نشان لگا لیتے ہیں، ہاتھوں میں کالے ڈورے باندھ لیتے ہیں۔ ہر روز نظر اتارنے کے سامان کیے جا رہے ہیں۔''(۱۲۷)

یوسف امتیاز کا ایک انشائیہ ''سگریٹ نوشی منع ہے'' ہے۔ اس میں مصنف سگریٹ پینے کے نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں سگریٹ پی کر کس کس طرح دھواں اڑاتے ہیں۔ سگریٹ والے بے انتہا قوت ارادی والے ہوتے ہیں ہر کوئی ان کو منع کرنے کے بعد، ہر کوئی ان سے منہ موڑنے کے بعد بھی یہ سگریٹ پینا نہیں چھوڑتے۔ اس تحریر کے ذریعہ وہ اپنے قاری کو بے تکلف انداز میں نئے زاویوں سے روشناس کرواتے ہیں۔ اور یوسف امتیاز تحریروں میں انشائیہ کی شعریات کو شعوری طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں محاورات اور ضرب الامثال کی بہتات ہے۔ تلمیحات کا بھی استعمال بہت زیادہ ہے۔ یوسف امتیاز نے تخلیقی فن کا کس طرح خوبصورت استعمال کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''سگریٹ پینے والوں کے لئے گھروں کے دروازے بن ہو گئے ہیں۔ یہاں کے مقامات پر تمبا کو نوشی کرنے کے نام پر صلیب پر چڑھایا جا رہا ہے۔ خواہ مخواہ لوگ لباس سے آنے والی سگریٹ کی بو سے خوفزدہ ہیں۔ شہر کے ہسپتالوں، شاپنگ سنٹررز، دفاتر، عمارات کے بعد یہ سازشیں کی جا رہی ہے کہ ان کو پارکنگ لاٹس سے بھی باز رکھا جائے جو عادی تمبا کو نوش ہیں وہ اور زیادہ بضد ہے تنگ آمد جنگ آمد۔ کالی صدیوں کے سر سے رات کا آنچل کب ڈھلکے گا۔ کیا دکھ کے بادل چھٹیں گے کیا سکھ کا ساگر چھلکے گا کیا امبر جھوم کے گائے گا کیا دھرتی نغمے گائے گی۔ اس کا جواب صرف وقت کے پاس ہے۔ تب تک امرت کی دھن میں سگریٹوں کے کش جاری رہیں گے۔

ساحر نے یقین دلایا تھا----وہ صبح کبھی تو آئیں گی۔ تب تک:

سگریٹ پیئے جا۔سگار پیئے جا : ایک دب تیرا بھی زمانہ آئے گا''(۱۲۸)

انشائیہ کی ایک اہم خصوصیت داخلیت یا شخصیت کا اظہار بھی ہے۔انشائیہ میں شخصی ردعمل کو لازمی جز تسلیم کیا جاتا ہے۔انشائیہ ایک ایسا فن ہے جس میں انشائیہ نگار کی شخصیت کی عکاسی ہوتی ہے۔انشائیہ نگار جب بھی قلم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے ذاتی خیالات، جزبات ومشاہدات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتا ہے۔لیکن یوسف امتیاز کے انشائیے شخصیت کے اظہار سے عاری ہیں۔ان کی تحریروں میں خارجیت کے پہلونمایاں ہیں۔

''سیاست سے بے پناہ دلچسپی اوراس پر بے لاگ تبصرے ہماری زندگی کا حصہ پرانے ملک میں بھی تھے اورنئی دنیا میں بھی ہے۔جس دنیا میں اب رہ رہے ہیں جواپنا اوراپنے بچوں کا وطن ہے اس سے اس قدر دور دور رہتے ہیں جیسے کوئی بھوت پریت ہومگر پرانے دیس کی بے کار غیر مفید سیاست سے اس قدر لگاؤ کہ ہرایک نے گلی گلی کوچہ کوچہ اپنی ایک علیحدہ انجمن بنارکھی ہےاوراپنے چمچوں حواریوں کی مدد سے خوداس کے لیڈر بن گئے۔بعض نے تو خود ہی اپنی صدارت کا اعلان کردیا ہے۔نعرے لگانا،خواہ مخواہ خون کا دباؤ بڑھانا،آواز بلند کرنا،ایک دوسرے کی غیبت اورگریبان پکڑلینا ایجنڈے میں شامل ہے۔ہر ایک کولیڈری کا شوق ہے۔''(۱۲۹)

یوسف امتیاز کی تحریریں سادہ اورسلیس ہے۔ان کی تحریروں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تحریروں میں خارجیت کے پہلونمایاں نظرآتے ہیں۔ان کا اسلوب بیانیہ ہے۔کہیں کہیں ان کی تحریر بوجھل اورکہیں کہیں افسردہ اورکہیں بوجھل نظرآتا ہے۔اصل میں تخلیق احساسات اورمعلومات کی ملی جلی صورت ہے۔جہاں معلومات سامنے آکرا کہرے پن کا سماں پیش کررہی ہوتی ہے۔ان کے انشائیوں میں گہرائی وگیرائی ختم ہوجاتی ہے۔یوسف امتیاز کے ہاں بھی مذہبی،تاریخی معلومات کی بھرمار ہے۔انشائیہ نگاری کی چندایک خصوصیت جیسے بے تکلفی، بے ربطگی، شگفتگی ان کی تحریروں میں شامل ہے۔ان کی تحریروں میں زبان وبیان کی بھی خوبیاں موجود ہیں۔ مثلاً تشبیہات،محاورات،ضرب الامثال،کہاوتیں،تلمیحات،پیروڈی بہت عمدہ ہے۔اس کے علاوہ انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کرتے ہیں۔

انشائیہ اردوادب میں ایسی صنف کہلانے کی حقدار ہے جس نے ادب کے مختلف گوشوں یعنی تاریخی، سیاسی،سماجی،جغرافیائی،سائنسی اوراخلاقی وغیرہ کا احاطہ کیا ہے۔اورمختلف گوشوں میں سینکڑوں انشائیہ نگاروں نے

اپنے انشائیہ تحریر کئے ہیں۔آندھرا پردیش اور تلنگانہ ریاست کے جن انشائیہ نگاروں نے انشائیہ تحریر کئے ہیں وہ یہ ہیں: ابونبیل خواجہ مسیح الدین، ایم باگاریڈی، احمد سلطان، انیس سلطانہ، انیس صدیقی، ایم اے نعیم، بشیر بانو، جہاں بانو نقوی، دلشاد رضوی، رشید الدین، ضامن علی حسرت، نعیم زبیری، شیخ سلیم، نعیم جاوید، ڈاکٹر مرزا کلیم اللہ بیگ، محمد باقر، سید نصرت، فضل جاوید اور محمد طارق غازی پروفیسر مظفر شہ مری وغیرہ نے بھی انشائیہ کی آبیاری کی ہیں۔

موجودہ دور میں تلنگانہ اور آندھرا پردیش ریاست میں جو انشائیہ نگار، انشائیہ کی تحریر میں گراں قدر اضافہ کررہے ہیں وہ یہ ہیں: علیم خان فلکی (قحط الرجال)، ڈاکٹر حمیرا سعید (ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں)، سعدیہ مشتاق (ہر خواہش پہ دم نکلے)، سید امتیاز الدین (ہیرا کبھی پتھر ہے کبھی ہے انمول)، حمید عادل (جس چھینک سے آتی ہے پرواز میں کوتاہی)، محمد عمران عاضمی (حلیم۔۔۔آنکھوں دیکھا حال)، سلطان سبحانی (درون خانہ فلسنگ)، رفیعہ نوشین (آٹو کی سواری جو ہوئی نہ پوری) وغیرہ۔

حواشی

(۱) برقی بریک ڈاؤن، ایم اے حنان، شگوفہ ستمبر ۱۹۷۴ء، صفحہ۔ ۳۶

(۲) چشمک آشوب چشم، ایم۔اے حنان، شگوفہ مارچ ۱۹۹۷ء، صفحہ۔ ۴۴، ۴۵

(۳) برقی بریک ڈاؤن، ایم اے حنان، شگوفہ ستمبر ۱۹۷۴ء، صفحہ۔ ۳۶

(۴) مکان ہی ملا نہ قطعہ ءزمین، ایم اے حنان، شگوفہ سالنامہ ۱۹۹۶ء، صفحہ۔ ۹۷

(۵) مانگنا، برق آشیانوی، شگوفہ ستمبر ۱۹۹۷ء، صفحہ۔ ۹۳

(۶) اعضائے رئیسہ اور سر، برق آشیانوی، شگوفہ ڈسمبر ۱۹۷۷ء، صفحہ۔ ۱۳

(۷) قاضی صاحب، برق آشیانوی، شگوفہ اگست ۱۹۷۷ء، صفحہ۔ ۱۷

(۸) ہم نے فلیٹ خریدا، ڈاکٹر حبیب ضیاء، شگوفہ سلور جوبلی نمبر، صفحہ۔ ۵۰ (حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین۔ صفحہ۔ ۹۸، ۹۹)

(۹) بچہ باہر گیا، ڈاکٹر حبیب ضیاء، شگوفہ ستمبر ۱۹۹۷ء، صفحہ۔ ۱۰۴، ۱۰۵

(۱۰) ڈینگ بازی، ڈاکٹر حبیب ضیاء، شگوفہ سالنامہ ۱۹۹۶ء، صفحہ۔ ۵۲

(۱۱) بڑا ڈاکٹر، ڈاکٹر حبیب ضیاء، شگوفہ اپریل ۲۰۰۰ء، صفحہ۔ ۴۲ (شگوفہ مارچ ۱۹۷۸ء، صفحہ۔ ۷)

(۱۲) ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، شگوفہ اپریل ۲۰۰۰ء، صفحہ۔ ۳۹

(۱۳) حیدرآباد کی صاحب طرز خاتون مزاح نگار ڈاکٹر حبیب ضیاء، ماہنامہ آندھرا پردیش، حیدرآباد، جون ۲۰۰۲ء، صفحہ۔ ۲۹

(۱۴) پروفیسر حبیب ضیاء۔ ایک تاثر، نسیمہ تراب الحسن، شگوفہ اکتوبر ۲۰۰۵ء، صفحہ۔ ۵۳

(۱۵) ڈاکٹر قمر رئیس، سمن زار، خواجہ عبدالغفور، سرورق

(۱۶) بمبئی کی بارش، خواجہ عبدالغفور، شگوفہ ستمبر ۱۹۹۷ء، صفحہ۔ ۱۱۵

(۱۷) ہم کہیں اور سنا کرے کوئی، خواجہ عبدالغفور، سالنامہ شگوفہ حیدرآباد جنوری ۱۹۷۵ء، صفحہ۔ ۳۷

(۱۸) زندگی یوں ہی بسر ہوتی، خواجہ عبدالغفور، شگوفہ حیدرآباد اکتوبر ۱۹۷۴ء، صفحہ۔ ۸

(۱۹) دیوان خانہ، خواجہ عبدالغفور، شگوفہ اپریل ۱۹۷۸ء، صفحہ۔ ۱۲

(۲۰) گھوڑا جوڑا، رشید قریشی، شگوفہ ڈسمبر ۱۹۹۲ء، صفحہ۔ ۷، ۸

(۲۱) آنا دلہن کا دیر سے، رشید قریشی، شگوفہ ڈسمبر ۱۹۹۲ء، صفحہ۔۱۱

(۲۲) آئینہ بڑھاپا اور کبری بیگم، رشید قریشی، شگوفہ ڈسمبر ۱۹۹۲ء، صفحہ۔۱۸

(۲۳) میری مرغیاں، زینت ساجدہ، حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین، صفحہ۔۳۹

(۲۴) چار مینار پر غلاف، زینت ساجدہ، روزنامہ سیاست ۲۹/جون ۲۰۰۳ء، صفحہ۔۷

(۲۵) میری مرغیاں، زینت ساجدہ، حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین، صفحہ۔۴۰، ۴۱

(۲۶) چار مینار پر غلاف، زینت ساجدہ، روزنامہ سیاست، ۲۹/جون/۲۰۰۳ء، صفحہ۔۷

(۲۷) زینت ساجدہ، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، اعتماد ۱۵/ڈسمبر ۲۰۰۸ء، صفحہ۔۸

(۲۸) زینت ساجدہ، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، اعتماد، ۱۵ ڈسمبر ۲۰۰۸ء، صفحہ۔۸

(۲۹) احتجاج، سلیم مقصود، ماہنامہ شگوفہ ستمبر ۱۹۹۴ء، صفحہ۔۱۵

(۳۰) شادی خانہ آبادی، سلیم مقصود، شگوفہ نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ۔۱۴، ۱۵

(۳۱) عاشقی برائے شاعری، سلیم مقصود، شگوفہ ۱۹۹۶ء، صفحہ۔۲۹

(۳۲) آ بیل مجھے مار، سلیم مقصود، شگوفہ مارچ ۱۹۹۶ء، صفحہ۔۲۹

(۳۳) شادی خانہ آبادی، سلیم مقصود، شگوفہ ۱۹۷۶ء، صفحہ۔۱۴

(۳۴) مردہ بدست زندہ، سید رحیم الدین توفیق، شگوفہ سالنامہ ۱۹۹۶ء، صفحہ۔۸۳

(۳۵) بڑے موذی کو مارا۔ سید رحیم الدین توفیق، شگوفہ، جولائی ۱۹۹۳ء، صفحہ۔۲۴

(۳۶) دکھتی رگیں، سید رحیم الدین توفیق، شگوفہ مئی ۱۹۹۶ء صفحہ۔۲۷

(۳۷) وظیفہ حسن خدمت، سید رحیم الدین توفیق، شگوفہ نومبر ۱۹۹۷ء، صفحہ۔۴۳

(۳۸) مردہ بدست زندہ، سید رحیم الدین توفیق، شگوفہ سالنامہ ۱۹۹۶ء، صفحہ۔۸۴

(۳۹) عورت تیرا نام کامیابی ہے، سید رحیم الدین توفیق، شگوفہ جون ۱۹۹۱ء، صفحہ۔۳۲

(۴۰) آخر یہ بڑھاپا آتا کیوں ہے، ڈاکٹر سید عباس متقی، شگوفہ سوونیر نومبر ۱۹۹۳ء، صفحہ۔۶۲

(۴۱) بستر، ڈاکٹر سید عباس متقی، شگوفہ سالنامہ ۱۹۹۶ء، صفحہ۔۶۴

(۴۲) ایک ہنگامہ پہ موقف الیکشن، ڈاکٹر سید عباس متقی، شگوفہ فروری ۱۹۹۰ء، صفحہ۔۳۵

(۴۳) مراشہر چوراں، ڈاکٹر سید عباس متقی، شگوفہ اپریل ۱۹۹۱ء، صفحہ۔۳۳

(۴۴) بستر، ڈاکٹر سید عباس متقی، شگوفہ سالنامہ ۱۹۹۶ء، صفحہ۔۶۳

(۴۵) لو یہ سال بھی گیا، ڈاکٹر سید عباس متقی، شگوفہ سالنامہ ۱۹۹۷ء، صفحہ۔۶۶

(۴۶) یہ درد اگر نہ ہوتا، پروفیسر شمیم علیم، شگوفہ مارچ ۲۰۰۷ء، صفحہ۔۱۳،۱۴

(۴۷) جستجو امریکہ میں ایک کمرہ کی، پروفیسر شمیم علیم، شگوفہ مارچ ۲۰۰۷ء، صفحہ۔۱۷

(۴۸) سوندھی مٹی کا عطر، پروفیسر شمیم علیم، سوندھی مٹی کا عطر، صفحہ۔۵۷

(۴۹) ستاروں سے آگے، شمیم علیم، شگوفہ۔صفحہ۔۱۷۱

(۵۰) اور بھی ہے داستانیں بندروں کی، پروفیسر شمیم علیم، شگوفہ ڈسمبر ۲۰۰۶ء، صفحہ۔۳۶، ۳۷

(۵۱) بش کے پیٹ میں درد، ڈاکٹر عابد معز، پھر چھڑی بات، صفحہ۔۵۳

(۵۲) تیل کی سنچری، ڈاکٹر عابد معز، پھر چھڑی بات، صفحہ۔۲۰۹،۲۱۰

(۵۳) مراشہر، ڈاکٹر عابد معز، شگوفہ مارچ ۱۹۹۱ء، صفحہ۔۳۷

(۵۴) ہم نے گواہی دی، ڈاکٹر عابد معز، شگوفہ اگست ۱۹۹۱ء، صفحہ۔۱۶

(۵۵) ساڑی، عاتق شاہ خان، شگوفہ جنوری ۱۹۷۵ء، صفحہ۔۵۱

(۵۶) جھاڑو، عاتق شاہ، شگوفہ، سالنامہ ۱۹۹۵ء، صفحہ۔۶۶

(۵۷) قینچی، عاتق شاہ، شگوفہ سالنامہ ۱۹۹۱ء، صفحہ۔۵۳

(۵۸) پیاز کا اغوا، عاتق شاہ خان، شگوفہ سلور جوبلی نمبر، صفحہ۔۴۷

(۵۹) مٹکے، ڈاکٹر عبدالستار ساحرؔ، ماہنامہ آندھرا پردیش، نومبر ۱۹۹۹ء، صفحہ۔۳۴

(۶۰) بڑھاپا، ڈاکٹر عبدالستار ساحرؔ، ماہنامہ آندھرا پردیش، جنوری ۲۰۰۱ء، صفحہ۔۳۲

(۶۱) مٹکے، ڈاکٹر عبدالستار ساحرؔ، ماہنامہ آندھرا پردیش نومبر ۱۹۹۹ء، صفحہ۔۳۴، ۳۵

(۶۲) ڈی، ڈاکٹر عبدالستار ساحرؔ، ماہنانہ شاعر اکٹوبر ۲۰۰۵ء، صفحہ۔۵۱

(۶۳) زمین، ڈاکٹر عبدالستار ساحرؔ، ماہنامہ شاعر، ڈسمبر ۲۰۰۱ء، صفحہ۔۴۵

(۶۴) ویلکم پلیگ، پروفیسر سید فضل اللہ مکرم، شگوفہ مارچ ۱۹۹۵ء، صفحہ۔۴۸

(۶۵) چشم یاہو، ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم، شگوفہ نومبر ۱۹۹۶ء، صفحہ۔۳۱

(۶۶) ویلکم پلیگ، ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم، شگوفہ مارچ ۱۹۹۵ء، صفحہ۔۴۷

(۶۷) چشم یاہو، ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم، شگوفہ نومبر ۱۹۹۶ء، صفحہ۔۳۳

(۶۸) ویلکم پلیگ، ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم، شگوفہ مارچ ۱۹۹۵ء، صفحہ۔۴۷

(۶۹) اور جوتا چل گیا، فاطمہ تاج، من مانی، صفحہ۔۴۳

(۷۰) چندہ، فاطمہ تاج، من مانی، صفحہ۔۱۰۲،۱۰۳

(۷۱) اور جوتا چل گیا، فاطمہ تاج، من مانی، صفحہ۔۴۳

(۷۲) ردی نامہ، فیروز حیدر، شگوفہ ۱۹۹۶ء، صفحہ۔۳۰، ۳۱

(۷۳) آؤ بریانی کھائیں، فیروز حیدر، شگوفہ سلور جوبلی نمبر، صفحہ۔۵۹

(۷۴) کا نا دجال، فیروز حیدر، شگوفہ نومبر ۱۹۹۷ء، صفحہ۔۳۱

(۷۵) تخلیق کا کرب، فیروز حیدر، شگوفہ اکتوبر ۱۹۷۴ء، صفحہ۔۲۴

(۷۶) کا نا دجال، فیروز حیدر، شگوفہ نومبر ۱۹۹۷ء، صفحہ۔۳۱

(۷۷) مخصوص کالم ''یادرفتگاں''، مجتبیٰ حسین، روزنامہ سیاست ۲۸/ جنوری ۲۰۱۸ء

(۷۸) بزم ارباب نظر (سوانحی انشائیے) قدیر زماں، عرض مصنف، ڈسمبر ۲۰۰۷ء

(۷۹) بتّیسی، قیسیؔ قمرنگری، شگوفہ جون ۱۹۹۵ء، صفحہ۔۶۷

(۸۰) سالے، قیسیؔ قمرنگری، شگوفہ ڈسمبر ۲۰۰۶ء، صفحہ۔۴۷

(۸۱) بتّیسی، قیسیؔ قمرنگری، شگوفہ جون ۱۹۹۵ء، صفحہ۔۲۸

(۸۲) سالے، قیسیؔ قمرنگری، شگوفہ ڈسمبر ۲۰۰۶ء، صفحہ۔۴۷

(۸۳) چینی ایش ٹرے کی یاد میں، چشتی حسن مرتبہ: مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریری مضامین، سفرنامہ، اور کالموں کا انتخاب، صفحہ۔۱۴۲، ۱۴۳

(۸۴) ہماری بے مکانی دیکھتے جاؤ، حسن چشتی مرتبہ، مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں، صفحہ۔۲۹

(۸۵) ایک ملاقات دیمکوں کی ملکہ سے، مجتبیٰ حسین، شگوفہ مارچ ۱۹۹۴ء، صفحہ۔۱۲

(۸۶) جگالی، مجتبیٰ حسین، شگوفہ سالنامہ جنوری ۱۹۷۸ء، صفحہ۔۲۱

(۸۷) مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں، مضامین سفرنامہ، اور کالموں کا انتخاب، چشتی حسن مرتبہ، صفحہ۔ ۱۴۶

(۸۸) بجٹ کا جھنجٹ، مجتبیٰ حسین، شگوفہ اپریل ۱۹۹۵ء، صفحہ۔۱۰

(۸۹) ایک ملاقات دیمکوں کی ملکہ سے، مجتبیٰ حسین، شگوفہ مارچ ۱۹۹۴ء، صفحہ۔۱۳

(۹۰) چند کلیاں نشاط کی، محمد برہان حسین، سرِ ورق

(۹۱) چند کلیاں نشاط کی، محمد برہان حسین، صورت گراں۔عرف محسنان

(۹۲) گنڈی پیٹ، محمد برہان حسین، شگوفہ نومبر ۱۹۷۶ء، صفحہ۔۲۲

(۹۳) سینما بنی، محمد برہان حسین، اکٹوبر ۱۹۷۴ء، صفحہ۔۲۹

(۹۴) رسم اجراء، محمد برہان حسین، شگوفہ نومبر ۱۹۷۴ء، صفحہ۔۲۰، ۲۱

(۹۵) فورین کا جنون، محمد برہان حسین، شگوفہ، سالنامہ ۱۹۷۸ء، صفحہ۔۸۲

(۹۶) سنشور والے، محمد برہان حسین، شگوفہ اگست ۱۹۹۱ء، صفحہ۔۲۰

(۹۷) سینما بینی، محمد برہان حسین، شگوفہ اکتوبر ۱۹۷۴ء، صفحہ۔۳۲

(۹۸) بزرگوں کی ریسرچ، محمد برہان حسین، شگوفہ مارچ ۱۹۷۶ء، صفحہ۔۱۵

(۹۹) طرفہ تماشہ، مسیح انجم، صفحہ۔۵

(۱۰۰) بونتہ، مسیح انجم، شگوفہ ستمبر ۱۹۹۷ء، صفحہ۔۸۷

(۱۰۱) ہینڈ ریڈوی، مسیح انجم، شگوفہ مئی ۱۹۹۶ء، صفحہ۔۱۲

(۱۰۲) قصہ درس سناتے ہیں، مسیح انجم، طرفہ تماشہ، صفحہ۔۳۷

(۱۰۳) مجھ سے ملئے میں ووٹر ہوں، مسیح انجم، شگوفہ سالنامہ ۱۹۹۶ء، صفحہ۔۳۳

(۱۰۴) ہینڈ ریڈوی، مسیح انجم، شگوفہ مئی ۱۹۹۶ء، صفحہ۔۱۱

(۱۰۵) شامت اعمال، ممتاز مہدی، صفحہ۔۱۳، ۱۴، ۱۶، ۱۷

(۱۰۶) الٹی گنگا، ڈاکٹر ممتاز مہدی، سرورق

(۱۰۷) سوچنا، الٹی گنگا، ڈاکٹر ممتاز مہدی، صفحہ۔۷، ۸

(۱۰۸) اکیسویں صدی، ممتاز مہدی، شامت اعمال، صفحہ۔۷۶

(۱۰۹) سونا، ممتاز مہدی، شگوفہ جون ۱۹۹۵ء، صفحہ۔۲۶

(۱۱۰) مرنا، ممتاز مہدی، شگوفہ ۱۹۹۵ء، صفحہ۔۴۶

(۱۱۱) جوتے، منظور الامین، شگوفہ جولائی ۱۹۹۰ء، صفحہ۔۱۵، ۱۶

(۱۱۲) بچہ، باپ، دادا، منظور الامین، شگوفہ سالنامہ ۱۹۹۱ء، صفحہ۔۶۵

(۱۱۳) لالچ، منظور الامین، شگوفہ جون ۱۹۹۱ء، صفحہ۔۲۸

(۱۱۴) عزم اور ازم، منظور الامین، شگوفہ مارچ ۱۹۹۴ء، صفحہ۔۳۰

(۱۱۵) لالچ، منظور الامین، شگوفہ جون ۱۹۹۱ء، صفحہ۔۲۸، ۲۹

(۱۱۶) حیدرآباد کا تغرافیہ، نریندر لوتھر، الف تحاشہ، صفحہ۔۳۳، ۳۴

(۱۱۷) بڑا آدمی، نریندر لوتھر، الف تحاشہ، صفحہ۔۷۴، ۷۵

(۱۱۸) امتحان، نریندر لوتھر، شگوفہ سلور جوبلی نمبر، صفحہ۔۱۹

(۱۱۹) کوڈاں، نریندر لوتھر، الف تحاشہ، صفحہ۔۱۱۷

(۱۲۰) کوڈاں، نریندر لوتھر، شگوفہ ستمبر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۶۸

(۱۲۱) سویرے کی سیر، نریندھر لوتھر، الف تحاشہ، صفحہ۔۶۲، ۶۳

(۱۲۲) ماہ نامہ شگوفہ، فروری ۲۰۱۷ء، صفحہ۔۴۳

(۱۲۳) شگوفہ فروری، ۲۰۱۷ء، صفحہ۔۴۱

(۱۲۴) یوسف امتیاز مجتبیٰ حسین، شگوفہ، صفحہ۔۴۲

(۱۲۵) پھر چھڑی بات جوتوں کی، یوسف امتیاز، شگوفہ جولائی، ۱۹۹۷ء، صفحہ۔۱۹

(۱۲۶) نائی سے ہیر ڈریسر تک، یوسف امتیاز، شگوفہ سالنامہ ۱۹۹۶ء، صفحہ۔۸۸

(۱۲۷) گوری رنگت بھی کیا بری شئے ہے، یوسف امتیاز کینڈا، شگوفہ اکتوبر ۱۹۹۵ء، صفحہ۔۴۴

(۱۲۸) سگریٹ نوشی منع ہے، یوسف امتیاز، شگوفہ ستمبر ۱۹۹۵ء، صفحہ۔۳۵

(۱۲۹) جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے، یوسف امتیاز کینڈا، شگوفہ مئی ۱۹۹۵ء، صفحہ۔۴۰

******

باب پنجم

جنوبی ہند کے دیگر ریاستوں میں اردو انشائیہ

آزادی کے بعد

کرناٹک، کیرالا اور ٹامل ناڈو

جنوبی ہند کے دیگر ریاستوں میں اردو انشائیہ
آزادی کے بعد۔ کرناٹک، کیرالا، ٹامل ناڈو

اردو زبان وادب نے جتنی ترقی جنوبی ہند میں اس کی مثال پورے ملک میں نہیں ملتی۔ ریاست کرناٹک ایک تاریخی شہر ہے۔ یہاں کی فضاؤں میں بزرگان دین کا فیض علمی وادبی شغف شامل ہے۔ کرناٹک کے علمی وادبی شہرت ووقار میں یہاں کے ادیبوں کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ہر دور میں علم وادب کو اولیت دی اور نئے نئے موضوعات اختیار کئے۔ نئے نئے اسلوب ڈھالے۔ ہئیت اور تکنیک کے تجربے کئے۔ ادب کے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی بھی کی ہے۔ یہاں کے ادیبوں نے ادب کے بولتے ہوئے تیور، منفرد لہجے، اور ایک نئے زاویے سے اردو قارئین کو روشنا کروایا اور اپنی تحریروں سے اردو ادب کو ثمر آور کیا۔ اردو کی ایک صنف سخن انشائیہ کی بھی آبیاری کی اور اس کے فروغ میں ایک اہم رول ادا کیا۔ جن میں کچھ ادیب انشائیے تحریر کر کے نام کما چکے ہیں اور کچھ اپنے اس سفر پر گامزن ہیں۔

۱.۵۔ امجد علی فیض

محمد امجد علی نام اور امجد علی فیض قلمی نام ہے، ۱۵/جون/۱۹۶۵ء کو گلبرگہ میں ولادت ہوئی۔ ان کے والد کا نام محمد یوسف علی اور والدہ کا نام فاطمہ بی ہے۔ انہوں نے بی اے سیول کیا ہے۔ امجد علی فیض ایک مزاح نگار ادیب ہیں۔ ان کی تصانیف میں ''جستہ برجستہ'' (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ) شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد اور سالار بنگلور میں شائع ہوئے ہیں۔ امجد ادبی اور علمی اداروں سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ ٹرسٹی احمد جلیس لٹریری فورم گلبرگہ، رکن انجمن خوش دلانِ کرناٹک، بنگلور کے بھی رکن رہ چکے ہیں۔

ان کے انشائیوں کے عنوانات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے انشائیوں کے موضوعات اپنے گردوپیش سے لئے گئے ہیں۔ کرایہ کا قفس، کفایت شعاری زندہ باد، تیموری ثانی، اور ہوائی اڈاہ وغیرہ۔

''انشائیہ کی ایک تکنیک داخلیت اور خود کلامی ہے۔ ایک کامیاب انشائیہ نگار اپنے ذاتی تجربات اور قارئین کو آگاہ کرتا ہے۔ وہ اپنے تجربات ان سے بیان کرتا ہے۔ اس لحاظ سے خودنوشت انشائیہ کا بہترین جز ہے۔ امجد علی فیض کا انشائیہ ''کفایت شعاری زندہ باد'' میں انشائیہ نگار اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو دلکش انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ اپنے حال دل سے قاری کو آگاہ کرتے ہیں۔ جس سے قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہ اقتباس

ملاحظہ فرمائیں:

''ہماری بیگم بڑی ہی کفایت شعار واقع ہوتی ہے، ہمیں فضول خرچی سے باز رکھنے کے لئے وہ اونٹ سے لے کر چیونٹی تک کی مثالیں پیش کرتی ہیں اور ہمارے پڑوسی کے حوالے سے فرماتی ہیں کہ اس بے چارہ نے کفایت شعاری سے کام لے کر بیوی بچوں کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے اپنی خواہشات کو قربان کر دیا۔ سگریٹ نوشی ترک کر دی۔ شراب نوشی سے توبہ کر لی اور پان سپاری تک کھانی چھوڑ دی۔ بس اب صرف انگوٹھا چوس چوس کر وقت گزارتا ہے خدا کرے ایسا کفایت شعار شوہر ہر عورت کو نصیب ہو۔'' آمین''۔ اور ایک تم ہو کہ فضول خرچی سے باز نہیں آتے۔ ساری تنخواہ سگریٹ اور پٹرول کے دھوئیں میں اڑاتے ہو۔ جتنا خرچ تمہاری اسکوٹر رانی اور سگریٹ نوشی پر آتا ہے اس میں بچوں کی ٹیوشن فیس، والدین کی دوائیں اور ساس سالیوں کی دعائیں لی جا سکتی ہیں۔'' (۱)

''کرایہ کے قفس میں'' اس کے عنوان سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ امجد علی فیض زندگی سے حاصل کردہ احساسات اور کیفیات کو انشائی صورت میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ اس انشائیہ میں وہ مکانداروں کے اور کرائیداروں کی صفات کو اجاگر کیا ہے۔ مکاندار کے ہر پہلو سے قاری کو پر لطف کیا ہے۔ اور اس انشائیہ میں انشائیہ کی ایک اہم تکنیک بے ربطگی کا استعمال بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''پھر بھی مکان تو آخر مکاندار کا ہوتا ہے۔ بھاڑے کا گھر' خالی کر سو ہم نے خالی کر دیا اور یوں ایک سے دوسرے دوسرے سے تیسرے مکان میں منتقل ہوتے رہے۔ اگر ان مکانوں کا ریکارڈ دیکھا جائے تو عرض ہے ہم نے آج تک صرف اتنے ہی مکانات بدلے جتنے ہالی ووڈ کی مشہور ہیروئن ایلزبتھ ٹیلر نے اپنے شوہر۔ اب ہمارا ذاتی مکان ہو گیا ہے۔ ایسا بھی نہیں بلکہ ہم فی الوقت بھی کرائے کے مکان سے ہی بول رہے ہیں۔ یہاں ہم پوری طرح سے مطمئن تو نہیں ہیں البتہ ہم دونوں یعنی مکاندار ہمیں اور ہم مکاندار کو مطمئن کرنے کی کوشش میں ایک عرصے سے ایک دوسرے کو پریشان کرتے آ رہے ہیں۔''(۲)

امجد علی فیض کا ایک اور انشائیہ ''ھوائی اڈھ'' ہے۔ اس انشائیہ میں وہ بالوں کے گرنے اور گنجے ہونے اور گنجوں کے مسائل کو دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں اور گنجوں کی دو قسموں کو بتلاتے ہیں۔ پہلا گنجا ''نو گنجہ''، دوسرا

گنجا ''گنجہ کنبہ'' ہوتا ہے۔ پہلا گنجا وہ ہوتا ہے جس کے بال آہستہ آہستہ جاتے ہیں۔ اور دوسرا وہ گنجا ہوتا ہے جس کے سر میں درمیان کے سارے بال اڑ جاتے ہیں اور سر کے اطراف ایک جھالرسی بچ جاتی ہے۔ یہ دو گنجے گنواتے ہوئے گنجوں کے مختلف نام گنواتے ہیں اور انشائیہ کی شعریات کو خوبصورت انداز میں استعمال کرتے ہیں۔

''گنجوں کی یہ دو قسمیں آم اور امرود کی طرح مشہور ہیں جب بھی
ان دونوں کا سامنا ہوتا ہے گنجہ نو کو گنجہ کہنہ میں اپنا مستقبل صاف دکھائی
دیتا ہے اور گنجہ کہنہ نوارد گنجہ گنجہ کو دیکھ کر دل ہی دل میں کہتا ہے۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

یہ بے چارے ہر جگہ ہدف تنقید بنتے ہیں۔ چکی ہانڈی۔ ٹخلا۔ چکنا گھڑا۔ چاند اور ایر پورٹ جیسے القاب سے انہیں نوازا جاتا ہے۔ بے تکلف احباب ان کو موضوع بناتے ہیں اور خوب چھیڑتے ہیں ہمارے ایک دوست کا شمار بھی ان ہی ستائے ہوئے لوگوں میں ہوتا ہے تنگ آ کر انہوں نے اپنے سارے دوستوں سے قطع تعلق کر لیا ہے آجکل وہ ہر نماز کے بعد ایک دعا کرتے نظر آتے ہیں۔

''میرے مولا سر بھی تیرا، بال بھی
تیرے اور وہ بھی تیرے جب تیری نظر'' (۳)

امجد علی فیض کا ایک انشائیہ ''تیمور ثانی'' ہے۔ اس انشائیہ میں انہوں نے سماجی مسائل کو پیش کرتے ہوئے سیاسی لیڈروں پر بھرپور طنز کیا ہے۔ اور ضرب المثل کو نیں کے منڈک کا استعمال بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہندی کے ضرب المثل کا استعمال بہت عمدہ ہے۔ ان کی تحریر کا یہ خوبصورت انداز ملاحظہ ہو:

''عوام نے انہیں تیمور ثانی کے خطاب سے سرفراز کیا ہے اور جب انہیں
اس خطاب سے نوازا گیا تو ضرور اس میں بھی کچھ فتنہ پوشیدہ ہوگی۔ یہ بات تو
کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ لیڈر حضرات انتخابی مینڈک ہوتے ہیں جو
الکشن کے اعلان کے ساتھ ہی اپنے اپنے کنوؤں سے نکل کر سارے شہر میں
پھیل جاتے ہیں۔ موصوف کا تعلق بھی اسی قبیل سے ہے۔ ادھر الکشن کا اعلان
ہوا ادھر یہ پھدک پھدک کر اقوامی تعلقات بحال کرنے میں جٹ گئے، یہ
جناب ہمارے حلقہ کے آزاد امیدوار ہیں خدا انہیں سلامت رکھے۔ وعدے

کے بڑے پکے۔ پران جائے پروچن نہ جائے کے حامی جو کہا کر دکھایا پیدائش سے لیکر آج تک لفظ آزادی پر آنچ نہیں آنے دی۔ یہ ہر قید و بند سے بھی آزاد ہیں۔ نہ کوئی آگے اور نہ کوئی پیچھے۔ شادی بھی محض اس لئے نہیں کی کہ اس سے مرد کی آزادی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔''(۴)

امجد علی فیض انشائیہ میں نئے معنی پیدا کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ وہ نئے معنی اس انداز سے تخلیق کرتے ہیں کہ قاری ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قاری کے ذہنوں پر دیر پا اثر چھوڑتے ہیں۔ اس انشائیہ میں شگفتگی سے نئے معنی بتلاتے ہیں۔ غور فرمائیں:

'' کافی غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ کیوں نہ پاس ہی کھڑے آئس والے سے مبلغ ایک روپیہ کی آئس کریم کھائی جائے جس سے سانپ بھی مرے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی، ہم آئس کریم سے اپنی پیاس بجھانے میں ہمہ تن مصروف تھے کہ ایک مجرد گدھے سے یہ بھی دیکھا نہ گیا وہ ہماری اس حرکت پر طنزاً قہقہے لگا کر ہنسنے لگا۔''(۵)

امجد علی فیض ایک اچھے انشائیہ نگار ہیں۔ امجد علی فیض کی انشائیہ نگاری اور ان کے اسلوب کے بارے میں مجموعی طور پر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ بے تکلف طرز اظہار کے ساتھ ساتھ فکر اور ادراک کی لہر بھی ان کی تحریر کو با معنی اور با مقصد بناتی ہے۔ زبان و بیان میں حقیقت نگاری کا رنگ نمایاں ہے۔ ہلکا پھلکا سا طنز اور مزاح کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ موضوعات کے پیش نظر مواد ترتیب دیتے ہیں۔ کہیں سے بھی بات کا آغاز کرتے ہیں۔ خوش اسلوبی کے دائرے میں سفر کرتے ہیں۔ جان بوجھ کر نتیجہ اخذ نہیں کرتے انشائیہ کو سبق آموز کہانی نہیں بناتے۔ وہ معلومات کے انبار لگانے کے بجائے احساس کی ترسیل میں کوشاں دیکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے انشائیوں میں ان کے ذاتی تجربے اور مشاہدات کی دنیا بنائے ہوئے ہیں۔ ان کے انشائیے ان کی ذاتی تحریر کی تخلیق دیکھائی دیتی ہے۔ زبان و بیان کی لطافت بھی خوب ہے۔ محاورے ضرب الامثال اور انشائی شعریات کا استعمال بھی خوب ہے۔ ضرورت کے لحاظ سے تشبیہ اور تلمیح کا استعمال بھی ملتا ہے۔

۵.۲۔حلیمہ فردوس (ڈاکٹر)

خواتین انشائیہ نگاروں میں ایک نام حلیمہ فردوس کا بھی ہے۔ڈاکٹر حلیمہ فردوس کا تعلق بنگلور سے ہے۔ آج کل وہ وہیں مقیم ہے۔ڈاکٹر حلیمہ فردوس ۲۵/جولائی ۱۹۵۲ء کو سرزمین گلبرگہ سکر شریف میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۷۱ء میں وی جی ویمنس کالج گلبرگہ سے بی۔اے کیا اور جامعہ میسور سے ایم۔اے کیا۔۱۹۷۴ء میں وی۔جی۔ کالج میں بحیثیت لکچرر مقرر ہوئیں۔۱۹۷۶ء میں حکومت کرناٹک کی جانب سے بحیثیت لکچرر منتخب ہوئیں۔وہ صدر شعبہ اردو جے محل کالج سے وابستہ رہی۔تقریباً ۳۷ سال خدمت کی۔اسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے سے سبکدوشی ہوئیں۔

حلیمہ فردوس ۱۹۸۲ء سے ادبی سفر کا آغاز کیا۔حلیمہ فردوس انشائیہ نگار،طنز ومزاح نگار،محقق اور نقاد بھی ہیں۔ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کے دو مجموعے، ماشاءاللہ،اور بہرکیف،شائع ہوئے ہیں۔بیس پچیس انشائیے، دو چار رپورتاژ اور خاکوں پر مشتمل مجموعہ اشاعت کا منتظر ہے۔تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ''راج'' شائع ہو چکے ہے۔انہیں اردو اکاڈمی کرناٹک کی جانب سے ''بہرکیف'' اور ''الفاظ کی دنیا'' کو انعام سے نوازا،اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے نثری خدمات کے اعزاز سے بھی نوازا ہے۔

ڈاکٹر حلیمہ فردوس ''ہم کہاں کے دانا ہیں'' میں اپنا تعارف یوں دلچسپ انداز میں خودنوشت قلم بند کرتی ہیں۔وہ اپنے انشائیہ نگاری کے بارے میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''ملازمت کے ابتدائی دنوں میں خواجہ حسن نظامی کا انشائیہ'' مچھر کا اعلان جنگ'' پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ابھی مضمون ختم بھی ہونے نہیں پایا تھا کہ انشائیہ نگاری کے مچھر کا ایسا خطرناک حملہ ہوا کہ راتوں رات انشائیہ'' ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے'' لکھ ڈالا۔یہ انشائیہ مقامی روزنامہ میں شائع تو ہوا مگر مچھر کی طرح غائب بھی ہوگیا۔افسوس آج ہمارے پاس اس کا ثبوت نہیں ہے۔ہمارا پہلا باضابطہ'' رنگوں کے انتخاب نے'' ماہنامہ شاعر کی زینت بنا۔''

آگے لکھتیں ہیں:

> ماہنامہ شاعر میں مضمون کی اشاعت کے بعد ہماری ہمت بندھی اور شگوفہ کی محفل میں شریک ہونے کا خیال آیا۔مدیر شگوفہ نے نہ صرف مضمون ''خوش فہمی سے غلط فہمی'' تک کی تعریف کی بلکہ ہم میں چھپے انشائیہ نگار ومزاح نگار کو پہچان لیا۔''(۶)

حلیمہ فردوس کا اسلوب رواں اور سادہ ہے۔ مزاح اور طنز اس طرح ہم آمیز ہیں کہ کسی ایک کا غلبہ محسوس نہیں ہوتا۔ ان کے انشائیوں میں الفاظ کا توازن اور جملوں کی مناسب ترتیب بھی ہے۔ انھیں بات سے بات نکالنے کا فن بھی آتا ہے اور وہ انشائیے کو ایک فطری انداز میں آگے بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ تالیاں انشائیے میں مداری سے بندر کا ناچ دیکھ کر لوگ تالی بجاتے ہیں۔ وہ مداری کی بات کرتے ہوئے پارلیمانی اور اسمبلیوں کی بات تک پہنچتے ہوئے وزراء ایم۔ ایل۔ اے اور ایم۔ پی کی تالیوں تک کا سفر بہت خوبصورتی اور دلکش انداز میں تحریر قلم بند کرتی ہیں۔ اس اقتباس سے ان کی فنی مہارت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خوبصورت انداز ملاحظہ ہو:

> ''آزادی کے ان پچاس سالوں میں ہم نے صرف تالیاں بجانی سیکھی ہیں۔ مداری بندر کا ناچ بتاتا ہے، جس کے حکم پر بندر اور جمہورے کو تالی بجانی پڑتی ہے۔ پھر جمہورا اپنی حرکتوں سے ناظرین کو تالی بجانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ شہروں کی سڑکیں سواریوں سے ٹھسی رہتی ہیں اس لئے مداری اور جمہورے فٹ پاتھ پر چلنے والوں کا حق چھیننا نہیں چاہتے دراصل انھوں نے پارلیمان اور اسمبلیوں میں اپنا قبضہ جما لیا ہے۔ وزراء مداری کا ناچ بتاتے ہیں۔ ایم ایل اے اور ایم پی جمہورے بنے تالیاں پیٹتے رہتے ہیں۔ سیاسی تالیوں کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ان کی تالی تو ایک ہاتھ سے بھی بجتی ہے۔ بجتی نہیں، وہ تو طوفان بدتمیزی کھڑا کرتی ہے۔ جس کے شور شرابے میں سارے گھٹالے گھٹ گھٹ کر مر جاتے ہیں۔ سیاستدان کا تالیوں سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ وہ ہر کام تالیوں کے لئے کرتا ہے جب وہ جنتا کی بھلائی کے کام کرتا ہے تو یہ تالیاں جئے جئے کار کا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ وہ اپنی جیبیں بھرنے لگتا ہے تو یہ تالیاں گندے انڈے اور ٹماٹر کی شکل میں اس کا استقبال کرتی ہیں۔''(۷)

انشائیہ میں شخصی ردعمل کو لازمی جز تسلیم کیا جاتا ہے۔ انشائیہ میں انسان کی تخلیقی شخصیت اس معاشرتی اور سماجی شخصیت سے مختلف ہوتی ہے۔ لیکن جب دونوں ایک ہی مرکز سے مل رہے ہوں تو لفظوں میں شخصی تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر حلیمہ فردوس کی شخصیت تخلیقی و غیر تخلیقی دونوں سطح پر خوش رنگ اور پرنور ہے۔ ان کی تحریر میں یہ عکس پوری طرح جھلکتا ہے۔ شروع سے آخر تک یہ انشائیہ موضوع کے ساتھ وابستگی اور جملوں کی بے ساختگی کے باعث قاری کو باندھے رکھتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> ''ہم نے انھیں سمجھایا کہ صبر کرو۔ جلد ہی ہمارا مقالہ مکمل ہو جائے گا اور ہم ڈاکٹر بن جائیں گے۔ اس کے بعد سب سے پہلے تمہیں ڈگری دلوائیں گے

(سنا ہے کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری محنت سے نہیں ملتی۔سفارش پر دلوائی جاتی ہے اور مختانہ دے کر لکھوائی بھی جاتی ہے) رات کی نیندیں حرام کر کے دن کا چین غارت کر کے ہم نے مقالہ مکمل کرلیا۔ خداخدا کر کے ڈگری بھی مل گئی۔ پر ساتھیوں نے ہمارا خوب مذاق اڑایا اور کہا کہ مقالہ لکھنے کے لئے اس قدر محنت کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو بچوں کا کھیل ہے۔ یہ تو بس چنونے تھوڑا دیا۔منو نے تھوڑا دیا ہمارا پیٹ بھر گیا والا معاملہ ہے۔واقعی یہ ترکیب سن کر ہم حیران رہ گئے کاش کہ یہ نسخہ ہمیں پہلے معلوم ہوا ہوتا۔''(۸)

''جھینگر کا اعلان شرافت'' اس انشائیہ میں ڈاکٹر حلیمہ فردوس جھینگر کے ذریعہ اشرف المخلوقات کو شرافت کا درس بہت خوبصورت انداز میں دیتی ہیں اور جھینگر کا اپنا تعارف دلکش انداز میں پیش کرتی ہیں۔ان کی تحریروں میں محاورات اور ضرب الامثال کے موقع کی مناسبت کے لحاظ سے استعمال بہت عمدہ ہیں۔جس سے انشائیے میں قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔قاری شروع سے آخر تک انشائیہ نگار کے ساتھ رہتا ہے۔اور قاری کی توجہ ادھر ادھر نہیں رہتی۔ڈاکٹر حلیمہ فردوس کا فنی اظہار دیکھئے:

''میں ایک حقیر فقیر کیڑا اپنے تجربہ کی بنیاد پر چند باتیں تمہارے گوشِ گزار کرنا چاہتا ہوں۔تمہارے دل شکنی کرنا میرا مقصد نہیں ہے۔ میں بس تمہیں آئینہ دکھانا چاہتا ہوں۔ بھولی بسری باتوں کو یاد دلانا چاہتا ہوں۔ میں تمہارا دوست ہوں یا دشمن۔تم جو چاہو سمجھ لو۔ معبودِ حقیقی نے تمہیں خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجا تھا۔تم اوروں کو شرافت کا سبق پڑھاتے رہے اور خود اس سبق کو بھلا بیٹھے۔ مجھے دیکھو۔کبھی میں کسی کی ٹانگ نہیں کھینچتا اور نہ کسی کے پھٹے میں ٹانگ اڑاتا ہوں (دراصل میری ٹانگیں اس قابل کہاں ہیں) شرافت کی جھوٹی قسمیں کھانے کی مجھے ضرورت پیش نہیں آتی۔تمہاری برادری کو دیکھو جس کا کھاتے ہیں اسی کے برتن میں چھید کرتے ہیں۔کوئی آستین کا سانپ بنا بیٹھا ہے تو کسی کے بغل میں چھری منہ پر رام رام ہے۔''(۹)

''پیشے ہی پیشے'' حلیمہ فردوس کا ایک اور انشائیہ ہے۔اس انشائیہ میں انہوں نے تمام پیشوں کا ذکر دلکش انداز میں رقم طراز کیا ہیں۔وہ چند ایسے پیشوں کا ذکر کرتی ہیں جن سے سماج کا کرب ظاہر ہوتا ہے اور چند پیشے ایسے ہیں جو انسان نہ چاہتے ہوئے بھی اپنوں کی تکلیف اور حالات زندگی سے مجبور ہو کر اپناتا ہے۔مثلاً جلاد، طوائف، مئے فروش غیرہ۔ ہر جلاد قاتل ہوسکتا ہے لیکن ہر قاتل جلاد نہیں ہوسکتا۔اس سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''پیشہ پر شوشہ ہر زمانے میں لگایا جاتا ہے۔البتہ دیکھنے والوں کی نظریں ضرور بری ہوتی ہیں۔چند ایسے پیشے بھی ہیں جن کا نام سنتے ہی کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔طوائف، بھنگی، مئے فروش، جلاد ایسے ہی نفرت زدہ پیشے ہیں۔ دراصل یہ ہمارے معاشرے کے پاکیزہ کردار ہیں۔انسانیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ایک عورت جو ماں بنے بغیر ماں کا پیار دینا چاہتی ہے جو بہن بن کر کسی کا قصور اپنے ذمہ لے سکتی ہے جو بیٹی بن کر گھر کی عزت بڑھانا چاہتی ہے ہم اس کو صرف طوائف زادی رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔چوڑیوں کی کھنک، پازیب کی جھنکار میں اس کا جنازہ نکل جاتا ہے۔صد افسوس اس کے پیشے کا جنازہ نہیں اٹھ سکتا۔گلیوں غلاظت دور کرنے والا محلوں، سڑکوں گھروں کو پاکیزہ رکھنے والا خود گندہ اور بدنام تصور کیا جاتا ہے۔''(۱۰)

ڈاکٹر حلیمہ فردوس اپنی تحریروں میں انشائیہ کی ایک خوبی ذو دہضم کو بہت عمدگی سے پیش کرتی ہیں۔ان کے انشائیہ میں وقت ضرورت اشعار اور تحریف نگاری کا استعمال دلکش انداز میں ہوتا ہے۔وہ انشائیہ کی شعریات کو بھی شعوری طور پر ملحوظ رکھتی ہیں۔ملاحظہ ہو:

''ان کی تعریفوں کو سن کے ہمارے دل پر سانپ لوٹ لوٹ جاتے۔جیسے ہی ہماری ساتھی کا رجسٹریشن ہوگیا۔پروفیسر صاحب نے انھیں ڈاکٹر کہنا شروع کردیا۔ایک بار ہم نے دیکھا کہ وہ ٹیبل پر سر رکھے آرام سے سو رہی ہیں اور پروفیسر صاحب ہندی کی کتابوں سے کچھ مواد نقل کر رہے ہیں۔ہم نے اپنے ساتھی کو جگانا چاہا تو پروفیسر صاحب نے بڑی محبت سے کہا:

سر ہانے ڈاکٹر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک پڑتے پڑتے سوگئی ہیں''(۱۱)

ڈاکٹر حلیمہ فردوس کے انشائیوں میں موضوع کی انفرادیت اسلوب کی جدت اور الفاظ و تراکیب کا خاص انداز تحریر کو دلچسپ بنادیتا ہے۔وہ الفاظ سے کیفیات اظہار پر پوری طرح قدرت رکھتی ہیں۔ان کے انشائیے مختصر ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ نہ تو فکری طور پر کسی الجھن کا شکار ہوتی ہیں اور نہ فنی طور پر جان بوجھ کر پیچیدگی پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ایک سادہ اور سمجھ میں آنے والا رنگ ان کی تحریر میں جاذبیت پیدا کرتا ہے۔ وہ انشائیے میں شعریات کو شعوری طور پر ملحوظ رکھتے ہوئے تحریر قلمبند کرتی ہیں۔ان کے انشائیے ان کی سوچ اور اسلوب کی خوبصورتی کی عکاسی کرتے ہیں۔ان کے تحریروں میں خیال آرائی کا حسن بھی ہے۔انکشاف ذات اور

غیر رسمی انداز بھی ہے۔ شگفتگی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ ان کے انشائیہ مرکز کے اطراف گھومتے ہیں۔ وہ سماج پر طنز کے تیر بھی چلاتی ہیں۔ روانی اور سلاست ان کے انشائیوں کی پہچان ہیں۔ ان کی تحریروں میں زبان و بیان کی خوبیاں بھی موجود ہیں۔ مثلاً تشبیہ، محاورات، ضرب الامثال، کہاوتیں، تلمیح، تحریف نگاری اس کے علاوہ انگریزی الفاظ کا استعمال بھی خوب ہے۔

۳.۵۔رزاق آثر شاہ آبادی:

محمد امین کے صاحبزادے شیخ عبدالرزاق شاہ آباد گلبرگہ میں ۲۲ جولائی ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔انہوں نے مٹرک تک تعلیم حاصل کی ہے۔اثر شاہ آبادی نے رجسٹر میڈکل پریکشنر (R.M.P) ۱۹۶۵ء میں پیشہ سے وابستہ ہوئے۔ان کو صابر شاہ آبادی کی تلمیذیت کا شرف حاصل ہے۔رزاق آثر شاہ آبادی کو بچپن سے شعروشاعری سے دلچسپی تھی جس کے سبب ۱۹۵۹ء سے شعر کہنا شروع کیا اور پہلی غزل شعلہ اور شبنم دہلی اکٹوبر ۱۹۶۱ء کے شمارہ میں شائع ہوئی۔ان کے انشائیہ اکثر و بیشتر اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں تقریباً ۵۵ برسوں سے آل انڈیا ریڈیو گلبرگہ سے اپنا کلام نشر کرتے ہیں۔

آثر شاہ آبادی کو اصناف سخن نظم وغزل کے علاوہ قطعات،نعت ومنقبت،اور آزاد نظموں سے بھی دلچسپی ہے اور ساتھ ہی انشائیہ سے بھی شغف رکھتے ہیں۔انکا مجموعہ کلام نسیم شب ۱۹۹۱ء شائع ہوا،شعر وسنگ ۱۹۹۶ء، بیاض ثناء (حمد وثنا) ۲۰۰۲ء،آئینہ سخن ۲۰۰۸ء،اوراق سخن ۲۰۱۳ء،خصص الحق (حمد ونعت) ۲۰۱۳ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ان کے انشائیوں اور طنزیہ ومزاحیہ کا مجموعہ ''ناک ہے تو ساکھ ہے'' زیر طبع ہے۔

اعزازات: غالب کلچرل اکیڈمی ایوارڈ ۱۹۸۹ء میں عطا کیا گیا اور وزارت ماحولیات وجنگلات حکومت ہند کی جانب سے ماحولیات پر کہی نظم پر سند اور نقد انعام سے ۱۹۹۲ء میں نوازا گیا۔

''چوٹی کانفرنس'' رزاق آثر شاہ آبادی کا نادر انشائیہ ہے۔اس انشائیہ میں انہوں نے ''چوٹی'' ڈالنے والیوں اور چوٹی رکھنے والوں کی تمام خوبیاں بہت خوبصورت انداز میں بیان کی ہے۔اس انشائیہ میں انشائیہ نگار نے سادگی اور روانگی کے ساتھ شگفتہ انداز میں چوٹیاں ڈالنے والی حسیناؤں سے لیکر بالوں کے گرنے،بالوں کو مغربی انداز میں تراشنے تک بہت خوبصورتی کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ''چوٹی'' کی قسموں کا تذکرہ کرتے ہوئے فلموں اور چوٹی کے اسٹاروں اور چوٹی کے کھلاڑیوں کو سمیٹتے ہوئے وہ چوٹی کانفرنس میں شریک ہونے والے بے چوٹی سربراہان مملکت تک کا سفر روانی اور سادگی کے ساتھ طئے کرتے چلے جاتے ہیں تو قاری بھی انشائیہ نگار کے ساتھ دنیا کی سیر کرتے ہوئے محو ہو جاتا ہے۔یہ انشائیہ موضوع کی مناسبت سے شروع سے آخر تک موضوع کے ساتھ وابستگی اور جملوں کی بے ساختگی کے باعث قاری کو باندھے رکھتا ہے۔انشائیہ ''چوٹی کانفرنس'' سے لیا گیا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''چین دنیا کا ایک ایسا ملک ہے جہاں کے کراٹے سیکھنے والے پہلوانی کرنے والے نوجوان ایک لمبی چوٹی سر پر ضرور رکھتے ہیں یہ چوٹی شانے سے ہو

تے ہوئے کمر تک تو نہیں آتی لیکن گردن تک لٹکتی ضرور ہے۔ ہندوستان میں بھی سا دھو ؤں میں بھی چوٹی رکھنے کا چلن کئی صدیوں سے ہے ۔ ہم ہندوستانیوں کو کرکٹ کا کھیل بے حد پسند ہے۔اسی لیے ملک میں کئی چوٹی کے کھلاڑی پیدا ہوئے ہیں۔ جیسے گواسکر، منجریکر، کپل دیو، پٹوڈی، بیدی اور بھا رت رتن سچن تنڈولکر، لیکن ان میں سے کسی بھی کھلاڑی کے سر پر ''چوٹی'' نہیں ہے۔ پھر بھی ساری دنیا انہیں چوٹی کے کھلاڑی کہتی ہے۔اسی طرح فلمی اداکار دلیپ کمار، اشوک کمار، راج کپور، دیوانند، امیتابھ بچن، شاہ رخ خاں، اکھشے کمار، راجیش کھنہ وغیرہ دنیا کے چوٹی کے اداکار ہیں یا تھے یہ سب چوٹی کے بغیر چوٹی تک پہنچے ہیں۔''(۱۲)

ان کا ایک انشائیہ ''خدا جھوٹ نہ بلوائے'' ہے۔اس میں سماج کی ایک برائی ''مانگنے'' کی طرف توجہ کی ہے۔اس میں گہری سنجیدگی وطنز کا تاثر ملتا ہے۔اس انشائیہ میں مانگنے کی کئی قسموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سماج میں مختلف انداز مانگنے کے ہیں چاہے برتن مانگے، یا ماچس مانگنے کی قسموں کو بہت اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ مانگنے کی ایک قسم جس میں شان بڑی سمجھتے ہیں سماج کی ایسی رسم ''جہیز'' ہے جس کو لعنت بھی کہا جاتا ہے۔اس کو بہت دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔انشائیہ نگار جب اپنے کسی عمل کو توضیح اور اس کے مبنی ہونے پر حقیقت کی دلیلیں پیش کرنے لگے تو انشائیہ ایک مباحثہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔خود انکشافی، دفاعی انداز تک پہنچ جاتی ہے۔اور قاری بھی دفاعی پوزیشن سنبھال لیتا ہے۔''خدا جھوٹ نہ بلوائے'' کے ان جملوں سے رزاق آثر شاہ آبادی کی اسلوبی ہیئت کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

''فقیران ہند و پاک مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے فقیری میں خوب نام کمالیا ہے۔حالانکہ اہل خیر حضرات کو ''خیرات'' دے دے کر نام کمانا چاہئے تھا۔

ہم نے سنا ہے کہ بہت سے اہل خیر اب کار نشین ہی نہیں جہاز نشین بھی ہوگئے ہیں۔ ہر سال خیرات وصول کرنے سے سعودی عرب کا دورہ ایام حج اور ایام رمضان میں کر رہے ہیں۔ان میں سے کئی خیراتیوں کو وہاں کی پولیس نے نہ صرف گرفتار کیا ہے بلکہ انہیں باعزت واپس وہیں بھیج دیا جہاں سے وہ تشریف لائے تھے۔۔۔

آج کل ہمارے معاشرے میں شادی سے پہلے یہ چاہئے، وہ چاہئے کی

شان فقیری بھی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ماں باپ کمپیوٹر کا چھ ماہی کورس پورا کرنے والے لڑکے کو کمپیوٹر انجینئر اور آئی ٹی ڈپلومہ ہولڈر کو چار سالہ کورس مکمل کرنے والا انجینئر بتا کر لڑکی والوں سے منہ مانگی فقیری وصول کر رہے ہیں۔ جب حقیقت حال سے لڑکیاں اور گھر کے لوگ واقف ہو جاتے ہیں تو لڑکی یا تو خود سسرال جانے سے انکار کر دیتی ہے یا ماں باپ جانے سے روک کر رشتہ توڑ لیتے ہیں۔''(۱۳)

ان کا انشائیہ ''گھانس کاٹنا ہمیں بھی آتا ہے'' ہے۔اس انشائیہ میں مصنف نے داخلیت کو پیش کرتے ہوئے بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر بھی بہت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔انشائیہ کی شعریات کو شعوری طور پر ملحوظ رکھتے ہوئے لکھتے ہیں۔ان کا یہ انشائیہ ان کے اسلوب وطرز اظہار کا نمائندہ ہے۔ ہلکے پھلکے موضوعات کے تحت اپنا مواد ترتیب دیتے ہیں۔زبان و بیان کی خوبیوں کو دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں۔ان کے اس انشائیہ میں محاورات،ضرب الامثال اور شعر کا استعمال بہت خوب ہے۔ملاحظہ ہو:

''تاش کے میدان میں بھی پتہ کاٹنے کا رواج ہے۔اگر آپ کا پتہ یکے سے کٹتا ہے تو کوئی دکھ کی بات نہیں ہے کیونکہ ایسا موقع آپ کو بھی مل سکتا ہے۔ آپ کے اس دکھ کو دوسرے بھی سمجھ لیتے ہیں بقول میر:

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے تو ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

بہر حال پتہ کٹنے کے خوف کو دل سے نکال دیجئے اور گھاس کاٹنا شروع کرتے ہی اپنی محفل آپ سجا کر دوسروں کے پتے کاٹنے سے پہلے ہی آپ اس کا پتہ کاٹ دیجئے۔آج کل کسی کو اپنے راستے سے ہٹانا ہے تو کسی شوٹر کو دو چار پیٹھی (یعنی دو چار لاکھ) دے کر اسے ''ٹپکانے'' سپاری دی جاتی ہے۔آج کل تو کئی ممالک اسی انداز ٹپکانا کے سہارے اپنی من مانی کر رہے ہیں۔

انسان اگر گھانس کاٹ سکتا ہے یا کسی کا پتہ کاٹ سکتا ہے تب بہت سے پالتو اور جنگلی جانوروں میں بھی یہ خداداد صلاحیتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔جیسے کہ بلی۔بلی کب کب کس کس کا راستہ کاٹے گی آدمی کو تو کیا اس کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی۔''(۱۴)

رزاق اثرؔ شاہ آبادی کا ایک انشائیہ ''مال مسروقہ'' بھی ہے۔اس انشائیہ میں انشائیہ نگار سماج کے ذمہ

دار شخصیتوں پر بھر پور طنز کرتا ہے۔ چاہے وہ محکمہ پولیس ہو یا صحافت کے دفتر مسروقہ کی ہوئی چیزیں واپس نہیں آتیں۔ مالک حقیقی تک صحیح سلامت نہیں پہنچتیں۔اس انشائیہ میں بات سے باتی بہت خوب انداز میں پیش کی ہے۔اور بے ربطگی کا انداز بھی بہت خوب ہے۔اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''سرقہ کی ایک ایسی ہی اخباری خبر سے دنیائے ادب میں اتنی ہلچل پیدا کردی کے ہندوستان کے وہ قطے بھی جو ماہرین کی نگاہ دوربین میں بھی زلزلوں سے محفوظ سمجھے جاتے تھے زلزلوں سے پہلے ہی جھٹکے کھانے لگے،اردو ادب اور اردو زبان پر ایسا برا وقت بھی آئے گا اردو کے دوستوں نے اور اردو کے دشمنوں نے بھی کبھی نہ سوچا ہوگا۔اس لئے جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ کسی ایک منچلے کی رگِ ظرافت بلکہ رگِ حماقت بھڑک اٹھی۔تو اس نامراد بے ادب نے پوری کی پوری غزل (مقطع میں اپنے تخلص کے اضافہ کے ساتھ) برائے اشاعت شہر زندہ دلان کے ایک اخبار کو بھیج دی۔اس غریب کی بدبختی اور ایڈیٹر کی خوش بختی سے اس غزل کے مسروقہ ہونے کی تصدیق ہوگئی۔''(۱۵)

''گول انڈا'' انشائیہ میں رزاق اثر شاہ آبادی نے انڈوں کا سائز اور مرغیوں کے انڈے دینے کے وقت کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انڈے دینے کا وقت الگ ہوتا ہے شمالی اور جنوبی علاقے کی مرغیاں اپنی اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں۔اس کے علاوہ انشائیہ نگار موضوع کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر بھی قدرت کے قائل ہیں۔ وہ اس انشائیہ میں مناسب مزاحیہ ولطیف انداز اختیار کرتے ہوئے انشائیہ کی ایک اہم خصوصیت زود ہضم کو دلچسپ و پرکش انداز میں پیش کرتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہمارے ملک کی طرح اسے سیکوریٹی فراہم کی گئی ہوگی کیونکہ برطانیہ اس وقت ہمارے ملک کی طرح تنگ دستی کے دور سے گزر رہا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ امریکہ کے کاندھے پر بندوق رکھ کر دوسرے ملکوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر اپنا الوسیدھا کر رہا ہے۔اگر ایسے برے وقت گول انڈا دینے والی مرغی کی نسل کو بڑھانے کی جنگی بنیاد پر اقدامات کئے جائیں تو ہمیں یقین ہے کہ اس کے خاطر خواہ فائدے حاصل ہوں گے ہمارا ملک سونے کی چڑیا ہی نہیں سونے کا انڈا دینے والا ملک بھی تھا۔دوسو سال تک سونے کے انڈے برطانیہ ہی بھیجے گئے ہیں۔انڈا تو انڈا کوہ نور ہیرا بھی اب تک برطانیہ کے قبضہ میں ہے۔''(۱۶)

مجموعی طور پر رزاق اثر شاہ آبادی ایک اچھے انشائیہ نگار ہیں۔شعریات ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے اردو انشائیہ کو پرکھا اس کے حسن ومعائب پر غور کیا اس مطالعہ نے ان کی انشائیہ نگاری کو ایک معیار سے آشنا کیا۔وہ تحریر میں سنجیدگی، طنز ومزاح اور طبیعت کی جولانی تینوں سے بیک وقت کام لیتے ہیں۔موضوعات کے پیش نظر سہولت سے اپنا مواد ترتیب دیتے ہیں۔کہیں سے بھی بات کا آغاز کرتے ہیں اور خوش اسلوبی سے اس دائرے میں سفر کرتے ہیں۔جان بوجھ کر کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتے۔اسلوب کی حد تک لفظیات کا استعمال خوب ہے۔ان کے انشائیوں میں تجربات ومشاہدات کی دنیا آباد ہے۔وہ اپنے تجربات ومشاہدات قاری سے شیئر کرتے جاتے ہیں۔ان کی تحریروں میں انشائیہ کے سبھی تکنیک پائی جاتی ہیں۔ان کے انشائیوں میں انبساط اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر بہت خوب ہے۔ان کی یہ زندہ دل تحریر قاری کے ذہن میں اپنی چھاپ چھوڑ جاتی ہیں۔

۵.۴۔رؤف خوشتر

عبدالرؤف بیجاپور میں ۱۷/اکتوبر ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوئے۔میٹرک کے بعد وجئے کالج بیجاپور سے گریجویشن اور کولہاپور یونیورسٹی (مہاراشٹرا) سے پوسٹ گریجویشن کے بعد بی۔ایڈ کیا۔۱۹۷۰ء میں گورنمنٹ پی۔بی ہائی اسکول جمکھنڈی میں تقرر ہوا۔پانچ سال درس وتدریس کے بعد ملازمت کو ترک کیا۔اور ۱۹۷۲ء میں کے۔پی۔ایس۔سی سے گلبرگہ گورنمنٹ ڈگری کالج میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔رؤف خوشتر جہاں ادبیات اردو کے مقبول اُستادرہے ہیں،کامیاب پرنسپل بھی کہلائے۔وہ شانور،چکمگور،اور بیدر کے ڈگری کالجوں میں بحیثیت پرنسپل کے خدمت انجام دیں۔۲۰۰۳ء میں پرنسپل کے عہدہ جلیلہ سے سبکدوش ہوئے۔ان کا انتقال ۸/ستمبر/۲۰۱۸ء میں ہوا۔

ان کے مضامین مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔۱۹۸۲ء میں رؤف خوشتر کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ''غبار حاضر'' شائع ہوا۔۲۰۰۹ء میں ان کے مضامین کا دوسرا مجموعہ آنکھ بیتی،کرناٹک اردو اکیڈیمی سے شائع ہوا۔اور فکاہیہ مضامین پر مشتمل مجموعہ ''صرف درباں'' شائع ہوا۔لمحوں کا سفر،افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔رؤف خوشتر افسانہ نگار،طنز ومزاح نگار،انشائیہ نگار اور پیروڈی نگار بھی ہیں۔

پروفیسر خالد حسین خاں اس طرح رقم طراز ہے کہ:

> ''رؤف خوشتر کی شخصیت کی طرح ان کے ظریفانہ انشائیے بھی بناوٹ، اکتاہٹ اور دکھاوٹ سے پاک ہیں۔ان کے مضامین میں آہ بھی ہے اور واہ بھی،چاہ بھی اور راہ بھی۔مزاحیہ نثر سپرد قلم کرنا دماغ کسرت کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں دل کے ساز اور دماغ کے راز دونوں کی کارفرمائی ہے۔دماغ کی کسرت خون میں شکر کھولتی ہے اور دل کی ریاضت روح میں شہد اور دونوں کا انجام وعلاج صرف دوا ہے،ایک خود کی دوا تلاش کرتی ہے اور دوسری ساری خدائی کے لئے دوا پیش کرتی ہے۔''(۱۷)

''دیوانے آم'' رؤف خوشتر کا ایک انشائیہ ہے۔جس میں وہ سماج پر طنز کرتے ہیں۔ان کی سماج پر گہری نظر ہے۔وہ موضوع کے ساتھ ساتھ زبان وبیان پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔وہ ہمارے معاشرے کی حرکات وسکنات سے بخوبی واقف ہیں۔وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ سماج کے حالات بیان کرتے ہیں۔ان کا بات سے بات پیدا کرنے کا انداز عمدہ ہے۔ان کے جملوں سے ہلکا سا طنز بھی جھلکتا ہے۔ذو دہضم کی کیفیت بھی عمدہ ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''پہلے آم صرف آم کی شکل میں ملتے تھے۔اب آم جام کی شکل میں بھی مل رہے ہیں۔آم کا جام،آم کی جیلی اور آم کا مشروب جب لوگ ایک چہرے پر کئی چہروں کے نقاب لگا سکتے ہیں تو پھر موجودہ دور کے آم کیسے پیچھے رہ سکتے ہیں؟ سو وہ بھی بدلی ہوئی شکلوں کے ساتھ آرہے ہیں۔آم کی خوبی یہ ہے کہ یہ خربوز کی طرح اپنا رنگ نہیں بدلتا۔آم کے چھلکے کیلے کے چھلکوں کی طرح کسی کو گراتے نہیں ہیں۔آم کا پودا خاص کا پودا ہے عام درختوں کے نہیں اُگتا ہمارے ایک دوست کے باغ میں ہر قسم کے پھل کے درخت ہیں۔جب انہوں نے آم کے درخت لگوائے تو ہم نے کہا۔جناب یہاں آم کے درخت نہیں اُگ سکتے تو انہوں نے جواب دیا کہ بادام ہوئے تو کیا آم نہ ہوں گا۔موجودہ دور میں بڑے ملک ایک دوسرے کو ہتھیار اور بم دیتے رہتے ہیں۔اسی لیے ہم کہتے ہیں ؟اے میرے دل کہیں اور چل بم کی دنیا سے دل بھر گیا ہندوستان چونکہ صدیوں سے امن پسند ملک رہا ہے۔اسی لیے وہ خلوص ومحبت کے ساتھ ساتھ دوسرے ملکوں کو آم بانٹتا ہے بلکہ کئی ملکوں کے سربراہ تو محض آموں کی خاطر اپنے دورے آم کے موسم ہی میں مقرر کر لیتے ہیں۔اس طرح ان کے ہندوستان کے ساتھ میٹھے تعلقات بنے رہتے ہیں۔اور انھیں آم بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ایسے دوروں کو وہ ہر لحاظ سے ثمر آور دورہ کہتے ہیں۔اس عالمی سیاست کو آم کے آم گھٹلیوں کے دام کہتے ہیں۔''(۱۸)

''خرفروشی کی تمنا'' میں رؤوف خوشتر اپنے پڑوسیوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنا حال دل بھی بیان کرتے ہیں ان کی یہ تحریر انشائیہ کے قریب تر دیکھائی دیتی ہے۔اس انشائیہ میں انکشاف ذات کا اظہار بخوبی ملتا ہے۔اس کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ہماری کمزور آنکھوں نے یہ منظر دیکھا۔ہمارے تیز کانوں نے یہ دھمکی سنی۔اس کے باوجود گدھے کو مہمان بنا کر رکھنا اپنے گدھے پن کا ثبوت دینا تھا۔عقلمندی کے تقاضہ کے تحت ہم گدھے پر خان صاحب کو ترجیح دینے پر مجبور تھے کیونکہ ان کے ہاتھوں میں لاٹھی ہے،گدھے کے پاس کیا ہے؟ اس لئے ہوش مندی سے اس دھوبی کو جو پچھلے دنوں سے گدھے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہا کے جب رات ڈھلے آنا کیوں کہ

''خرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے''(۱۹)

''نکّو رے باوا نکّو'' رؤف خوشتر کی یہ ایک مزاحیہ تحریر ہے۔اس میں ان کے دوستوں اور رشتہ داروں نے ان کی دوسری شادی کی رضامندی پر دلہن کی تلاش اور اس کے شرائط کا ذکر خوبصورت انداز میں کیا ہے۔جس میں انشائیہ کی ایک خصوصیت بے تکلفی کا اظہار اور ساتھ ہی تلمیح کا عمدہ استعمال ملتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہم نے گھبرا کر اپنی تشویش ظاہر کی کہ کہیں وہ روز ہماری کلاس نہ لے۔ 'ارے بھئی وہ تو سرکاری دانش و درس گاہ میں تھی تو وہاں پڑھنے پڑھانے کا کیا کام؟ جب برسر روزگار نہیں پڑھاتی تو ان وہ کیا خاک پڑھائے گی۔البتہ بنت حوا ہونے کے ناطے وہ روز ازدواجی کلاس تو لے گی۔اس سے کسی شوہر کو مفر نہیں۔''(۲۰)

''تیرا گانا'' میں رؤف خوشتر اپنے پڑوسیوں کے حرکات وسکنات کو مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔وہ طنز ومزاح کے ذریعہ اپنے فن کا مظاہر کرتے ہیں۔وہ پڑوسیوں کے حرکات کو اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ قاری کی دلچسپی بنی رہتی ہے۔یہ مزاحیہ انداز ملاحظہ فرمائیں:

''غسل خانہ اور دیوان خان میں تو غلام علی کو ان کے راگوں اور گانوں کی کوئی داد نہ ملی، لیکن باورچی خانہ میں معاملہ دوسرا تھا۔ وہاں باورچی (اپنی نوکری اور تنخواہ کے خیال سے) ان کے گانوں کی بھرپور داد دیتی بلکہ گانے کے لئے اکساتی۔ کچھ سنایئے کہ جی نہیں لگتا۔ اور یہ بھرپور انداز میں گاتے اور گنگناتے جب کوئی مشکل پڑ جائے جب بیگم باہر جائے تم کو میرا ساتھ دینا ہوگا میرے ہم نوا۔ بیرون خانہ کا نقشہ الٹا ہی تھا۔ وہاں بہ قول غلام علی سب پڑوسی خوش تھے کیوں کہ:

یوں ہی گر گاتا رہے بے ڈھب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

اور واقعی محلّہ ویران ہوگیا۔فقیروں گداگروں، چندہ مانگنے والوں اور آوارہ کتوں سے پڑوسی کھڑکیاں دروازے بند کرنے لگے، روتے بچے ڈر کر خاموش ہوگئے۔''(۲۱)

رؤف خوشتر کے مجموعی مزاج کو مدنظر رکھیں تو ان کی تحریروں میں مزاح کا عنصر بہت پایا جاتا ہے۔ان کے ہاں انشائیہ کی چند ایک خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ بات سے بات پیدا کرنا، بے تکلفی اور شگفتگی کا استعمال

بہتر انداز میں ہوتا ہے۔خود انکشافی ذات میں خارجی پہلو کو ظاہر کرتے ہیں۔ان کے ہاں اشعار کا بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ضرب الامثال اور محاوروں کا استعمال بھی بہت زیادہ ہے۔ان کے انشائیے طویل ہوتے ہیں اور اس میں قصوں سا انداز پایا جاتا ہے۔اور تلمیح کا استعمال بھی بہت دلکش انداز میں ہوتا ہے۔ان کی تحریریں انشائیہ سے بہت قریب ہیں۔ان کے انشائیوں میں سادگی اور روانی موجود ہے۔ان کے انشائیے قاری کو متاثر کرتے ہیں۔کہاوتوں اور محاروں کا استعمال بہت خوب کیا ہے۔ان کا شمار ابتدائی انشائیہ نگاروں میں کیا جاسکتا ہے۔

۵.۵۔فرزانہ فرح (ڈاکٹر)

جنوبی ہند کی ریاست کرناٹک کی خاک زمین سے ڈاکٹر فرزانہ فرح بھٹکل ریاست کرناٹک سے انشائیہ تحریر کر کے انشائیہ کی گلستان کو مہکا رہی ہیں۔ان کا پورا نام فرزانہ فرح محتشم ہے۔انہوں نے بی۔اے،ایم۔اے، اپنی برادری اور انجمن کالج بھٹکل سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کرنے والی پہلی طالبہ کا شرف حاصل ہے اور یہ نارتھ کنیرا سے پی۔ایچ۔ڈی حاصل کرنے والی خاتون اول کہلاتی ہیں۔اور پیشہ سے درس وتدریس سے وابستہ ہوئیں اور پھر پرنسپل کے عہدے پر فائض ہوگئیں۔وہ ایک افسانہ نگار، طنز ومزاح نگار،انشائیہ نگار اور ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں۔ڈاکٹر فرزانہ فرح کا مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ''شوقی تحریر'' منظر عام پر آ گیا۔دوسرا مجموعہ ''دیکھنا تحریر کی لذت'' ۲۰۱۶ء میں شائع ہو چکا ہے جو انشائیہ کا مجموعہ ہے۔ ان کے اکثر انشائیے رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

خواتین انشائیہ نگاروں میں ایک اہم نام فرزانہ فرح کا بھی ہے۔ان کے چند انشائیے قارئین کے لئے دلچسپی کا سامان رکھتے ہیں۔ان کا ایک نمائندہ انشائیہ ''دل کے راستے'' ہیں جس میں موضوع کی ندرت کے ساتھ ساتھ مصنفہ کی فن پر قدرت بھی ظاہر ہوتی ہے۔وہ خاتون ہونے کے ناطے ان کے لئے Shopping، بیاہ کی رسمیں،خرید وفروخت، بہت کشش رکھتی ہیں۔ایسے موقع پر ان کی نظر ایسے مناظر اور پہلوؤں پر ہوتی ہے جو عام لوگوں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔مثلاً shopping وغیرہ۔انہوں نے اس انشائیہ کے آغاز سے ہی خواتین کی نفسیات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔عورتوں کو ہر وقت خرید وفروخت کی دھن لگی رہتی ہے۔خواتین ہر وقت بہانا تلاش کرتے رہتیں ہیں کہ خرید وفروخت کا کچھ ان کو بہانا میسر آئے چاہے وہ آف لائن ہو یا آن لائن بس صرف شاپنگ کرنا ہے۔مصنفہ کے خیال میں دیہی معاشرہ ہو یا شہری معاشرہ فطرت سے جڑا ہوتا ہے۔نئی ایجادات سماج کی وابستگی کا احساس ہوتا ہے۔اسی کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔اس انشائیہ میں فرح نے مرد کے دل تک جانے کے راستے بھی بتلائے ہیں اور بیوی کے دل تک جانے کے راستے بھی بہت خوبصورتی سے دکھائے ہیں۔اس انشائیہ میں خوبصورتی کے ساتھ بازاروں میں آن لائن شاپنگ کے طریقے بہت دلکش انداز میں سمجھائے ہیں۔جدید اور قدیم طرز شاپنگ کے گر سکھائے ہیں۔اس ذو دہضم جو کہ انشائیہ کی ایک خصوصیت ہے اس کو بہت دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

> ''یہ نظارہ دیکھ کے ہم نے سوچا، زمانہء ماضی کتنا اکتاہٹ بھرا تھا۔لوگ چھٹی کے دن کا انتظار کرتے۔ پرس میں پیسے ٹھونستے اور لمبی ٹریفک میں پھنس

پھنس کے بازاروں میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے۔مگر صاحب! اس دور میں بھی عورتیں خوب سیانی تھیں۔ جوان بیٹیوں کو بازار لے جاتیں۔ دکانداروں سے مول تول پر لڑنے کی ٹریننگ دیتیں جس کے پس پردہ مستقبل میں شوہروں سے جنگ کی ریہرسل مقصود ہوتی۔ یہیں سے مردوں کو انگلیوں پر نچانے کا فن سکھایا جاتا۔ یہ نہیں وہ دکھاو۔۔ وہ نہیں یہ کھاؤ۔۔ اور بلآخر گھڑیبیاں اپنے بجٹ کی فکر کرتے ہوئے یہ کہہ کر لوٹ آتیں کہ۔۔۔ نہ جی۔ ہمیں کچھ پسند ہی نہیں آیا۔ ایسے میں شوہر ساتھ ہو تو ان کی ذمہ داری دہری ہو جاتی۔ ایک نظر اشیاء پر دوسری شوہر نہ مراد پر، کہ انھیں غافل دیکھ کر کسی سیلز گرل کو نہ تاک رہے ہوں۔ آخر کو چیزیں مول لینے جاتی تھیں، مصیبت مول لینے نہیں۔''(۲۲)

انشائیہ کی ایک اہم تکنیک انشائیہ کی حسن بیانی، حسن لفظی اور حسین خیال اور موزوں اظہار کی مناسب ترتیب ہے۔ ایک معیاری انشائیہ وہی شمار ہوگا جس میں اسلوب رواں دواں ہوگا۔ ڈاکٹر فرزانہ فرح کا انشائیہ ''کار جہاں دراز ہے'' میں اپنے حسن خیال کو حسن لفظی کے ساتھ موزوں تربیت کے اظہار کی ترتیب میں مناسب حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے فنکارانہ صلاحیت کو ملاحظہ فرمائیں:

''ہماری ایک دوست نما دشمن بولیں ''لو جی! باسی کڑھائی میں ابال آنا اسے کہتے ہیں۔ یہ ڈرائیونگ سیکھیں گی؟ ان سے پوچھیں کار کی کمپنی کے نام بھی جانتی ہیں؟ اور تو اور ہمیں تو یقین ہے کہ کار کے کل پرزوں کی شد بد تک نہ ہوگی محترمہ کو۔'' ہم نے ایک شان بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔۔ ''لو کر لو بات۔ ایسے کتنے ہی اناڑی اپنے میدان کے سورما مانے جاتے ہیں۔''(۲۳)

ان کے انشائیوں میں زبان و بیان کی بھی خوبیاں موجود ہیں۔ ان کی تحریروں میں تلمیح کا استعمال بہت خوب ہے۔ ہر جگہ تلمیح کے معنی الگ الگ لیتی ہیں۔ تلمیح کے استعمال کا یہ خوبصورت انداز دیکھئے:

''جام جمشید کس شکل کا تھا واللہ علم بالصواب! لیکن عہد حاضر ONLINE CULTURE بجائے خود جامِ جم سے کم نہیں۔''(۲۴)

ڈاکٹر فرزانہ فرح کا ایک انشائیہ ''بقر عید کا فسانہ'' ہے۔ فطری رویوں کو شگفتگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ انسانی جذبات، احساسات ان کے مشاہدات کو بڑی خوبی کے ساتھ اپنی بات پیش کرتی ہیں۔ بقر عید کی خوشیوں، قربانی کی دھوم، چند ایک لوگوں کا اس عید پر دیکھاوا اور بکروں کی قیمتوں میں اضافہ اور باہر کے بکروں کی مانگ ان

سب کو خوشگوار انداز میں پیش کرتی ہیں۔ گھر کے ہر فرد کی فرمائش پر کھانے کی ایک ڈش، طعام کی تیاری کو بہت خوبصورت اور دلکش انداز میں تحریر قلم بند کرتی ہیں۔ اس انشائیہ میں شگفتگی کے ساتھ ساتھ بے تکلفی بے حد دلکش انداز میں بیان کی ہے۔ کہ قاری زیرِ لب مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''بقر عید پر ہم جیسی خاتون خانہ پر کئی ذمہ داریاں ہوتی ہیں ان میں سے ایک طعام کی تیاری بھی ہے۔ شوہر صاحب کو بریانی پسند ہے اور بیٹے کی فرمائش سیخ کباب ہے۔ بیٹی کو کڑھائی گوشت چاہیے۔ نند کو پائے پسند ہے۔ ساس کو نرم نرگسی کباب کی خواہش ہوتی ہے۔ یعنی اس ایوان میں ہر رکن کا بل علاحدہ ہوتا ہے۔ تھوڑا تھوڑا ہم بنانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ دسترخوان پر عجیب دھما چوکڑی کا عالم ہوتا ہے۔ شوہر صاحب ہمارے کان میں بدبداتے ہیں۔۔''یار، محبوب کے قدموں کی چاپ اور بکرے کے سینے کی چانپ کا لطف ہی اور ہوتا ہے۔''نند اپنی پلیٹ میں نعمت ہائے گوں ناگوں کا ڈھیر اٹھائے خوش ہوتی ہیں کہ۔۔۔ گوشت تو گوشت ہے، پائے بھی نہ چھوڑے ہم نے۔''(۲۵)

انشائیہ کا فن جن خصوصیات کا متقاضی ہوتا ہے، محاورے اور ضرب الامثال بھی انھیں خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔ مثلاً اختصار انشائیہ کی بنیادی خصوصیت ہے تو یہ عنصر ان دونوں کے لئے بھی وہی اہمیت رکھتا ہے۔ ایسا لگتا ہے ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہو۔ یا پھر یہ دونوں چیزیں انشائیہ نگاری کی دو بیساکھیاں ہو۔ اکثر انشائیہ نگار محاوروں اور ضرب الامثال کا جوں کا توں استعمال کرتے ہیں۔ تو بعض اپنی تخلیقیت کو کام میں لاتے ہوئے اپنی پیش کش کو چست اور دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ قاری انھیں بار بار پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''تیل تو ہم غریبوں کا نکلتا ہے جس کی چادر ''آ گا بھی کھل رہا ہے پیچھا بھی کھل رہا ہے'' کا اشتہار ہے۔ عوام کوئی یوگا گرو تو ہیں نہیں کہ جن کی کڑوروں کی جائداد اور چندہ کمپنیاں ہوں۔ نہ ہی عالمی شہرت یافتہ مذہبی رہنما کہ جن کے ''آشرم'' سے ''بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ سامان نکلا'' کے مصداق سونے چاندی کی اینٹیں اور کڑوڑوں کی دولت برآمد ہو۔ سو یہ بیچارے بنا تیل کے ہی ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔''(۲۶)

انشائیہ نگار کے پاس لفظوں کا خزانہ موجود رہتا ہے۔ وہ تہذیبی و تاریخی، نفسیاتی و شعور سے حاصل کردہ احساس کو ضائع نہیں کرتے بلکہ تجربے و مشاہدے میں ملا کر انشائی خاکہ تیار کرتے ہیں۔ پھر اسے صفحہ قرطاس پر

پھیلاتے ہیں۔اوراپنے مطلب کی معلومات اپنے اپنے انداز واسلوب سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ڈاکٹر فرزانہ فرح کے پاس انکشاف ذات کا فن بہت خوب ہے۔اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ایک حسین صبح ہماری آفس روم میں طلبی ہوتی ہے اور ہمیں ایک کاغذ کا بے جان پرزہ تھما دیا جاتا ہے۔اس پر ہماری نظر پڑتے ہی ہماری جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔دراصل یہ پرنسپل صاحبہ کی تعطیلات کی عرضی ہے۔جس میں آخر میں ہمارا نام درج ہے، جیسے''مورد چارج''ٹھہرایا جاتا ہے۔اس پر دستخط کرتے ہوئے ہمارا دل کانپ کانپ جاتا ہے۔زمانہء قدیم میں لوگ دیکھا کرتے تھے۔۔۔''کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی''اور ادھر ظلم کی انتہا یہ ہے کہ ہمیں خود اپنے موت کے پروانے پر دستخط کرنی ہوتی ہے۔قلم سے تلوار کا کام لینا کسے کہتے ہیں، یہ انہی دنوں ہم جان پہچان لیتے ہیں کیونکہ یہاں تلوار بھی اپنی ہوتی ہے اور گردن بھی اپنی۔خوب سے خوب تر کی تلاش نہ ہوتے ہوئے بھی رفتہ رفتہ ہماری نظر اس مقام پر آن ٹھہر جاتی ہیجہاں چھٹیوں کے ایام کی تفصیل ہوتی ہے۔ ہمیں اچھی طرح علم ہوتا ہے کہ کواکب کچھ ہیں، کچھ نظر ظر ہے ہیں۔دو مہینے کی تعطیلات کی درخواست کو یقیناً ایک اور مہینے کھینچ جاتا ہے۔''(۲۷)

مجموعی طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا ڈاکٹر فرزانہ فرح ایک عمدہ انشائیہ نگار ہیں۔ان کے انشائیوں میں سماجی شعور کی پختگی اور شخصیت کا بھرپور استعمال ملتا ہے۔شگفتگی اور دلکش انداز میں انشائیے تحریر کرتی ہیں۔اسلوب میں عصری آگہی ہے اور زبان و بیان کی رنگینی بھی ہے۔بے تکلفی اور بے ربطگی ان کے انشائیوں کی شان ہے۔ان کے انشائیوں کے عنوانات طویل ہیں۔موضوع کی مناسبت سے ان کے انشائیے مختصر ہوتے ہیں۔اسلوب میں روانگی ہے اور شگفتگی ہے۔تاہم انکشاف ذات کا عمل ان کی وہ خوبی قرار پاتا ہے جس سے ان کی تحریر معنوی طور پر ہونے کے باوجود دیرتا پا اثر رکھنے کی قوت رکھتی ہے۔انھوں نے انشائیوں میں طنز و مزاح کا برجستہ استعمال کیا ہے۔وہ عمومی خواتین کے برعکس ظاہری نمود و نمائش کو اہمیت دینے کے بجائے فکر و جذبات کیفیت کو پیش کرنے پر توجہ مرکوز رکھتی ہیں۔ان کی تحریروں میں فطرت ماحول، اور دیگر مظاہر کا ایک کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے انشائیوں میں شعریات کا شعوری طور پر استعمال ملتا ہے۔وہ سامنے کی بات پر گہرائی اور گیرائی پیدا کر کے قاری کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ان کے انشائیوں میں زبان و بیان کی خوبیاں بھی موجود ہیں۔انگریزی

زبان کا استعمال زیادہ کرتی ہیں اور تلمیح کا بھی۔ان کے تحریروں میں تحریف نگاری کا استعمال بھی بہت خوب ہے۔

۵.۶۔لئیق صالح (پروفیسر)

لئیق صالح ۱۰؍فروری ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد کے القعیطی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ان کے جدامجد عمر بن عوض القعیطی ناصر الدولہ کے عہد میں عرب سے حیدرآباد تشریف لاکر دکن میں سکونت اختیار کی۔لئیق صالح کا پورا نام لئیق خدیجہ ہے۔قلمی نام لئیق صالح ہے۔ان کے والد صلاح بن شجیع اور والدہ خیر النساء بیگم تھیں۔ان کے والد کو بھی علم وادب سے شغف تھا۔لئیق صالح کی نانی خود ایک شاعرہ تھیں اور ان کا تخلص باقرہ تھا۔لئیق صالح کی ابتدائی تعلیم انھیں کے زیرِ نگرانی ہوئی۔بچپن سے ہی انہیں علمی وادبی ماحول میسر ہوا۔چار سے آٹھ سال کی عمر میں انھوں نے پہلا مضمون لکھا۔اور انہیں کے منعقد جلسوں میں اسٹیج پر آنے کا موقعہ ملا۔ثانوی تعلیم نامپلی گلز ہائی اسکول سے کی۔گریجویشن ویمنس کالج ملحقہ عثمانیہ یونیورسٹی سے کیا۔ایم۔اے اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کرنے کے بعد ایم۔فیل اور پی۔ایچ۔ڈی عثمانیہ یونیورسٹی سے کی۔

لئیق صالح پیشۂ تدریس سے وابستہ تھیں۔مختلف کالجس میں درس وتدریسی کے فرائض انجام دیے۔ پھر ۱۹۸۳ء میں بحیثیت اردو لکچرر شعبہ اردو گلبرگہ یونیورسٹی میں تقرر عمل میں آیا۔ریڈر کے حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔اور ۱۹۹۵ء میں بحیثیت پروفیسر شعبہ اردو سے ایک نیا دور شروع ہوا۔۲۰۰۷ء تک شعبہء اردو کی حیثیت سے کام کرتی رہیں۔لئیق صالح کے کارناموں میں ایک اہم کارنامہ اردو نصاب میں کمپیوٹر اور صحافت کو نئی نسل کے روزگار کے لئے شامل کیا۔اس کے علاوہ SCERT اور NCPUL کی نصابی کتابوں کا سلسلہ پہلی تا چوتھی جماعت تک کرناٹک بنگلور کے زیر اہتمام تالیف کیا۔لئیق صالح کے قلیل علالت کے بعد ۲۱؍ڈسمبر ۲۰۱۷ء میں اس دنیائے فانی کو الوداع کہا۔

لئیق صالح ایک محقق،تنقید نگار،مزاحیہ اور انشائیہ نگار تھیں۔انہوں نے تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی تحریر کئے۔ان کے مضامین کا مجموعہ ''عکس در عکس'' ۱۹۹۱ء میں،''نقد وجستجو'' ۱۹۹۴ء میں،مزاحیہ مزامین کا مجموعہ ''سنی سنائی'' ۱۹۸۱ء میں،''امیر شمس الدین فیض حیات اور کارنامے'' ۱۹۸۰ء میں،''عہد ارسطو جاہ علمی و ادبی خدمات'' ۱۹۸۶ء میں،''اعظم العمرہ ارسطو جاہ'' (تدوین) اور ''خزائن الامثال'' (تدوین) اور شعبہء اردو کا ترجمہ ارغمان'' شائع ہوچکی ہیں۔

لئیق صالح کو کئی اعزازات سے نوازا گیا یو۔پی اردو اکیڈمی ۱۹۸۱ء ، آندھراپردیش اردو اکیڈمی ۱۹۸۳ء، میرا کیڈمی لکھنو ۱۹۸۶ء، بہار اردو اکیڈمی ۱۹۸۷ء اور گلبرگہ یونیورسٹی میں کرناٹک مہیلا جاگروتی

ویدک (بنگلور)، ساہتیہ اکیڈمی (بنگلور)، خواجہ ایجوکیشن سوسائٹی (گلبرگہ)، سنٹر فار ویمنس اسٹیڈیز (گلبرگہ) اور کرناٹک اردو فرنٹ (گلبرگہ) کی جانب سے مختلف اوقات میں اعزازات اور مومنٹوس عطا کئے گئے۔

لئیق صالح کا ایک انشائیہ ''سنے جاتے نہ تھے'' ہے۔اس انشائیہ میں وہ بہت دلچسپ اور شگفتہ انداز میں زیادہ باتیں کرنے والوں کا ذکر بہت عمدہ انداز میں کرتی ہیں۔جس میں انشائیہ کی ایک اہم خصوصیت ذات کا انکشاف کا اظہار بہت خوبصورت انداز میں پیش کرتی ہیں۔ملاحظہ ہو:

> ''ہاں،تو ہم بچپن میں خوب باتیں کرنے پر اپنی دادی سے یہ طعنہ سنا کرتے تھے، (اچھا ہوا زبان گوشت کی ہے ورنہ اس ٹخ ٹخ سے کبھی کے رخصت ہوجاتی) تو ہمیں یہ مقولہ اپنے سے زیادہ پھوپھوماں پر من وعن صادق نظر آتا ہے۔موضوعات کی کمی نہیں الف لیلیٰ کی داستانیں بھی اس کے آگے ہار مان لیں۔صبح سے شام تک عنوان مختلف ہوا کرتے ہیں۔
>
> ان کے حسب نسب سے زیادہ واقفیت نہیں۔بس اتنا معلوم ہے کہ وہ ایک عرصہ سے ہمارے پاس آیا جایا کرتی ہے۔جگ پھوپی جسے موجودہ ترقی یافتہ زمانہ میں انٹرنیشنل پھوپی کہہ سکتے ہیں۔ان کے آگے پیچھے کوئی نہیں،یگانہ و یکتا ہیں۔''(۲۸)

لئیق صالح کا ایک انشائیہ ''اگر میں۔۔۔!'' ہے۔اس انشائیہ میں انسان کی چاہت کا بھرپور ذکر کرتی ہیں۔اگر کچھ ہوتی تو کیا کچھ کرسکتی ہیں۔خواتین کے مسائل کو بخوبی بیان کیا۔وہ انشائیہ کی شعریات کو شعوری طور پر ملحوظ رکھتی ہیں۔ان کی تحریروں میں محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال موقع کی مناسبت سے بہت عمدہ ہیں۔جس سے انشائیہ میں قاری کی دلچسپی باقی رہتی ہے۔ان کا فنی اظہار دیکھئے:

> ''ویسے عورت بننے میں صرف چند خوبیاں پیش نظر ہوتی ہیں۔ایک تو بھاری بھرکم کپڑے، پہننے کو ملتے ہیں اور دوسرے قیمتی زیورات سوائے ان کے کوئی خاص بات نہیں۔ان کپڑوں کو پہننے کے لئے باحوصلہ ہونا ضروری ہے۔خواہ وہ کتنے ہی تکلیف دہ ہوں۔لیکن لوگوں پر اپنا رعب جمانے کے لئے اپنی دولت،شہرت اور حسن سلیقہ کی اشتہار بازی کے لئے سب کچھ گوارا کرنا پڑتا ہے۔بقول شاعر
>
> ناگوار کو بھی کرتے ہیں گوارا انسان
> زہر پر کر بھی مزہ ءشیر وشکر لیتے ہیں

رہا زیور، تو اس کے لئے بھی مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ صرف ہاتھ، پیر، اور گلے میں پہن لینا، ''عورت پن'' نہیں، اتنا تو اچھے خاصے مرد بھی پہنتے ہیں۔''(۲۹)

''حجام کا آئینہ'' لئیق صالح کا ایک انشائیہ ہے۔ اس میں وہ بہت دلکش انداز میں آئینہ کے مفہوم کو بتلاتی ہیں۔ حجام کا آئینہ وہ آئینہ ہے جس میں سب کی شکلیں دیکھائی دیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ حجام کا آئینہ سب کچھ تو ہوتا ہے لیکن آئینہ نہیں ہوتا اور اس میں سوائے عکس کے سب کچھ نظر آتا ہے۔ اس انشائیہ میں عمدہ تلمیحات، حجام کے آئینہ کے خوبصورت معنی ملاحظہ ہو:

''یہ ایک مشہور و معروف محاورہ ہے جس کے معنی لغت کے اعتبار سے یہ ہیں: یعنی بے حیائی اور بے شرمی کی جو انتہا کو پہنچ جاتے ہیں ان کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ دوسرے آئینوں میں اور حجام کے آئینہ میں اس محاورہ کے اعتبار سے بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ سکندر جس کو آئینہ کا موجد کہا جاتا ہے غالباً وہ بھی اس فرق سے آگاہ نہ ہوگا۔ اس نے تو صرف آئینہ بنا دیا اور سب پر یہ احسان کر دیا کہ اپنی حقیقت سے واقف ہو جائیں، ورنہ بہت فاش غلطیاں ہوا کرتیں۔ ویسے آئینہ کے ہونے سے کونسا فرق پڑا؟ ہر ایک اپنے آپ کو حسین ہی سمجھتا ہے، بلکہ یوسف علیہ السلام کے مثالی حسن سے اپنے آپ کو کمتر نہیں سمجھتے۔'' (۳۰)

لئیق صالح کا ایک اور انشائیہ ''بلی حج کو چلی'' ہے۔ اس انشائیہ میں پہلے کے زمانے کے لوگوں کے رہن سہن عادات و اطوار کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ لوگ بالکل اچھے تھے۔ اس وقت کا سفر جہازوں کا ہوتا تھا۔ دوران سفر اور حج کے واقعات دلچسپ انداز میں قلمبند کرتی ہیں۔ ایک واقعہ کو دکنی زبان کے انداز میں ملاحظہ فرمائیں:

''اب ذرا اہم امور کی طرف آیئے۔ ایک دن ہانپتے ہوئے اوپر آئیں حج کے لئے شاید دو دن رہ گئے تھے۔ سب نے اس غیر متوقع آمد پر پوچھ شروع کی، کہنے لگیں، ''جیسے جیسے حج قریب آے۔ مجھے ایک فخر (فکر) ہوگئی ہے۔ مولم ساب (معلم صاحب) اور ان کے بھائیوں کو کہتے وقت بولی کہ میرے لئے ایک ڈنڈا اور عینک لاویو۔ میں خود اپنے ہاتھوں سے وہ ماٹھی ملے شیطان کے آنکھ میں پتھر ماروں گی۔ اس کے دیدے پھوڑوں گی۔ تو کوئی لاکونیں دیا۔ پھر

میں بولی ہمت کر کو اپنچ کیوں نیں جانا۔ایک دن ہلو ہلو سیڑیاں اتر کو دو کانوں کی
طرف گئی۔ پوچھ لیتے پوچھ لیتے (آپ ہی غور کیجئے کہ پوچھی کیا ہوں گی، کیوں
کہ عربی زبان سے بالکل ناواقف) چلی۔ ایک جگہ مڑ کو دیکھی تو کیا ہے۔
میرے پیچھے دو تین لمبے لمبے کالے لوگاں ہیں۔''(۳۱)

لئیق صالح کا ایک اور انشائیہ ''ناز والے نیاز'' ہیں جس میں وہ شگفتگی کے ساتھ انشائیہ کی ایک خصوصیت بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر بہت عمدگی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں۔اس انشائیہ میں وہ ناز اٹھانے کے کارگر نسخہ بتلاتی ہیں اور الگ الگ طرح کے لوگ کس کس طرح ناز اٹھاتے ہیں بہت خوبصورت انداز میں تحریر قلم بند کرتی ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''ناز و نیاز کو دنیا میں لازم اور ملزوم ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ناز کس کس
کے اٹھائیں۔ عاشق بے چارے کو صرف محبوب کے ناز اٹھانے تھے تو وہ حال
کا بے حال ہو گیا۔ ہمیشہ تیوری پر نظر رکھنی پڑتی تھی ع

تیوری چڑھی ہوئی ہے اندر نقاب کے

نا جانے اس کے لئے اسے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔کبھی اس نے محبوب کی
اداؤں کے فرق کو سمجھنے میں پوری زندگی گزاری ع

غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے''(۳۲)

مجموعی طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ لئیق صالح ایک عمدہ انشائیہ نگار ہیں۔ان کے انشائیوں میں شگفتگی، بے تکلفی بہت دلکش انداز میں پائی جاتی ہے۔ان کے انشائیوں میں بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ان کے انشائیوں میں شخصیت کا بھرپور استعمال ملتا ہے وہ بات کے نئے معنی بھی بتلاتے ہیں۔ان کی تحریروں میں مزاح کے ساتھ ساتھ ہلکا سا طنز بھی پایا جاتا ہے۔وہ باتوں ہی باتوں میں حقیقیت کو دلچسپ انداز میں پیش کرتی ہیں۔ان کے اسلوب میں روانگی ہے۔موضوع کے مناسبت سے ان کے انشائیہ مختصر ہوتے ہیں۔ان کے ہاں زبان و بیان کی رنگینی بھی ہے۔وہ شعریات کا شعوری طور پر بکثرت استعمال کرتی ہیں۔وہ سامنے کی بات پر گہرائی اور گیرائی پیدا کر کے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہتی ہیں۔قاری کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔وہ روزمرہ کے الفاظ کا استعمال بہت عمدہ کرتی ہیں۔ان کے ہاں انگریزی اور فارسی زبان کے علاوہ دکنی زبان کا استعمال ملتا ہے۔تلمیحات،ضرب الامثال،محاورے کا استعمال بھی بہت خوب ہیں۔

۷.۵۔مختار احمد منو

مختار احمد نام ،اور منو قلمی نام ہیں۔ان کی پیدائش ۲۴/اپریل/۱۹۵۸ء گلبرگہ، کرناٹک میں ہوئی۔ان کے والد کا نام محمد شفیع ہے۔بی۔اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد راموجی فلم سٹی میں ای۔ٹی۔وی اردو میں اسکرپٹ رائٹر کا کام کیا، بعد از منصف، رہنمائے دکن حیدرآباد، روزنامہ ایقان گلبرگہ اور انقلاب دکن میں بحیثیت نامہ نگار خاص کالم ، نائب مدیر اعلی اور نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمت انجام دیں۔موجودہ مصروفیت روزنامہ کے۔بی۔این ٹائمز گلبرگہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں۔مختار احمد منو افسانہ نگار، خاکہ نگار، طنز و مزاح نگار اور انشائیہ نگار ہیں۔ان کی تحریریں مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہتی ہیں۔

ان کا ایک انشائیہ ''رونا بھی ایک آرٹ ہے'' ہے۔اس انشائیہ میں وہ رونے کو بہت اچھا قرار دیتے ہیں۔عورتوں اور مردوں کی رونے کی الگ الگ اقسام بتاتے ہیں۔خواتین کے رونے کی پوشیدہ وجوہات کو دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں۔اس کے علاوہ جن لوگوں کو اپنے عزیز و اقارب کے گزر جانے پر بھی ان کی آنکھ نم نہیں ہوتی ایسے رشتوں پر بھی بھرپور طنز کرتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ہم ایک مرحوم کے متعلقین کو پرسہ دینے گئے۔وہاں کے خواتین کو روتے دیکھا تو ہم بھی رو پڑے۔ہماری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر چپراسی نے ہم سے کہا آپ کیوں مفت میں اپنی آنکھوں کو زحمت آنسو دے رہے ہیں؟ مرحوم کے متعلقین بہت ہی تعلیم یافتہ ہیں وہ اس طرح رونے کے قائل نہیں اور اس کمرے میں بیٹھ کر بریانی کھا رہے ہیں۔ہم نے حیرت سے چپراسی سے کہا تمہیں کیسے معلوم؟ چپراسی نے ہم سے کہا۔۔۔اس لئے کہ یہاں میت کے پاس بیٹھی خواتین کو کرائے پر رونے کے لئے میں ہی لایا ہوں۔ہم کچھ کہنا ہی چاہ رہے تھے کہ مرحوم کے منجلے فرزند نے کہا۔۔۔کیا کریں زمانے کو دکھانا ضروری ہے۔اس لئے کہ ہم رہتے ہی ایسے سماج میں ہیں۔یہاں کے رسم و رواج کو تو اپنانا پڑے گا۔''(۳۳)

مختار احمد منو کا ایک اور انشائیہ ''وجہ بے وجہ'' ہے۔اس انشائیہ میں وہ بے وجہ کے پیچھے چھپی وجہ کو بتاتے ہیں۔ہر وہ کام جو ہماری نظر میں بلا وجہ ہوتا ہے اس کے پیچھے ایک وجہ موجود ہوتی ہیں۔اس پوشیدہ وجہ کو دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں۔اس میں انشائیہ کی ایک خصوصیت بے تکلفی کا اظہار دیکھئے:

> ''ہمارے مالک مکان جو پانچ بھٹیوں کے ابو ہیں۔وہ ہماری بیوی کو اپنی

چھٹی بیٹی مانتے ہیں۔ہم نے ان سے کہا'' بے وجہ آپ نے ہماری بیوی کو اپنی بیٹی بنالیا ہے۔ ہمیں اپنا بیٹا بنالیا ہوتا''۔ مالک مکان مسکرائے اور بولے'' برخوردار ہم نے بے وجہ آپ کی بیوی کو اپنی بیٹی نہیں بنایا ہے۔اس کی وجہ ہے۔ بیٹی کہنے سے ہمیں ناشتہ بسکٹ بنا مانگے مل جاتی ہے۔آپ کو بیٹا بنانے سے یہ سب کہاں ممکن ہے۔ برخوردار ہر بات بے وجہ نہیں ہوتی۔''(۳۴)

مختار احمد منو سماج کے مسائل سے بخوبی واقف ہیں۔وہ ''اچھے دن؟'' میں سماج میں آئے دن بڑھتی ہوئی قیمتوں اور مہنگائی کا خوبصورت انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔سیاست پر گہرا طنز کرتے ہیں۔عوام کے اچھے دن کب آئینگے دن بہ دن قیمتوں میں اضافہ آمدنی کم،خرچ بہت زیادہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کا زندگی گزارنا دشوار ہو گیا ہے۔ان کی تحریر میں انشائیہ کی ایک خصوصیت انکشاف ذات کا اظہار بہترین انداز میں ملتا ہے۔ملاحظہ ہو:

''ہم نے پیاز کے حصول کے لئے مارکٹ کا سروے کیا۔ پیاز کہیں نظر نہ آئی۔ پیاز کے لئے ترستی ہماری نظر کو ایک جگہ آخر کار پیاز دیکھائی دی لیکن پیاز اس قدر پست قد تھی کہ اس کو گھر لے جانا بیگم کی نظروں میں اپنے قد کو پست کرنا تھا۔ایک اور جگہ پیاز کے دیدار ہمیں نصیب ہوئے یہاں پیاز اس قدر خستہ حالت میں تھی کہ ہمیں ہمارے علاقہ کے اردو اسکول کی خستہ عمارت کی یاد آئی جو مانسون کی پہلی قسط میں ہی سجدہ ریز ہوگئی تھی۔ایسی خستہ حالت کی پیاز گھر لے جا کر ہم اپنی بیگم کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہونا چاہتے تھے۔'' (۳۵)

مختار احمد منو کا ایک انشائیہ ''بندر سے ایک ملاقات'' ہے۔اس انشائیہ میں بندر کے ذریعہ اپنا حال دل بیان کرتے ہوئے اشرف المخلوقات پر گہرے طنز کے تیر چلاتے ہیں۔حضرت انسان سے ایسی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں کہ ان سے شیطان پریشان اور مایوس ہے۔انسانوں کی حرکات وسکنات کی وجہ سے شیطان تو شیطان بندر بھی شرمندہ ہے۔اس انشائیہ میں مختار احمد منو شعریات کو ملحوظ رکھتے ہیں ملاحظہ ہو:

''ہم نے کہا'' بندر صاحب آپ کے یہاں تو مردوں اور عورتوں کو بھی دم ہوتی ہے۔ بندر یہ دم کا کیا کام لیتی ہے؟ بندر نے مسکراتے ہوئے کہا'' آپ کی عورتوں کی بھی تو دم ہوتی ہے جس کو آپ چوٹی کہتے ہیں۔شاعر حضرات نے تو چوٹی کو ناگن کہا ہے یا پھر زنجیر مجھے ایک شعر یاد آرہا ہے۔کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ع

پڑ گئی پاؤں میں زنجیر تو کیا

ہم تو اس کو بھی تیری زلف کا بل کہتے ہیں

بندر کا شعری ذوق دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی۔ ہم نے کہا ''جناب کو شعری ادب سے دلچسپی ہے۔ بندر نے کہا ''میں شعر نہیں کہتا مگر اچھے معیاری اشعار بہت پسند ہیں۔''(۳۶)

مختار احمد منو کی انشائیہ نگاری اور ان کے اسلوب کے بارے میں مجموعی طور پر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ بے تکلف طرز اظہار کے ساتھ ساتھ ان کی تحریر کو بامعنی اور بامقصد بناتی ہے۔ اکثر ان کا اسلوب انٹرویو کے طرز تحریر میں ہوتا ہے۔ اور ان کے انشائیوں کے عنوان بھی کچھ ملتے جھلتے ہوتے ہیں مثلاً بندر سے ملاقات اور کتے سے انٹرویو وغیرہ ہے ان کا یہ انداز تحریر مضمون کہلاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں سماج کا کرب اور مسائل ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں سنجیدگی پائی جاتی ہے اور طنز بھی۔ ان کے ہاں زبان و بیان کی لطافت بھی ہے۔ شعریات کا استعمال بھی عمدہ ہے۔

۵.۸۔منظور وقار

نام محمد منظور احمد ہے اور قلمی نام منظور وقار ہے۔۵/ڈسمبر ۱۹۵۳ء کو شہر گلبرگہ میں ولادت ہوئی۔ان کے والد محمد مشائخ ایک پر وقار شخصیت کے مالک تھے۔میٹرک تک خواجہ ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی بر داز گورنمنٹ کالج گلبرگہ سے بی۔اے کیا۔دھاور واڑ یونیورسٹی سے سیاسیات سے ایم۔اے کیا۔بیجاپور کے ایک تعلقہ میں ولیج اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔بچپن ہی سے ادب سے لگاؤ تھا۔بے۔اے کی تعلیم کے دوران ادبی ذوق کو جلا ملی اور وہ پروان چڑھا۔تعلیم کے دوران ادبی تحریری اور تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے تھے اور انعامات اور اعزازات پاتے تھے۔ان کا پہلا افسانہ ''انسانیت کی لاش'' خواجہ مشن ہائی اسکول گلبرگہ کے میگزین ''شاہین'' میں ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔تب سے لیکر اب تک ان کے سینکڑوں نثری تخلیقات رسائل اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

منظور وقار کی پہلی تصنیف ''ہنسنا منع ہے'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔افسانوں کا مجموعہ ''کانٹوں کا جھنڈ'' ۲۰۱۵ء، طنز ومزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ ''مسکرانہ منع ہے'' ۲۰۱۹ء، پچاس خاکوں پر مشتمل کتاب ''ورق ورق چہرے'' ۲۰۲۱ء میں شائع ہوئی۔منظور وقار کے مضامین، افسانے، خاکے، افسانچے اور انشائیہ ملک اور بیرون ملک کے ادبی رسائل میں تواتر سے شائع ہوا کرتے ہیں۔عزیز اللہ سرمت صاحب کا اخبار روزنامہ ''بہمنی نیوز گلبرگہ میں منظور وقار کا کالم ''غبار راہ'' دس برس تک ابلاغ شائع کرتا تھا۔

منظور وقار کا ایک انشائیہ ''چنے کا جھاڑ'' ہے۔اس انشائیہ کی تمہید جھاڑو کے ذکر سے باندھتے ہیں۔جھاڑوں کے اقسام گنواتے ہوئے۔چنے کا جھاڑ کا ذکر کرتے ہیں۔چنے کا جھاڑ کو محاورا کہتے ہیں۔چنے کا جھاڑ کہاوت ہے۔چنے کی جھاڑ کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔یہ کہاوت کب کب اور کہاں استعمال ہوتی ہے۔اور حاضر سے لے کر تاریخ کا ذکر اس انشائیہ میں کرتے ہوئے نصیحت کرتے ہیں کہ چنے کے جھاڑ پر چڑھنے والوں کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے۔یہ خوبصورت انداز ملاحظہ ہو:

> ''فرعون کو اس کے غرور اور تکبر نے چنے کے جھاڑ پر ایسا چڑھایا کہ وہ حضرت موسی علیہ کا مزاق اڑانے لگا انہیں طرح طرح کی تکلیفیں دینے لگا خود کو خدا سمجھنے لگا انجام فرعون اپنی فوج اور چنے کے جھاڑ کے ساتھ دریائے نیل میں غرق ہو گیا۔قوم نوح قوم عاد قوم ثمود اور قوم لوط یہ وہ نافرمان خود سر دجاہل اور مغرور قومیں ہیں جو اپنے وقت کے پیغمبر کی باتوں کا مذاق اڑایا اور اپنے غرور اور تکبر کی وجہ سے چنے کے جھاڑ پر بیٹھ گئے ان کا عبرتناک انجام ہوا اس سے ہم

سب واقف ہیں۔''(۳۷)

منظور وقار کا ایک اور انشائیہ ''چائے کی چاہت'' ہے۔اس انشائیہ میں وہ چائے پینے والوں کا ذکر کرتے ہوئے چائے کی ابتداءاور ماضی میں چائے کی چاہت رکھنے والوں کا بہت خوبصورت انداز میں ذکر کرتے ہیں۔چائے کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ چائے ایک مشروب نہیں بلکہ ایک تہذیب ایک رسم، اچھے اخلاق اور مہمان نوازی کا نام ہے۔اس انشائیہ میں انشائیہ کی ایک خصوصیت بے ربطگی کو پرکشش انداز میں ذکر کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

''برق رفتاری کے ساتھ دوڑتی ہوئی ٹرین میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر چائے کے گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے باہر کا نظارہ کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ادھر چائے حلق میں اترنے لگتی ہے ادھر آنکھوں کے سامنے ہرے بھرے درخت، کھیت کھلیانوں میں لہلہاتی فصل، اونچے اونچے پہاڑوں کے مناظر دوڑنے لگتے ہیں، جب یہی ٹرین بڑے شہروں کے ریلوے اسٹیشنوں کے قریب پہنچنے لگتی ہے تو ٹرین کی دونوں جانب غلیظ اور گندگی جھوپڑ پٹیوں کوڑا کڑکٹ اور غلاظت کے ڈھیڑ والے مناظر مسافروں کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں تو ان کی سانسوں کو تعفن اور بدبو کی خوشبو سے معطر کرتے ہیں۔ امیر لوگ اپنے بچوں کو اصلی گھی میں بنے پراٹھے مکھن لگے ٹوسٹ کا ناشتہ کرا کے ہائی ٹیک اسکول بھیجتے ہیں۔غریب اور مزدور پیشہ لوگ اپنے بچوں کو ایک کپ چائے اور ڈبل روٹی کے خشک ٹکڑوں کا ناشتہ کرا کے سرکاری اسکول کو روانہ کرتے ہیں۔''(۳۸)

''قصہ سیکل سواری کا'' اس میں منظور وقار اپنے کالج اور ملازمت کے ابتدائی باتوں اور دلچسپ واقعات سے واقف کراتے ہیں۔اور ایک دور میں سیکل رکھنے والوں کا شمار خوش حال لوگوں میں ہوا کرتا تھا۔اس دور میں سیکل کی بہت اہمیت تھی جہیز میں بھی سیکل کا مطالبہ کیا جاتا تھا ایسے دلچسپ واقعات کا ذکر کرتے ہیں انشائیہ کی خصوصیت ذات کا انکشاف کو بہت دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں۔

''ہوا یہ کہ جب ہم نے عقل کے بجائے نقل سے پاس ہو کر اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جب کالج میں داخلہ لیا تو اچانک ہمارے دماغ پر غرور اور تکبر کے جراثیم کا قبضہ ہو گیا۔ ہمارے بال، ہمارا لباس اور چال ڈھال کا انداز یکسر بدل گیا۔ یہاں تک کے ہم پیدل چلتے ہوئے کالج پہنچنا اپنی کھلی توہین

تصور کرنے لگے، کیوں کہ ہم کالج کے طالب علم (College Student)
جو بن گئے تھے۔ لہذا ہم کالج میں داخلہ لینے کے فوراً بعد والدین کو پہلی اور
آخری وارننگ ایک ساتھ دیتے ہوئے للکارا، آپ ہمیں فلپس کمپنی کی نئی سائیکل
دلا دیں ورنہ ہم کالج کو خیر آباد کہہ کر اجمیر ہوٹل میں نوکری کریں گے۔ جہاں
ہمیں صبح تہاری تو دوپہر بریانی کھانے کو ملے گی۔''(۳۹)

مجموعی طور پر منظور وقار کے انشائیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان کا اسلوب رواں اور سادہ ہے۔ وہ ایک صاحب مطالعہ شخص ہیں۔ اس کا اپنی تہذیب اور ثقافت سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ ان کے تجربات اور مشاہدات کی آمیزش اور متخیلہ کی رنگ آمیزی ان کی تحریروں میں جان پیدا کر دی ہے۔ ان کے انشائیوں کا اسلوب دوسروں سے مختلف ہے۔ وہ موضوع کی تمہید باندھتے ہیں اور موضوع سے متعلق بکثرت معلومات پیش کرتے ہیں۔ ان کے انشائیے طوالت اور بیجا معلومات کی وجہ سے ان کی تحریروں میں کہیں کہیں بوجھل پن محسوس ہوتا ہے ان کے انشائیے مضامین کے طرز میں ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں ذات کا انکشاف عمدہ ہے۔ ان کی تحریروں میں خیال آرائی کا حسن بھی ہے۔ بے ربطگی اور شگفتگی کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں زبان و بیان کی خوبیاں بھی موجود ہیں۔ مثلاً تشبیہات، محاورات، ضرب الامثال وغیرہ کا استعمال عمدہ ہے۔

۵.۹۔محمد عبدالقادر ادیب

عبدالقادر ادیب ۶/اکٹوبر ۱۹۲۴ء کو گلبرگہ میں پیدا ہوئے۔تعلیم بی اے، ایل ایل بی عثمانیہ سے حاصل کی۔ بنیادی طور پر ادیب ہیں۔انشائیہ نگار، مزاح نگار اور ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ان کی مختلف تحریریں، مختلف رسائل میں شائع ہوتی ہیں۔ان کی تصانیف ''نقار خانے میں'' انشائیوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ان کے انشائیوں کے بارے میں مجتبیٰ حسین کچھ اس طرح تحریر کرتے ہیں:

> ''ادیب صاحب کی یہ ادا بھی قابل تحسین ہے کہ انہوں نے کسی خاص انشائیہ نگار کے اسلوب کی تقلید نہیں کی ہے بلکہ اپنے انداز بیان کو منفرد رکھا ہے۔ سیدھے سادے جملے بے باکی کی حدوں کو چھوتا ہوا بے تکلفانہ انداز دلنشین پیرایہ اور بیجا نصیحتوں اور مصلحتوں سے گریز۔یہیں ان کے اسلوب بیان کا طرہ امتیاز ہے۔وہ جس بات کو جس طرح محسوس کرتے ہیں اسی طرح بیان کر دیتے ہیں۔ایک دیانت دار ادیب اور انشائیہ نگار کے لئے یہ بہت بڑا وصف ہے یہیں وجہ ہے کہ ان کے انشائیوں میں بڑی روانی اور دل کو موہ لینے والی ایک عجیب سی دلکشی ہے۔
>
> ان کے انشائیوں میں جا بجا اردو زبان اور اردو تہذیب سے ان کی محبت کا پرتو جھلکتا ہے۔انہوں نے نہ تو اردو زبان کی کسمپرسی کا رونا رویا ہے اور نہ ہی اس کا نوحہ لکھا ہے البتہ بڑی ہوشیاری اور چابکدستی کے ساتھ خود اردو والوں کے غیرت کو للکارا ہے اور ایک غیر محسوس طریقہ سے ان پر یہ حقیقت واضح کی ہے۔'' (۴۰)

محمد عبدالقادر ادیب کا انشائیہ ''علی بابا چالیس چور'' ہے۔اس انشائیہ میں وہ چالیس کے ہندسے کے کئی ایک معنی بتلاتے ہیں۔الف لیلیٰ کی کہانی سے علی بابا چالیس چور کو اخذ کیا گیا۔اس انشائیہ میں چالیس پر بہت زور دیتے ہوئے تحریر قلم بند کرتے ہے۔ چالیس کے ہندسے کی خوبیاں بتاتے ہیں مثلاً چالیس چور، عمر چالیس سال، چہلم اور چھلے کی دعوت چالیس دن، چالیس گاؤں کے فقیر وغیرہ چالیس کے مرھٹی میں چالیس کو ''چاڑیس'' کہا جاتا ہے عینک کو بھی چاڑیس کہا جاتا ہے۔اس طرح چالیس کے بارے میں بتاتے ہوئے انشائیہ کی ایک اہم خصوصیت ذو دہضم کو بہت دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں۔ملاحظہ ہو:

> ''علی بابا نے اپنے بیٹے کی شادی اپنے ہی گھر کے کنیز مرجانیہ سے کر دی،

اس طرح ایک کنیز کو گھر کی بہو بنا کر گھر اور سماج میں اس کا سر بلند کر دیا۔ اور عورت کو پستی سے بلندی پر پہنچا دیا۔ بالکل اسی طرح لینن نے عورت کو پستی سے نکالا اور سماج میں باعزت جگہ دے دی چنانچہ عورتوں کو کوٹھوں سے نکالا اور قوم کے نوجوان بیٹوں سے بیاہ رچا کر کئی گھر بسا دیئے اس طرح سماج کو گندگی سے پاک کیا۔''(۴۱)

محمد عبدالقادر ادیب سماج پر گہری نظر رکھتے ہیں ان کا دل سماج کی برائیوں کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔ سماج کا کرب ان سے برداشت نہیں ہوتا۔ اپنے انشائیوں کے ذریعہ وہ سماج کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ جب انشائیہ نگار سماج کی کسی برائی پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے تو کھل کر سماج کی برائی نہیں کرتا بلکہ اشاروں اور کنایوں کے ذریعہ اپنی بات کہہ دیتا ہے یا پھر اپنی بے بسی کو وہ طنز کے ہلکے سے تیر چلاتے ہوئے ظاہر کرتا ہے۔ ادیب کا انشائیہ ''کڑوا کریلا'' کا یہ اقتباس دیکھئے:

''کل تک چڑ چڑے پن کی وجہ سے جو شخص ناپسندیدہ تھا۔ آزادی کے بعد بعض سیاسی جماعتوں نے اس کو اپنے سر پر بٹھا کر پسندیدہ بنیاد یا گویا جو کل تک گونگا تھا، اس کے منہ میں زبان دیدی اور ساتھ ہی تاثیر بھی، جو کل تک گمنامی کی غار میں پڑا ہوا تھا، اس کے سر پر شہرت کا تاج رکھ دیا۔ جو شخص کل تک اکیسٹرا کا رول ادا کرتا تھا اس کو ہیرو بنا دیا، بعض سیاسی جماعتیں خود اپنے بٹوارے تک یہی کرتی رہی اور ایسے افراد کو چنا جو سماج میں نکمے، ناکارہ، اور کڑوے کریلے سمجھے جاتے تھے ان کو نہ صرف آنکھوں پر بٹھایا بلکہ راج گدی پر سلا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے لوگ بے فیض رہے، زیادہ صحیح نہیں۔ ان کی فیض بخشی لمیٹڈ کمپنی کی طرح تھی۔'' (۴۲)

محمد عبدالقادر ادیب ایک اچھے انشائیہ نگار ہیں اور انشائیہ کی شعریات کی شعوری اور غیر شعوری طور پر ملحوظ رکھتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔ ان کے انشائیے ہلکے پھلکے اور بہت عمدہ ہے۔ مثلاً محاوروں اور ضرب الامثال روزمرہ الفاظ اور تلمیح کا استعمال بہت خوب ہیں یہ دیکھئے:

''کانا راجہ بھی یہیں کہتا تھا۔ اگر دنیا سے شر کو مٹانا ہو تو بنی آدم کو دونوں آنکھوں سے محروم کر دو، فصاد کی یہ آگ نار نمرود کی طرح ٹھنڈی ہو جائے گی اور دنیا دیکھتے ہی دیکھتے گل وگلزار ہو جائیگی۔ آنکھ ہی فتنہ اور فصاد کی جڑ ہے۔ ان میں ہر دم نئے فتنے بیدار رہتے ہیں، ایک کو ختم کرو دوسرا آنکھوں سے ابل پڑتا

ہے۔اسی لئے چشمہ بدور کہہ کراس کی فتنہ گری کا ٹوٹکا کیا جاتا ہے۔'' (۴۳)

انشائیہ لفظ انشاء سے مشتق ہے جس کے معنی نئی بات کہنا یا بات سے بات پیدا کرنا وغیرہ ہے۔ یہاں انشائیہ نگار اپنی بات کو کہنے کے لئے نئے معنی بھی خود بتاتے ہے۔محمد عبدالقادر ادیب بھی انشائیہ ''باغ تماشہ'' میں اپنی ذات کا انکشاف کرتے ہیں۔غور کریں:

''آموں کے باغ کو دیکھا تو دل باغ باغ ہوگیا۔ کیوں نہ ہوان کے والد مرحوم نے بہت سے آموں کے درختوں کو اپنے خون پسینے سے اور بعض درختوں کو خالص دودھ سے سینچا۔کہا جاتا ہے کہ ان آموں سے دودھ ملائی کی سی بو آتی تھی۔شاید یہی وجہ تھی کہ اس باغ کے آموں کی دور دور تک شہرت تھی اور شہنشاہِ انگلستان کے دربار تک ان آموں کی رسائی تھی۔ پتہ نہیں مرحوم کی زندگی میں یہ آم حضور رس ہوگئے تھے یا ان کی زندگی کے بعد۔'' (۴۴)

ڈاکٹر محمد علی اثرؔ عبدالقادر ادیب کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''عبدالقادر ادیبؔ شہر بنگلور کے کہنہ مشق شاعر اور سلجھے ہوئے انشائیہ نگار اور پیشے کے اعتبار سے وکیل ہیں۔انہیں مقدمات کی پیروی کے سلسلے میں مختلف لوگوں کی افتادِ طبع، جذبات اور نفسیات کا ژرف نگاہی کے ساتھ مطالعہ کرنے کے موقع میسر آتے ہیں۔زندگی کے گہرے تجربات کی دھیمی آنچ سے احساس کا آنچل آہستہ آہستہ سلگنے لگتا ہے تو تخلیق فضا میں مختلف رنگوں کی پھوٹ سے قوس قزاح کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔قوس قزح کی یہ ست رنگ کیفیت خود عبدلقادر ادیبؔ کی زندگی بھی ہے۔ان کی سدا بہار شخصیت چنبیلی کی چھاؤں تلے سانس لیتی ہوئی کائنات کی طرح ہمیشہ خوش بو بکھیرتی رہتی ہے۔لیکن ان کے انشائیوں میں زندگی کا کرب، احساس کی اذیت محسوس ہوتی ہے۔انہوں نے نگارخانہء حیات کی لذت محسوس کیا ہے، زندگی کی اذیت کو، کرب اور درد کو قریب سے پہچانا ہے۔'' (۴۵)

اگر ہم انشائیہ کے مجموعی مزاج کو مدنظر رکھیں تو محمد عبدالقادر ادیبؔ کے انشائیوں میں غیر رسمی طریقہ کار با کثرت پایا جاتا ہے۔ان کے یہاں بات سے بات نکالنے کا ہنر بھی ہے اسلوب رواں اور سادہ ہے کہ کہیں بوجھل پن پیدا نہیں ہوتا۔وہ ایک صاحب مطالعہ آدمی ہے ان کا اپنی تہذیب اور ثقافت سے رشتہ بہت گہرا تھا۔تجربات اور مشاہدات کی آمیزش اور متخیلہ کی رنگ آمیزی نے ان کی تحریر میں جان پیدا کردی ہے اسی لئے ان کے انشائیہ قاری

باذوق وشوق مطالعہ کرتے ہیں۔انشائیہ کی تاریخ میں ان کا بھی نام ضروری ہے۔ان کی تحریریں نہ صرف بھرپور اثر رکھتی ہیں بلکہ سوچ کو بھی متاثر کرتی ہیں۔انہوں نے اپنے انشائیوں میں زبان و بیان کو بھی پرلطف انداز میں پیش کیا ہے۔مثلاً تشبیہ، تلمیح، کہاوتیں اور محاورات کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ روزمرہ الفاظ کا استعمال بھی بہت خوب ہے۔

کرناٹک میں اردو نثر کے فروغ اور ارتقاء کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اردو کے ابتداء ہی سے ریاست میں تخلیق کاروں نے بڑی محنت سے اسے سنوارا ہے۔اس عہد کے ادیبوں نے تاریخی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو ادب کی ثروت میں اضافہ کیا ہے۔کرناٹک ہمیشہ ہی سے اردو ادب کے لئے سرسبز و شاداب رہا ہے یہاں انشائیہ کی بھی آبیاری بھی ہوئی ہے۔

اردو انشائیہ بیسویں صدی کی شروع کی دہائیوں میں اُبھر کر سامنے آتا ہے۔اس دور میں شعوری اور غیر شعوری طور پر ان گنت انشائیے لکھے گئے جو کبھی مضمون، پرسنل ایسے، یا لائٹ ایسے کی حیثیت سے تحریر ہوئے تو کبھی انشائیے لطیف کے اہم ادبی شہہ پاروں کے طور پر بھی انھیں پہنچانا گیا۔انشائیہ نگاروں نے قاری کے ذہن میں اتر کر اسے مختلف پہلوں پر منفرد زاویہ نظر سے دیکھنے پر مجبور کیا اور ان کی تحریریں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج بھی زندگی میں ہزاروں رہ گزر ایسی ہیں جن تک ہم پہنچ نہیں پاتے۔انشائیہ نگار یہاں قاری کا بہترین رہنما ثابت ہوتا ہے اور یہی مرکزیت تمام اصناف ادب میں وہ بلند مقام حاصل کرتی ہے جو دوسرے نثر نگاروں کو نصیب نہیں ہوتی۔

اس صنف ادب میں زبان سازی کے اعتبار سے بھی اور خیال آفرینی کے نقطہ نظر سے بھی بیشتر نثر نگاروں نے اس صنف میں طبع آمائی کی ،جس طرح اردو کے تقریباً سبھی شعراء نے غزل کی آبیاری کی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ کامیاب رہے اور کچھ ناکام۔اسی طرح انشائیہ میں بھی کچھ کامیاب رہے اور کچھ ادیبوں نے انشائیہ نما کی سی تحریریں فرمائی۔

اس باب میں کرناٹک ریاست کے متفرق انشائیہ نگار شامل ہیں جن میں وہ خواتین اور حضرات بھی جو باقاعدہ انشائیہ نگار تسلیم کئے گئے اور جن کا انشائی سفر جاری ہے۔اور ایسے بھی انشائیہ نگار ہیں جو چند انشائیہ تحریر کرنے کے بعد مصروفیت کے باعث یا مہلت نہ ملنے کی وجہ سے انشائیہ کا سفر آگے جاری نہ رکھ سکے ایسے انشائیہ نگاروں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ان کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔چونکہ انشائیہ کی تاریخ میں ان کا ذکر ضروری ہے۔اس لئے اس باب میں ایسے انشائیہ نگاروں کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے جنہوں نے انشائیہ کے ارتقاء میں بھرپور تعاون کیا وہ یہ ہیں امجد علی فیض، حلیمہ فردوس، رزاق اثر شاہ آبادی، رؤوف خوشتر، فرزانہ فرح، عبدالقادر ادیب، لئیق صالحہ، مختار احمد منو، منظور وقار۔

کیرالا ہی ایک ایسی واحد ریاست ہے جہاں ہر ادنی واعلی ہر خاص و عام ہر برادری کے لوگ ایک ہی زبان یعنی سب کی مادری زبان ملیالم ہے۔ یہاں کے لوگ پڑھے لکھے ہیں ایسی ریاست میں کوئی دوسری زبان کا ترقی کرنا بہت مشکل ہے باوجود اس کے اردو زبان میں اپنی مٹھاس یہاں قائم کر چکی ہے۔ کیرالا میں بھی دیگر علاقوں کی طرح موجودہ دور میں اردو ادب پھل پھول رہا ہے۔تامل ناڈو کو اگر چہ اردو کے متعارف مراکز میں شمار نہیں کیا جاتا لیکن اس کے باوجود اس خطہ کی جو تاریخ سامنے آتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربی فارسی اور اردو ادب وشعر کے سلسلے میں یہاں کے اہل قلم اور فنکاروں کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔لیکن یہاں عصر حاضر میں انشائیہ میں پہل نہیں ہوئی ہے۔ہمیں امید ہے کہ وہاں بھی انشائیہ کی آبیاری ہوگی اور اس صنف سخن کو بام عروج تک پہنچائیں گے۔

****

حواشی

(۱) کفایت شعاری زندہ باد، امجد علی فیض، شگوفہ ڈسمبر ۱۹۹۰ء، صفحہ۔۴۱

(۲) کرائے کے قفس میں، امجد علی فیض، شگوفہ جون ۱۹۹۵ء، صفحہ۔۱۷

(۳) ھوئی اڈھ، امجد علی فیض، شگوفہ ستمبر ۱۹۹۳ء، صفحہ۔۲۳، ۲۴

(۴) تیمور ثانی، امجد علی فیض، شگوفہ سالنامہ فروری ۱۹۹۵ء، صفحہ۔۹۷

(۵) کفایت شعاری زندہ باد، امجد علی فیض، شگوفہ ڈسمبر ۱۹۹۰ء، صفحہ۔۴۳

(۶) ہم کہاں کے دانا ہیں، ڈاکٹر حلیمہ فردوس، شگوفہ اپریل ۲۰۱۵ء، صفحہ۔۳۶، ۳۷

(۷) تالیاں، ڈاکٹر حلیمہ فردوس، شگوفہ سووینیر نومبر ۱۹۹۷ء، صفحہ۔۳۹

(۸) لوہم بھی ڈاکٹر بن گئے، ڈاکٹر حلیمہ فردوس، شگوفہ اپریل ۱۹۹۶ء، صفحہ۔۲۳

(۹) جھینگر کا اعلان شرافت، ڈاکٹر حلیمہ فردوس، ظرافت۔۲۴، ۲۵ خصوصی شمارہ، ترجمان خوشی کرناٹک، صفحہ۔۸۷، ۸۸

(۱۰) پیشے ہی پیشے، ڈاکٹر حلیمہ فردوس، شگوفہ حیدرآباد، ستمبر ۱۹۹۷ء، صفحہ۔۱۳۱

(۱۱) لوہم بھی ڈاکٹر بن گئے، ڈاکٹر حلیمہ فردوس، شگوفہ اپریل ۱۹۹۶ء، صفحہ۔۲۳

(۱۲) چوٹی کانفرنس، رزاق آثر شاہ آبادی، شگوفہ فروری ۲۰۱۶ء، صفحہ۔۴۴

(۱۳) خدا جھوٹ نہ بلوائے، رزاق آثر شاہ آبادی، شگوفہ اگست ۲۰۱۵ء، صفحہ۔۳۸

(۱۴) گھانس کاٹنا ہمیں بھی آتا ہے، رزاق آثر شاہ آبادی، ماہ نامہ شگوفہ ڈسمبر ۲۰۱۵ء، صفحہ۔۳۶

(۱۵) مال مسروقہ، رزاق آثر شاہ آبادی، شگوفہ مارچ ۱۹۹۵ء، صفحہ۔۴۴

(۱۶) گول انڈا، رزاق آثر شاہ آبادی، ماہ نامہ شاعر فروری ۲۰۱۶ء، صفحہ۔۶۵

(۱۷) ادبی محاذ، رؤف خوشتر، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۲ء، صفحہ۔۱۹

(۱۸) دیوانِ آم، رووٴف خوشتر، آنکھ بیتی، صفحہ۔۹۲

(۱۹) خرفروشی، رووٴف خوشتر، شگوفہ جنوری ۲۰۱۷ء، صفحہ۔۵۱

(۲۰) نکّو رے باوا نکّو، رؤف خوشتر، شگوفہ سالنامہ ۲۰۱۳ء، صفحہ۔۳۷

(۲۱) تیرا گانا، رؤف خوشتر، آنکھ بیتی، صفحہ۔۴۱

(۲۲)دل کا راستہ،ڈاکٹر فرزانہ فرح،شگوفہ ڈسمبر ۲۰۱۶ء،صفحہ۔۳۸

(۲۳)کار جہاں دراز ہے،ڈاکٹر فرزانہ فرح،شگوفہ مارچ ۲۰۱۳ء،صفحہ۔۱۳

(۲۴) دل کا راستہ،ڈاکٹر فرزانہ فرح،شگوفہ ڈسمبر ۲۰۱۶ء،صفحہ۔۳۸

(۲۵) بقرعید کا فسانہ،ڈاکٹر فرزانہ فرح، دیکھنا تحریر کی لذت،صفحہ۔۴۲

(۲۶) آ تجھ کو بتاؤں تدبیر زماں کیا ہے،ڈاکٹر فرزانہ فرح، ماہ نامہ شگوفہ اگست ۲۰۱۱ء،صفحہ۔۱۹

(۲۷) انساز کا ساز،ڈاکٹر فرزانہ فرح، دیکھنا تحریر کی لذت،صفحہ۔۵۳

(۲۸)سنے جاتے نہ تھے،لئیق صالح،سنی سنائی،صفحہ۔۸۷،۹۷

(۲۹)اگر میں۔۔؟،لئیق صالح،شگوفہ مارچ ۱۹۷۸ء،صفحہ۔۱۱

(۳۰)حجام کا آئینہ،لئیق صالح،سنی سنائی،صفحہ۔۲۰

(۳۱)بلی حج کو چلی،لئیق صالح،شگوفہ جنوری ۱۹۹۷ء،صفحہ۔۷۷

(۳۲)ناز والے نیاز،لئیق صالح،سنی سنائی،صفحہ۔۴۳

(۳۳)رونا بھی ایک آرٹ ہے،مختار احمد منو،ظرافت شمارہ نمبر۔۱،ترجمان خوش دلان کرناٹک،صفحہ۔

۶۸

(۳۴)وجہ بے وجہ،مختار احمد منو، ہند سماچار جالندر،۲۵/جون/۲۰۰۶ء

(۳۵) اچھے دن؟،مختار احمد منو، کے۔جی۔ایم ٹائمز گلبرگہ ۲۰/ستمبر/۲۰۱۸ء

(۳۶)بندر سے ملاقات،مختار احمد منو،منصف،۷/فروری/۲۰۰۴ء

(۳۷) چنے کا جھاڑ،منظور وقار،روزنامہ سالار بنگلور،۲۶/جون/۲۰۱۹ء

(۳۸) چائے کی چاہت،منظور وقار،روزنامہ صحافی دکن حیدرآباد،۸/جون/۲۰۲۰ء

(۳۹) قصہ سیکل سواری کا،منظور وقار،روزنامہ آگ،۲۶/مئی/۲۰۲۱ء

(۴۰)خوشگوار آواز،مجتبیٰ حسین،نقار خانے میں،صفحہ۔۱۰،۱۱

(۴۱)علی بابا چالیس چور،نقار خانہ میں،محمد عبدالقادر ادیب،صفحہ۔۳۷

(۴۲)کڑوا کریلا،محمد عبدالقادر ادیب،نقار خانے،صفحہ۔۴۱،۴۲

(۴۳)اندھوں میں کانا راجہ،محمد عبدالقادر ادیبؔ،نقار خانے میں،صفحہ۔۵۳

(۴۴) باغ تماشہ،محمد عبدالقادر ادیبؔ،نقار خانے میں،صفحہ۔۸۷،۸۸

(۴۵) عبدالقادر ادیب۔۔بحیثیت انشائیہ نگار،مرتب ڈاکٹر محمد علی اثرؔ،جنوب کا شعر وادب (علیم صباء

نویدی کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا انتخاب)، صفحہ۔ ۱۳۵، ۱۳۶

******

ماحصل

جنوبی ہند میں اردو ادب کی سرزمین ہمیشہ ہی زرخیز رہی ہے۔اس سرزمین میں کئی ایک جواہر پارے اپنی پوری آب وتاب سے چمک رہے ہیں۔آزادی کے بعد بھی کئی قلم کاروں نے اپنی تحریر کے ذریعہ اس سرزمین کو سرسبز وشاداب بنایا ہے اور بنا رہے ہیں۔تلنگانہ،آندھراپردیش،کرناٹک،تامل ناڈواور کیرالا ریاستوں کے ادیبوں نے اپنی اپنی تحریروں کے ذریعہ علمی وادبی اصلاحی کاوشوں سے ادبی خدمات انجام دیں اور انشائیہ کوفروغ دیا ہیں۔

ملا وجہی کو جنوبی ہند کا پہلا انشائیہ نگار مانا جاتا ہے چونکہ ملاّ وجہی کے انشائیے بیکن کی جدت طرازی سے میل رکھتے ہیں۔ملا وجہی نے جدت طرازی کی جستجو میں ایک نئی تصنیف اور ایک نئی صنف کی بنیاد ڈالی اس کو انشائیہ کا نام بعد میں ملا۔اتفاق یہ ہوا کہ جس وقت مونٹین (Montaigne) نے اس صنف ادب کا آغاز کیا اسی وقت دکن میں ملا وجہی ''سب رس'' تحریر کررہے تھے۔Montaigne نے اپنی تحریروں کو (Essais) کا نام دیا تھا۔ وہ اپنے قارئین سے کہتا ہے کہ اس کتاب میں میرے پیش نظر شخصی اور ذاتی زندگی کے سوا کچھ نہیں۔میں نے ایسیز (Essais) عزیزوں کی تسکین اور خوشنودی طبع کے لئے لکھے ہیں تا کہ میرے مرنے کے بعد وہ مجھے یاد رکھیں۔

انشائیہ کے بانی مونٹین نے تو اس صنف کو انسانی شخصیت کے اظہار کا لازمی جز قرار دیا ہے۔انشائیہ نگار قاری میں اپنے دوست کو تلاش کرتا ہے۔اسی طرح ملا وجہی نے ''سب رس'' کے انشائیوں میں قاری کو اپنا دوست بنا کر زندگی کے نشیب وفراز کو سمجھایا ہے۔محمد حسین آزاد نے اپنی تحریروں کو نئے طرز میں تحریر کیا اور زبان وبیان کا نیا رنگ قارئین کے سامنے ظاہر کیا۔جس کی وجہ سے انھیں بہترین انشاء پرداز قرار دیا گیا۔راقمہ نے جنوبی ہند کے انشائیہ نگاروں کے انشائیے مونٹین کی تحریروں کی روشنی میں اور محمد حسنین کے اس خیال پر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔محمد حسنین نے محمد حسین کے دیباچے نیرنگ خیال میں اسی طرح تحریر فرماتے ہیں۔''زبان انگریزی بھی مضامین عاشقانہ قصہ وافسانہ اور مضامین خیالی سے مالا مال ہے مگر کچھ اور ڈھنگ سے۔اس کا اصل اصول یہ ہے کہ جو سرگزشت بیان کرے اس طرح ادا کرے کہ سامنے تصویر کھینچ دے اور نشتر اس کے دل پر کھٹکے۔اسی واسطے خیالی پھول پتے اتنے ہی لگاتے ہیں جتنے اصل ٹہنیوں پر سجتے ہوں نہ کہ شاخ وشجر سب غائب ہوجائیں۔فقط پتوں کا ڈھیر ہی رہ جائے۔بے شک فن انشاء اور لطف زبان تفریح طبع کا سامان ہے۔۔۔میں نے انگریزی انشاء پردازوں کے خیالات سے اکثر چراغ روشن کیا ہے۔۔۔انگریزی میں بڑے انشاء پرداز وہی کہلاتے ہیں جن کی چشم سخن ہر بات کا قصوں پر اشارے کرتی جائے۔''

اردو انشائیوں میں ہر طرز کی تحریریں ملتی ہیں اکثر انشائیہ نگاروں کے یہاں انشائیہ کی جو اہم تکنیک ہے وہ شخصی یا انکشاف ذات ہے۔ بعض انشائیہ نگاروں کے یہاں یہ خصوصیت خارجی اور غیر شخصی ہے تو بعض کے یہاں بالکل ہی نہیں ہے۔ چند ایک ایسے انشائیہ نگار ہیں جن کے انشائیوں میں ذات کا انکشاف بہت خوبی کے ساتھ ہوتا ہے۔ چند ایک ایسی تحریریں بھی ملتی ہیں جو ایک ہی مختصر لائن میں ایک جملے میں ہی اپنی شخصیت کا اظہار کر دیتے ہیں۔ مثلاً مجھے زمین بہت پسند ہے وغیرہ۔ میرے خیال میں انشائیہ چاہے جس کسی بھی انداز میں تحریر کریں اس میں شخصی یا انکشاف ذات کا ہونا لازمی ہے چونکہ انشائیہ نگار کسی موضوع کے بارے میں اپنے ذاتی خیالات و جذبات اور روداد و مشاہدات کو خوبصورت الفاظ کے ذریعہ بیان کرتا ہے تو بالکل نئی نئی باتیں سامنے آتی ہیں اس لئے ذات کا انکشاف ضروری ہے۔

اردو میں کامیاب انشائیوں کا سلسلہ اس وقت متوجہ کرتا ہے جب رشید احمد صدیقی نے اپنے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کے ذریعہ اردو انشائیہ میں شہرت حاصل کی جس کے بعد جنوبی ہند کے تقریباً تمام طنز و مزاح نگاروں نے انشائیہ کی طرف توجہ دی۔ خاص طور پر زندہ دلان حیدرآباد کے ادیب اور قلمکاروں نے طنزیہ و مزاحیہ انشائیہ کو فروغ دیا۔ لیکن اس سے نقصان یہ ہوا کہ انشائیہ پر طنز و مزاح کا غلبہ زیادہ ہوا جس سے انشائیہ اپنا اصلی مفہوم سے دور ہوتا گیا۔ اکثر مصنفین نے یہ سمجھا کہ طنزیہ یا مزاحیہ تحریریں ہی انشائیہ نگاری کی بہتر بنیاد ہو سکتی ہے۔ لیکن انشائیہ ایک ایسی صنف ہے جس میں مزاح کی چاشنی مناسب مقدار میں ہی مناسب لگتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی اس رائے سے میں اتفاق کرتی ہوں کہ ''انشائیہ کے اسلوب میں لطافت اور شگفتگی ہونی چاہئے۔ لطافت ایسی کے انشائیہ متبذل نہ ہونے پائے اور شگفتگی ایسی کہ مزاح ہونے کے باوجود تحریر فرحت بخش ہو''۔ انشائیہ میں توازن کے ساتھ طنز و مزاح کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر طنز و مزاح زیادہ مقدار میں استعمال ہو تو توازن کھو دیتا ہے اور یہ طنزیہ یا مزاحیہ مضمون میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بعض انشائیہ نگاروں کے یہاں مزاح کافی مقدار میں پایا گیا ہے اور کسی کسی کے یہاں طنز کا عنصر زیادہ پایا گیا ہے۔ ہمارے چند انشائیہ نگار، انشائیہ کا آغاز بہت اچھے انداز میں کرتے ہیں دھیرے دھیرے انکی تحریر میں جب طنز و مزاح کا عنصر بڑھنے لگتا ہے تب انشائیہ اپنا توازن کھو دیتا ہے۔ ان کی تحریر مضمون میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انشائیہ نگار جن خیالات کا اظہار کرتا ہے وہ ان کا پرسنل ویو ہوتا ہے۔ اس کی دلیل ناپختہ ہوتی ہے پختہ دلیل فلسفہ کہلاتی ہے اور ناپختہ دلیل انشائیہ۔ اگر انشائیہ میں دلیلیں پیش کی جائیں تو دلیل ذلیل ہو جاتی ہے انشائیہ ایک مقالہ یا مضمون بن کر رہ جاتا ہے۔

انشائیہ دو دھاری تلوار کی طرح کام کرتا ہے ایک طرف یہ تروتازگی دیتا ہے اور ناہموار باتوں کو ہموار اور عمدہ بنا دیتا ہے۔ دوسری جانب یہ تخلیقی صلاحیتوں کو مظاہر ہے یعنی بے ترتیب اور غیر ہضم باتوں کو قلم بند کرتا ہے۔

انشاء حسن خیال ہے، حسنِ بیانی، حسنِ لفظی اور حسنِ معنوی بھی ہے۔ ہر ادبی تحریر شعری ہو یا نثری انشائی قوت سے جنم لیتی ہے۔ انشاء پارے ادب ہے خوبصورب، خوش رنگ اور نازک تتلی کی مانند ہے، ہاتھ لگاتے ہی اڑ جاتی ہے۔

جب سے انشائیہ نگاری کی صنف سنجیدہ موضوعات سے نکال کر طنزیہ و مزاحیہ سے مربوط ہوئی تب سے اب تک انشائیہ نگاروں کی کھیپ کی کھیپ موجود ہے تقریباً تمام طنز و مزاح نگاروں نے انشائیے تحریر کئے بعض نے شوقیہ، بعض نے شہرت کی خاطر اور چند نے نئی صنف سمجھ کر طبع آزمائی کی ہے۔ جس سے انشائیہ کی تحریروں میں لا تعداد اضافہ ہوا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ انشائیہ ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا ترقی کی طرف گامزن ہوا۔

اب تک جنوبی ہند میں جتنے بھی انشائیے تحریر ہوئے چاہے وہ مونٹین کے مطابق ہوں یا محمد حسنین یا وزیر آغا کے طرز میں ہوں ان تمام انشائیوں میں تقریباً انشائیہ کے تکنیک کا استعمال مکمل نہ سہی لیکن بہت حد تک کامیاب ہوا ہے۔ ہر انشائیہ نگار کے ہاں کوئی نہ کوئی تکنیک کی خوبی بہت بہتر انداز میں ملتی ہیں اگر انھیں درست کیا جائے تو مغرب کی طرز نگارش سے بہتر انشائیے ہونگے۔

اردو میں کامیاب انشائیوں کا سلسلہ اس وقت اہمیت کا حامل ہوتا ہے، جبکہ رشید احمد صدیقی نے اپنے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کے ذریعہ اردو دنیا میں شہرت حاصل کی۔ جس کے بعد شہر حیدرآباد کی سرزمین سے ''شگوفہ'' نامی دیڑھ ماہی رسالہ جاری کیا گیا' جو کچھ عرصہ بعد ماہ نامہ میں تبدیل ہوگیا۔ اس رسالہ کے مدیر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ہیں اور رسالہ کو طنز و مزاح کا علمبردار بنانے والے ''زندہ دلان حیدرآباد'' کے ادیب شامل تھے۔ جب انشائیہ نگاری کے سنجیدہ موضوع کی حقیقت کا خاتمہ ہوا اور طنز و مزاح کی روشنی میں انشائیہ نگاری کی روایت کو عام کرنے کی کوشش کی گئی' تو بلا شبہ حیدرآباد سے شائع ہونے والے اہم جریدہ ''شگوفہ'' کے قلمکاروں نے متحدہ طور پر طنزیہ و مزاحیہ انشائیہ کی طرف توجہ کی۔ جنوبی ہند کے ماحول میں طنز و مزاح کے فروغ کے لئے سازگار موقع فراہم ہوا۔ اس لئے بے شتر شگوفہ کے قلمکاروں میں طنزیہ اور مزاحیہ کے انشائیہ نگاروں کی فہرست سامل ہوجاتی ہے۔ جن میں سے چند یہ ہیں برق آشیانوی، مسیح انجم، خواجہ عندالغفور، رشید قریشی، زینت شاجدہ، منظورالامین، فیروز حیدر، امجد علی فیض، حلیمہ فردوس اور رؤف خوشتر وغیرہ۔ یہ ضروری نہیں کے ''شگوفہ'' میں انشائیے کے عنوان سے شائع ہونے والے مضامین انشائیہ ہی ہوں۔ چند ایک ایسے ادیب بھی ہیں جن کی تحریریں انشائیہ کے نام سے شائع ہوتی ہیں۔

ریاست تلنگانہ کے انشائیہ نگاروں میں مسیح انجم کی تصنیف ''طرفہ تماشہ'' خاکوں اور انشائیوں پر مشتمل ہے۔ ان کے ہاں انشائیوں کے تمام خوبیاں موجود ہیں۔ انشائیہ میں لفظ کے نئے معنی پیدا کرنے میں کمال حاصل ہیں اس کے علاوہ اسلوب کو متنوع اور پر لطف بنانے کے لئے ہر طرح کی تراکیب وسلیقہ مندی سے استعمال کرتے ہیں۔ بکثرت روز مرہ کے الفاظ کا استعمال ان کو دوسرے انشائیہ نگاروں سے منفرد بناتا ہے۔ نریندر لوتھر کے

انشائیوں میں ان کے پیشے کا عکس جھلکتا ہے۔ان کا اسلوب عمدہ، تازگی اور ظرافت کے ساتھ ساتھ تاریخ، سائنس، معاشرت اور ثقافت کا مطالعہ ومشاہدہ ان کی ایسی خوبی ہے جس سے ان کا اسلوب توانا اور جاندار نظر آتا ہے۔ان کے انشائیوں میں جذبہ وخیال کی متوازن آمیزش ملتی ہے۔''الف تحاشہ'' ان کے انشائیے اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ پروفیسر شمیم علیم بنیادی طور پر انشائیہ نگار ہیں۔''عکس کائینات''، ''سوندھی مٹی کا عطر'' اور'' جاگ عورت جاگ'' مضامین اور انشائیوں کے مجموعے ہیں۔وہ انشائیوں میں عصری زندگی کے پہلو کو دلکش انداز میں پیش کرتی ہیں۔ان کے ہاں خوش طبعی ان کی تحریری اساس ہے۔ان کے انشائیوں میں اختصار و جامعیت اور انبساط کے حوالے سے سوندھی مٹی کے عطر، اگر یہ درد نہ ہوتا قابل ذکر انشائیے ہیں۔ڈاکٹر عابد معز کے انشائیے کی تشکیل وتعمیر میں سارے محرک عوامل نظر آتے ہیں۔مگر ان کے ہاں حقیقت پسندی اور واقعیت پسندی نظر آتی ہے۔ان کے ہاں عام آدمی کے دکھ درد اور ان کے مسائل کی ترجمانی ملتی ہے۔ان کے مضامین میں اصلاح کا جذبہ بھی کارفرما نظر آتا ہے۔''سنگ گزیدہ''، ''پھر چھڑی بات'' ان کے انشائیوں اور کالموں کے مجموعے ہیں۔ممتاز مہدی کی تصانیف ''شامت اعمال'' اور'' الٹی گنگا'' انشائیوں اور مضامین کے مجموعے ہیں ان کے ہاں حقیقت پسندی پائی جاتی ہے۔ان کے مضامین کے عناوین اچھوتے ہیں مثلاً آنا، سوچنا، جانا، مرنا، جھگڑنا وغیرہ۔

مجتبی حسین کا اسلوب میں دلکشی اور رعنائی ہے۔اس کے علاوہ زبان وبیان کی خوبی بہت عمدہ ہے ان کی خصوصیات کی وجہ سے ان کی تحریریں انشائیہ سے بہت قریب ہیں ان کے ''ایش ٹرے''، ''ایک ملاقات دیمکوں کی ملکہ سے'' اور ''ہماری بے مکانی دیکھتے جاؤ'' یہ ایسے مضامین ہیں جو انشائیہ سے بالکل قریب ہیں۔قدیر زماں قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔''سوائے انشائیے اور بزم ارباب نظر (سوانحی انشائیے)'' ان کی تصانیف ہیں۔ان کی کتابوں کا عنوان انشائیے ہیں مگر ان کی یہ کتابیں انشایوں سے عاری ہیں۔

ریاست آندھرا پردیش میں بہت کم انشائیے دستیاب ہوئے ہیں۔ڈاکٹر عبدالستار ساحر ان کا عمدہ انشائیہ'' مٹکے'' انہوں نے بہت کم انشائیے تحریر کئے ہیں۔ڈاکٹر قیسی قمر نگری نے بھی بہت کم انشائیے تحریر کئے ہیں ان کے انشائیہ ''انکشاف ذات'' سے عاری ہیں ان کا عمدہ انشائیہ ''سالے'' ہیں۔

ریاست کرناٹک کے انشائیہ نگاروں میں عبدالقادر ادیب کا نام اہمیت کا حامل ہے۔''نقار خانہ میں'' ان کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔لئیق صالح بھی ایک عمدہ انشائیہ نگار ہیں۔''سنی سنائی'' ان کے انشائیوں اور مضامین کا مجموعہ ہے۔رزاق اثر شاہ آبادی کا شمار انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے ان کے انشائیوں اور طنز ومزاح کا مجموعہ ''ناک ہے تو ساکھ ہے'' زیر طبع ہے۔ڈاکٹر حلیمہ فردوس کے بیس پچیس انشائیے، دو چار رپورتاژ اور خاکوں پر مشتمل مجموعہ اشاعت کا منتظر ہے۔رؤوخوشتر کا ''صرف درباں'' فکاہیہ مضامین پر مشتمل مجموعہ ہے۔اس کے علاوہ مختار احمد منواور

منظور وقار نے بہت کم انشائیے تحریر کئے ہیں۔

جنوبی ہند کے چند ایک ایسے انشائیہ نگار ہیں جن کے طرز اسلوب کی بناء پر انھیں ابتدائی انشائیہ نگاروں کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں خواجہ عبدالغفور کے انشائیوں میں لطیفے بکثرت ملتے ہیں۔ ''سمن زار'' ان کے انشائیوں اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ رشید قریشی کے انشائیوں میں مکالماتی انداز پایا جاتا ہے۔ حقیقت حال سے آگاہی اور افسانوں کا غلبہ چھایا ہوا دیکھائی دیتا ہے۔ زینت ساجدہ کے ہاں افسانوی انداز ملتا ہے۔ منظور الامین انشائیوں کا آغاز کہاوتوں اور محاوروں سے کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مزاح اور لطیفے، قصے اور کہانیاں بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ان کے انشائیے کا اختتام سبق آموز باتوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ مرزا یوسف امتیاز کے یہاں مذہبی، تاریخی معلومات بکثرت ملتے ہیں۔ رؤف خوشتر کے ہاں مزاح کا عنصر بہت زیادہ ملتا ہے۔ جس سے ان کی تحریریں انشائیہ کم مزاحیہ مضمون زیادہ لگتے ہیں۔ منظور وقار کا رشتہ تہذیب وثقافت سے گہرا ہے وہ اپنی تحریر کے آغاز میں تمہید باندھتے ہیں۔ ان کے انشائیے مضامین کے طرز میں ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء کی تحریر سیدھی سادھی ہے۔ وہ عصر حاضر کی آگہی رکھتی ہیں۔ وہ ایک بیانیہ افسانہ کی طرح ایک بات کی طرح شروع کرتی ہیں اور واقعاتی تسلسل کو ملحوظ رکھتے ہوئے انجام تک لے جا کر نتیجہ اخذ کرتی ہیں۔ ان کے چند مضامین انشائیہ نما ہیں۔

جنوبی ہند میں بکثرت انشائیہ نگار ملتے ہیں۔ جن میں سے چند انشائیہ نگار ایسے ہیں جن کے ہاں انشائیہ کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ مثلاً عاتق شاہ، محمد برہان حسین، سید عباس متقی، نریندر لوتھر، فاطمہ تاج، رزاق اثر شاہ آبادی، ڈاکٹر فرزانہ فرح، لئیق صالح اور عبدالقادر ادیب۔ ان تمام کے انشائیے عمدہ ہیں۔ ڈاکٹر عابد معز، ممتاز مہدی، ڈاکٹر عبدالستار ساحر اور ڈاکٹر قیسی قمر نگری کے انشائیے سنجیدہ ہیں۔ برق آشیانوی، ڈاکٹر شمیم علیم، رحیم الدین توفیق، فیروز حیدر، امجد علی فیض، ایم اے حنان، پروفیسر فضل اللہ مکرم اور حلیمہ فردوس کے ہاں طنز ومزاح ملتا ہے۔ سلیم مقصود کے یہاں طنز گہرا ملتا ہے۔ ان کے ہاں فلموں کا اثر بھی بہت ملتا ہے۔

کیرالا اور ٹاملناڈو ایسی ریاستیں ہے جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد کم ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی زندگی کی باگ دوڑ میں وہاں کے ادیب، شاعر اور مصنفین کی مصروفیت کے باعث اور وقت کی تنگی کی وجہ سے انشائیہ کی اس صنف کو وقت نہیں دے پائے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انشائیہ کے کوئی اصول مقرر نہیں ہے پڑھتے وقت انشائیہ جتنا آسان دکھائی دیتا ہے لکھتے وقت اتنا آسان نہیں۔ انشائیہ سے متعلق جتنی بھی کتابیں ہیں۔ ان میں صرف اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ ''انشائیہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ کس کس کے پاس انشائیہ کس طرح ہیں؟'' اس لئے اکثر لوگ انشائیہ کو ایک مشکل ترین صنف کہہ کر اس میں طبع آزمائی نہیں کرتے۔ یہ المیہ کیرالا اور ٹاملناڈو تک محدود نہیں بلکہ ملک کے دیگر علاقوں میں بھی یہی صورت حال ہے۔ مجھے امید ہے کہ

کیرالا اور ٹاملناڈو کے شعراء، ادباء، قابل اور باشعور صاحب ادب انشائیہ کے میدان میں طبع آزمائی کرینگے اور اس کو آسمانوں کی بلندی تک پہنچائینگے۔

عصر حاضر کا دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔ آج کل انسانوں کی مصروفیات زیادہ ہوجانے کی وجہ سے زمانے قدیم کی طرح کتابیں ہاتھ میں لے کر پڑھنے کا زمانہ اب نہیں رہا ہے۔ قارئین اپنی سہولت کے مطابق مطالعہ کرنا پسند کرتے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے ادب کے لئے گراں قدر کام انجام دیا ہے۔ ٹکنالوجی میں دن بہ دن ترقی اور نئے نئے تجربات ہورہے ہیں اور نئی نئی Websites کا آغاز ہورہا ہے جس کی وجہ سے ہم سل فون سے بھی باآسانی گوگل کی مدد سے اپنی سہولت کے مطابق جب جی چاہے، جہاں چاہے باآسانی مطالعہ کرسکتے ہیں۔ اور ہم ایسے تناؤ بھرے دور میں جی رہے ہیں جہاں پر ہر شخص ذہنی دباؤ اور تناؤ میں رہتا ہے وہ اپنے موڈ کو بہتر کرنے کے لئے کوئی فنّی ویڈیو دیکھتا ہے یا مطالعہ کا شوقین ہو تو مطالعہ کے ذریعہ اپنے آپ کو تسکین بہم پہنچاتا ہے وہیں لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔ چونکہ انشائیہ اختصار پر منحصر صنف ہے جس کا باآسانی مطالعہ کیا جاسکتا ہے اس وجہ سے صنف انشائیہ کی مانگ بڑھے گی۔ ایسے قارئین کے لئے بھی جو وقت کی تنگی یا مصروفیات کے باعث مطالعہ سے محروم ہیں ان کے لئے بھی یہ صنف کارآمد ثابت ہوگی۔ مختصراً یہ کہ انشائیہ نے اپنے ماضی کے سرمائے کے ساتھ اپنا ادبی سفر شان سے جاری رکھا ہوا ہے۔ یہ صنف اردو ادب کے کسی بھی دوسری اصناف سخن سے پیچھے نہیں۔ اختصار اور جامعیت پر منحصر اس صنف کا مستقبل روشن ہے۔

******

کتابیات

سلسلہ نمبر	مصنف	تصنیف	مقام	سن اشاعت
۱	احمد امتیاز (ڈاکٹر)	انشائیہ کے فنی سروکار	نئی دہلی	۲۰۱۲ء
۲	اکبر حمیدی	جدید اردو انشائیہ	نئی دہلی	۱۹۱۹ء
۳	پرویز یداللہ مہدی	دروغ بر گردن راوی	حیدرآباد	۲۰۱۵ء
۴	جاوید وشیسٹ	انشائیہ پچسی	نئی دہلی	۱۹۸۵ء
۵	حبیب ضیاء (ڈاکٹر)	مضامین نو	حیدرآباد	۲۰۰۹ء
۶	حبیب ضیاء (ڈاکٹر)	دکنی زبان کی قواعد	حیدرآباد	۲۰۱۳ء
۷	حبیب ضیاء (ڈاکٹر)	حیدرآباد کی طنز و مزاح نگار خواتین	حیدرآباد	۲۰۰۵ء
۸	حسن چستی	مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں	دہلی	۲۰۰۱ء، ۲۰۰۲ء، ۲۰۰۴ء
۹	ڈاکٹر حفیظ قتیل	روح ادب	دہلی	
۱۰	خواجہ عبدالغفور	سمن زار	حیدرآباد	۱۹۷۸ء
۱۱	رؤف خوشتر	آنکھ بیتی	بنگلور، کرناٹک	۲۰۰۹ء
۱۲	رؤف خوشتر	غبار حاضر	بنگلور، کرناٹک	۱۹۸۲ء
۱۳	ڈاکٹر شیدا اعجاز حسین	مختصر تاریخ اردو	دہلی	۱۹۶۴ء

۱۴	ڈاکٹر سیدہ جعفر	اردو مضمون کا ارتقاء		۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۲ء
۱۵	سید محمد حسنین	انشائیہ اور انشائیے	دہلی	۱۹۷۳ء، ۱۹۷۴ء، ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۷ء، ۱۹۹۸ء
۱۶	سیدہ شائستہ مقیم (ڈاکٹر)	دکن میں طنز و مزاح کی روایت اور مجتبیٰ حسین کی خدمات	دہلی	۲۰۱۳ء
۱۷	شفیع احمد صدیقی	اردو زبان و قواعد حصہ دوم	نئی دہلی	۲۰۰۵ء
۱۸	شیخ آدم			
۱۹	ظہیر الدین مدنی	اردو ایسیز	دہلی	۱۹۸۵ء
۲۰	عابد معز	یہ نہ تھی ہماری قسمت	حیدرآباد	۲۰۱۲ء
۲۱	عابد معز	واہ حیدرآباد	حیدرآباد	۱۹۹۴ء
۲۲	عابد معز	اتنی سی بات	حیدرآباد	۲۰۱۶ء
۲۳	عابد معز	پھر چھڑی بات	حیدرآباد	۲۰۱۴ء
۲۴	فاطمہ تاج	من مانی	حیدرآباد	۲۰۰۵ء
۲۵	فرزانہ فرح ڈاکٹر	دیکھنا تحریر کی لذت	بھٹکل	۲۰۱۶ء
۲۶	فریدہ تبسم	آغا حسن کی علمی و ادبی خدمات	نئی دہلی	۲۰۱۷ء
۲۷	قاضی عبدالودو	اردو نثر میں ادب لطیف		

۲۸	قدیر زماں	بزم ارباب (سوانحی انشائیے)	حیدرآباد	۲۰۰۷ء
۲۹	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	جامع اردو انسائیکلو پیڈیا	دہلی	۲۰۰۳ء
۳۰	ڈاکٹر قمر الھدی فریدی	انتقاب نثر و نظم	علی گڑھ	۲۰۰۷ء
۳۱	گل رعنا (ڈاکٹر)	فن طنز و مزاح نگاری		۲۰۱۸ء
۳۲	لئیق صالح	سنی سنائی	حیدرآباد	--
۳۳	ڈاکٹر محمد اسد اللہ	انشائیہ کی روایت	ناگور	۲۰۱۵ء
۳۴	محمد برہان حسین	چند کلیاں نشاط کی	حیدرآباد	
۳۵	محمد عبدالقدیر ادیب	نقار خانہ میں	بنگلور	۱۹۸۱ء
۳۶	مشتاق احمد یوسفی	خاکم بدہن	حیدرآباد	۱۹۸۴ء
۳۷	ممتاز مہدی	شامت اعمال	حیدرآباد	۱۹۹۴ء
۳۸	ممتاز مہدی	الٹی گنگا	حیدرآباد	۲۰۱۶ء
۳۹	نریندر لوتھر	الف تحاشہ	حیدرآباد	۱۸۸۵ء
۴۰	نصیر احمد خان	آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ	دہلی	۱۹۹۳ء
۴۱	ڈاکٹر وحید قریشی	اردو کا بہترین انشائی ادب		
۴۲	وزیر آغا	انشائیہ کے خدوخال	دہلی	۱۹۹۱ء
۴۳	وزیر آغا	خیال پارے		۱۹۸۴ء
۴۴	یوسف ناظم	انبساط	نئی دہلی	۱۹۹۹ء

رسائل

سلسلہ نمبر	رسالہ	مقام اشاعت	تاریخ
۱	آندھراپردیش	حیدرآباد	نومبر ۱۹۹۹ء
۲	آندھراپردیش	حیدرآباد	جنوری ۲۰۰۱ء
۳	آندھراپردیش	حیدرآباد	۲۰۰۲ء
۴	ادبی میگزین، محفل خواتین	حیدرآباد	نومبر ۲۰۱۴ء
۵	ادیب (ماہنامہ) انشائیہ نمبر	علی گڑھ	مئی ۱۹۵۹ء
۶	ادبی دنیا خاص نمبر		
۷	اوراق، خاص نمبر، وزیر آغا	کراچی	۱۹۹۰ء
۸	اوراق انشائیہ نمبر	کراچی	اکتوبر، نومبر ۱۹۸۲ء
۹	اوراق	کراچی	مارچ، اپریل ۱۹۷۲ء
۱۰	ماہنامہ پٹنہ		مارچ ۱۹۶۰ء
۱۱	زرین شعاعیں	بنگلور	جنوری ۲۰۲۰ء
۱۲	سب رس، ادارہ ادبیات اردو	حیدرآباد	جنوری ۲۰۱۸ء
۱۳	شگوفہ سالنامہ	حیدرآباد	جنوری، فروری ۱۹۹۵ء

۱۴	شگوفہ	حیدرآباد	نومبر ۱۹۹۰ء
۱۵	شگوفہ	حیدرآباد	آگست ۱۹۹۶ء
۱۶	شگوفہ	حیدرآباد	اکتوبر ۱۹۹۵ء
۱۷	شگوفہ	حیدرآباد	ستمبر ۱۹۹۰ء
۱۸	شگوفہ	شاعر	ڈسمبر ۲۰۰۵ء
۱۹	شگوفہ	شاعر	اکتوبر ۲۰۰۵ء
۲۰	شگوفہ	ماہ نامہ آندھرا پردیش	فروری ۲۰۰۲ء
۲۱	شگوفہ	حیدرآباد	مئی ۱۹۹۴ء
۲۲	شگوفہ	حیدرآباد	ستمبر ۱۹۹۷ء
۲۳	شگوفہ سالنامہ	حیدرآباد	۱۹۹۵ء
۲۴	شگوفہ سالنامہ	حیدرآباد	۱۹۹۷ء
۲۵	شگوفہ	حیدرآباد	مئی ۱۹۹۴ء
۲۶	شگوفہ سالنامہ	حیدرآباد	۱۹۹۴ء
۲۷	شگوفہ سلور جوبلی	حیدرآباد	
۲۸	شگوفہ	حیدرآباد	اکتوبر ۱۹۷۴ء
۲۹	شگوفہ	حیدرآباد	مارچ ۱۹۷۶ء
۳۰	شگوفہ	حیدرآباد	نومبر ۱۹۷۶ء
۳۱	شگوفہ	حیدرآباد	اکتوبر ۱۹۷۴ء

۳۲	شگوفہ سالنامہ	حیدرآباد	جنوری، فروری ۱۹۹۵ء
۳۳	شگوفہ	حیدرآباد	آگست ۱۹۹۱ء
۳۴	شگوفہ سالنامہ	حیدرآباد	۱۹۷۸ء
۳۵	شگوفہ	حیدرآباد	نومبر ۱۹۷۴ء
۳۶	شگوفہ	حیدرآباد	جون ۱۹۷۵ء
۳۷	شگوفہ	حیدرآباد	مئی ۱۹۹۴ء
۳۸	شگوفہ	حیدرآباد	مارچ ۱۹۹۷ء
۳۹	شگوفہ	حیدرآباد	ستمبر ۱۹۷۴ء
۴۰	شگوفہ سالنامہ	حیدرآباد	۱۹۹۶ء
۴۱	شگوفہ خلیج نمبر	حیدرآباد	جون ۲۰۱۴ء
۴۲	شگوفہ یوسف ناظم نمبر	حیدرآباد	جون ۲۰۰۴ء
۴۳	ظرافت خصوصی شمارہ۔۱، ترجمان خوش دلان	کرناٹک	
۴۴	محفل خواتین	حیدرآباد	نومبر ۲۰۱۴ء

اخبارات

سلسلہ نمبر	اخبار	مقام اشاعت	تاریخ

۱	اعتماد	حیدرآباد	۱۵/۱۲/۲۰۰۸
۲	منصف	حیدرآباد	۱۹/۲/۲۰۰۹
۳	سیاست،حیدرآباد	حیدرآباد	۲۹/۶/۲۰۱۳
۴	اعتماد،حیدرآباد	حیدرآباد	۹/۸/۲۰۱۰
۵	منصف	حیدرآباد	۷/۲/۲۰۰۴
۶	ہندی سماچار	جالندھر	۲۵/۶/۲۰۰۴
۷	کے۔جی۔ایم ٹائمز		۲۰/۹/۲۰۰۴
۸	سہارا	بنگلور	۲۷/۵/۲۰۲۰
۹	صحافی دکن	حیدرآباد	۸/۶/۲۰۲۰
۱۰	پیش رفت	دہلی	۲۰۲۰/۔۔۔
۱۱	آگ،	لکھنو	۲۶/۵/۲۱
۱۲	سالار	بنگلور	۲۴/۶/۲۰۱۹
۱۳	آگ	لکھنو	۳/۷/۲۰۱۹

لغات

سلسلہ نمبر	لغت	مصنف	سن
۱	فیروز اللغات	مولوی فیروز الدین	۲۰۰۰ء

۲	لغات کشوری	مولوی تصدیق حسن صاحب رضوی مرحوم	۱۹۸۳ء
۳	علمی اردو لغات	مولوی وارث سرہندی	۱۹۹۸ء
۴	فرہنگ ادبی اصطلاحات	شہزاد سلیم	۱۹۹۸ء
۵	فرہنگ ادبی اصطلاحات	کلیم الدین احمد	۱۹۸۶ء
۶	Advance Twentch century Dictnary English into Einglish and Urdu	Prof. Bashir Ahmed Qureshi	
۷	مہذب الغات	حضرت مہذب لکھنوء	
۸	فرہنگ عامرہ	محمد عبداللہ	

ویب سائٹس

سلسلہ نمبر	ویب سائٹس
۱	http://ur.m.wikipedia.org
۲	https://www.taemeernews.com
۳	http://www.urduuinc.com
۴	http://kitaben.urdulibrary.org

۵	https://www.rekhta.org
۶	Ghubarre Khater blogspot.com
۷	Ur.m wikipedia.org
۸	https://urduduniya.in

ختم شد

****